مطالعۂ حدیث



مولانا وحید الدّین خاں

مطالعۂ حدیث

مولانا وحید الدین خاں

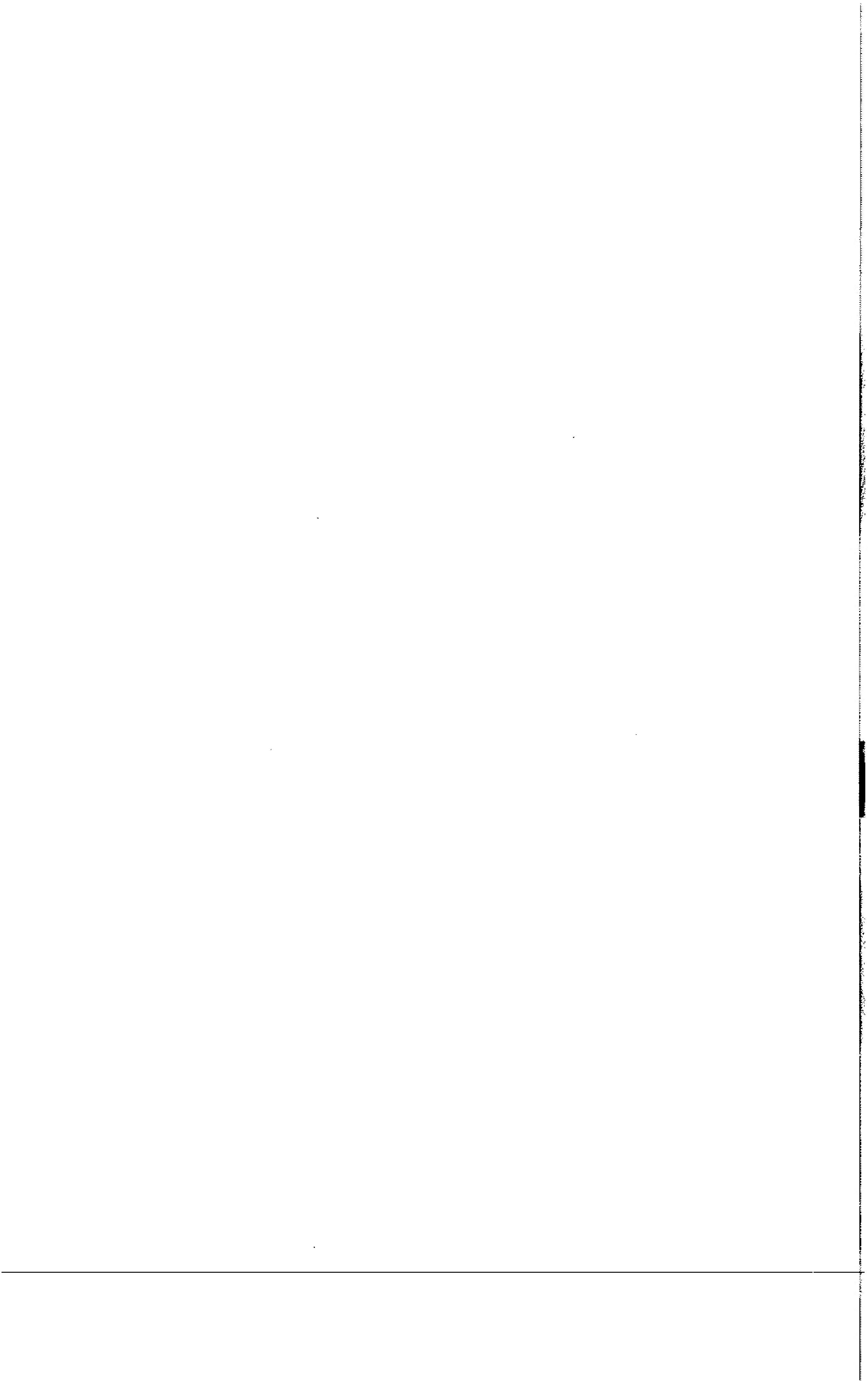
Mutala-e-Hadith (Urdu)

First published 2003

© Goodword Books 2003

Goodword Books Pvt. Ltd.
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110013
Tel. 2435 5454, 2435 6666, Fax: 2435 7333
e-mail: info@goodwordbooks.com
Website: www.goodwordbooks.com

فہرست



آغاز کلام

حدیث کا مطالعہ، بالواسطہ طور پر، قرآن کا مطالعہ ہے۔ قرآن اور حدیث میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو۔ ایک حدیث کے بارہ میں جب اصولی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے تو شرعی اعتبار سے اُس کا استناد ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ خود قرآن کا استناد۔

جہاں تک مضامین کا تعلق ہے، قرآن میں دین کی اساسی تعلیمات کا بیان ہے اور حدیث میں دین کی تفصیلی تعلیمات کا بیان۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی اصولی تعلیمات حدیث کے متن ہی سے تفصیلی طور پر سمجھ میں آتی ہیں۔ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کا سمجھنا ممکن ہی نہیں۔

حدیث کا ذخیرہ، وسیع تر تقسیم کے اعتبار سے، دو قسم کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ایک، روح اسلام اور دوسرے وہ چیز جس کو شرائع کہا جاتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں زیادہ تر پہلی قسم کی احادیث کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

عربی زبان میں کثرت سے حدیث کی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ یہ شرحیں زیادہ تر فنی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً نحوی مسائل، اسناد کی بحث، حدیثوں میں تعارض کا مسئلہ، مختلف فقہی مسالک سے احادیث کی مطابقت، وغیرہ۔

زیر نظر مجموعہ میں حدیث کی تشریح کا یہ فنی انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ ہم نے صرف یہ کوشش کی ہے کہ حدیث میں نصیحت اور سبق کا جو پہلو ہے اُس کو نمایاں کیا جائے۔

احادیث کو سمجھنے کے سلسلہ میں چند اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ان اصولوں کو اگر سامنے رکھ کر حدیث کا مطالعہ کیا جائے تو وہ اشکالات پیدا نہیں ہوں گے جو کچھ لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، حتیٰ کہ وہ حدیث کی اہمیت ہی کے بارہ میں مشتبہ ہو جاتے ہیں۔

۱۔ اس سلسلہ میں ایک چیز یہ ہے کہ حدیث میں بعض اوقات کسی حکم کو عمومی انداز میں بیان کیا

جا تا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اُس کو مطلق مفہوم میں لے لیتے ہیں۔ حالاں کہ کوئی بات اگر بظاہر مطلق انداز میں بیان کی جائے تب بھی وہ مطلق طور پر مطلوب نہیں ہوتی۔ اکثر حالات میں اُس کا مقصد صرف تا کید ہوتا ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ : **المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ** (مسلم وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں)۔

اس حدیث میں بیک وقت دو قسم کا حصر موجود ہے۔ ایک یہ کہ حدیث کے الفاظ کے مطابق، اس میں مسلم کی تعریف اس طرح کی گئی ہے جس میں ایمان و عبادات، وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس میں المسلمون ہے، نہ کہ الناس۔ مگر یہ دونوں باتیں اضافی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور عبادات کا تذکرہ نہ ہونے کے باوجود وہ یہاں معہود ذہنی کے طور پر موجود ہے۔ اسی طرح المسلمون کے باوجود الناس بھی اُس میں تبعاً شریک ہیں۔

۲۔ احادیث میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو حقیقۃً تمثیل کی زبان میں ہیں۔ مگر لوگ اُس کو لفظی طور پر لے لیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اشکال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ: **انما الحر من فیح جهنم** (گرمی جہنم کی پھونک سے ہے)۔ یہ جہنم کی گرمی کی شدت کو بتانے کے لیے ایک تمثیل ہے۔ اُس کو لفظی مفہوم میں لینا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح عذاب قبر کے بارہ میں جو حدیثیں آئی ہیں وہ بھی تمثیل کی زبان میں ہیں، نہ کہ حقیقت کی زبان میں۔

۳۔ حدیث کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی ایک حدیث کو لے کر رائے قائم نہ کی جائے بلکہ مختلف حدیثوں کا مجموعی مطالعہ کرنے کے بعد رائے بنائی جائے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ **افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر**۔ اگر کوئی شخص اس حدیث کو لے کر یہ کرے کہ جہاں کہیں اُس کو کوئی بات حق اور عدل کے خلاف دکھائی دے وہاں وہ فوراً اُس کے رد میں تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے تو یہ حدیث کی تعمیل نہ ہوگی۔ کیوں کہ ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ: **من صمت نجا**۔ دونوں حدیثوں کو ملا کر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کہیں بولنا مطلوب ہوتا ہے تو کہیں یہ مطلوب ہوتا ہے کہ آدمی خاموشی اختیار کر لے۔

۴۔ کبھی کسی حدیث میں ایک بات حکم جیسے الفاظ میں آتی ہے۔ حالاں کہ اُس سے صرف زجروتوبیخ مقصود ہوتی ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ جولوگ جماعت کی نماز ترک کرتے ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُن کے گھروں میں آگ لگادوں۔ یہ الفاظ زجروتوبیخ کے لیے ہیں، اُن کو لفظی معنوں میں لینا درست نہیں۔

۵۔ احادیث کے مطالعہ کے دوران یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ بہت سے مسائل میں احادیث کے درمیان اختلاف ہے۔ مثلاً نماز کے طریقوں کے بارہ میں۔ ان اختلافی احادیث کی بنیاد پر کافی بحثیں جاری رہی ہیں۔ کوئی ایک روایت کو افضل قرار دیتا ہے اور دوسری کو غیر افضل، کوئی ایک روایت کو راجح قرار دیتا ہے اور دوسری روایت کو مرجوح۔ راقم الحروف کے نزدیک اس مسئلہ کا زیادہ بہتر حل وہ ہے جس کو ابن عبدالبر نے اپنی کتاب **بیان فضائل العلم و أهله** میں بیان کیا ہے۔

اس کے مطابق، ان اختلافات کا فکری حل یہ ہے کہ اُن کو تنوع اور توسع پر محمول کیا جائے۔ یعنی ایک اور دوسرے کے درمیان ترجیح تلاش کرنے کے بجائے دونوں ہی کو یکساں طور پر درست مان لیا جائے۔ یعنی یہ کروتب بھی ٹھیک ہے اور وہ کروتب بھی ٹھیک۔ ان اختلافات کو تنوع کا مظہر قرار دینے کی صورت میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اختلاف بحث وگفتگو کا موضوع نہیں رہتا۔ اور ذہن زیادہ اہم مفاہیم پر مرتکز ہوجاتا ہے۔

۶۔ حدیث کے مطالعہ میں عام طور پر علماء کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ سند کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اُصولی طور پر یہ بات درست ہے مگر کسی بھی چیز میں غلو نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ میرے نزدیک زیادہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب کسی حدیث کی بنیاد پر کوئی حکم یا حجت قائم کرنا ہو تو اُس وقت سختی کے ساتھ سند کو اہمیت دینا چاہئے۔ لیکن جب کوئی ایسی حدیث سامنے آئے جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے قرآن سے متعارض نہ ہو اور اُس سے نصیحت اور تذکیر حاصل ہوتی ہو تو ایسی حدیث کو قبول کرنے میں میرے نزدیک کوئی حرج نہیں۔

۷۔ تاہم فضائل کی روایات کے بارہ میں میرا نقطۂ نظر کسی قدر مختلف ہے۔ فضائل کی

روایتیں زیادہ تر یا تو ضعیف ہیں یا موضوع۔ ان روایتوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ظواہر اعمال کے فضائل پر ہوتی ہیں۔ مثلاً فضائل کی روایتوں میں فضائل تلاوت تو ملے گی مگر فضائل تدبر نہیں ملے گا۔ اسی طرح اُن میں فضائل عبادت تو ہوگا مگر فضائلِ خشوع نہیں ہوگا۔ اُن میں فضائل قربانی تو ہوگا مگر فضائل تقویٰ نہیں ہوگا۔ اس بنا پر فضائل کی روایتوں سے یہ ذہن بنتا ہے کہ ظواہر اعمال ہی کا نام عبادت ہے۔ حالاں کہ اصل عبادت وہ ہے جو داخلی اسپرٹ سے تعلق رکھتی ہے، جس کو قرآن میں خشوع، خضوع، اخبات، تقویٰ، وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۸۔ کوئی حدیث بظاہر ایک مخصوص معنی میں ہوتی ہے۔ اگر اس حدیث کو لفظی طور پر لیا جائے تو وہ ایک خاص حکم تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ حالانکہ پیغمبر اسلام کی نبوت جب عالمی ہے تو آپ کے کلام میں بھی عالمی پہلو ہونا چاہئے۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ کسی حدیث کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کو وسیع تر سیاق (broader context) میں رکھ کر دیکھا جائے۔

مثال کے طور پر روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **كُلُّ مولودٍ يُولَدُ على الفطرة فابواه يهودانه و ينصرانه ويمجسانه** (ہر پیدا ہونے والا فطرتِ صحیح پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا دیتے ہیں اور اس کو نصرانی بنا دیتے ہیں اور اس کو مجوسی بنا دیتے ہیں)۔

اس حدیث میں بظاہر تین مذہبی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مگر وسیع تر پہلو سے دیکھا جائے تو یہ حدیث ایک نہایت اہم حقیقت کو بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ ہر آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک بچہ ہوتا ہے جس کے اندر خود صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ بچپن اور نوجوانی کی پوری عمر وہ اسی ناپختہ ذہن کے ساتھ کسی ماحول میں گزارتا ہے۔ یہ ماحول مسلسل طور پر اس کے ذہن کی کنڈیشننگ (conditioning) کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مکمل طور پر ایک کنڈیشنڈ انسان بن جاتا ہے۔ ذہن کی کنڈیشننگ کا یہ معاملہ ہر ایک کے ساتھ پیش آتا ہے، کسی بھی مرد یا عورت کا اس میں کوئی استثناء نہیں۔

ایسی حالت میں ہر انسان کی یہ ایک لازمی ضرورت ہے کہ پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد وہ اپنے ذہن کی ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کرے۔ وہ اپنے ذہن کے اوپر چڑھی ہوئی مصنوعی تہوں کو ہٹائے تاکہ وہ حقیقتوں کو اس فطری ذہن کے ساتھ دیکھے اور سمجھے جو خالق حقیقی کی طرف سے اس کو پیدائشی طور پر دیا گیا ہے۔ ڈی کنڈیشننگ کا یہ عمل ہر ایک کو کرنا ہے۔ اس عمل کے بغیر کوئی بھی شخص صحیح الفکر (right thinker) نہیں بن سکتا۔

ڈی کنڈیشننگ کا یہ عمل بے حد سنجیدہ عمل ہے۔ اس میں ہر مرد اور عورت کو خود اپنے ذہن کی سرجری کرنی پڑتی ہے۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان خیالات کو نکالنا پڑتا ہے جو ماحول کے اثر سے اس کے اندر داخل ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ناپختہ عمر میں ہونے والی یہ کنڈیشننگ ہر آدمی کے ذہن کو افکار کا ایک جنگل بنا دیتی ہے۔ اس فکری جنگل کو صاف کرنے کا نام ڈی کنڈیشننگ ہے۔ یہ تطہیر صرف اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ آدمی بے رحمانہ طور پر اپنے ذہن کا فکری آپریشن کرنے کے لیے تیار ہو۔

۹۔ حدیثوں کے مطالعہ میں ایک مزاج یہ بن گیا ہے کہ ان سے بس جزئی مسائل اخذ کیے جاتے ہیں۔ کلی مسائل پر ان کو چسپاں نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ اس قسم کا ذہن حدیث کی معنویت کو گھٹانے کے ہم معنی ہے۔ اس ذہن کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگوں نے جزئی مسائل میں تو حدیث سے رہنمائی حاصل کی مگر وہ زیادہ اہم مسائل میں حدیث سے رہنمائی حاصل نہ کر سکے۔

مثلاً ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: **من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه** (آدمی کے اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ایسے کام کو چھوڑ دے جس میں کوئی فائدہ نہیں)۔ اس حدیث سے عام طور پر صرف کچھ چھوٹے چھوٹے مسئلے نکالے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی دینی مجلس میں بیٹھ کر ایک آدمی کسی تنکے سے کھیلے تو کہا جائے گا کہ یہ ایک بے فائدہ کام ہے، اس کو نہ کرو۔ مگر اس قسم کی تشریح اصل حدیث کی تصغیر کے ہم معنی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث سے زندگی کے تمام معاملات کے لیے ایک نہایت اہم رہنمائی حاصل

ہوتی ہے۔اس حدیث سے یہ جامع اصول ملتا ہے کہ ہمارا اقدام ہمیشہ نتیجہ رخی (result oriented) ہونا چاہئے۔کوئی ملی منصوبہ بنایا جائے تو سب سے پہلے یہ غور کیا جائے کہ یہ منصوبہ نتیجہ کے اعتبار سے مفید ہوگا یا نہیں۔کسی سے شکایت ہوجائے اور اس کے خلاف لڑائی چھیڑنا ہو تو یہ اندازہ کیا جائے کہ لڑائی کا کوئی مثبت نتیجہ نکلے گا یا نہیں۔کسی مقام پر کوئی سیاسی پروگرام بنایا جائے تو پیشگی طور پر اچھی طرح جائزہ لیا جائے کہ یہ پروگرام برعکس نتیجہ کا سبب تو نہیں بن جائے گا، وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی اقدام کا بے نتیجہ ثابت ہونا کوئی سادہ بات نہیں۔اس کی زد آدمی کے ایمان واسلام تک جاتی ہے۔سچا ایمان آدمی کے اندر گہری سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔سچا اسلام آدمی کو آخری حد تک محتاط بنا دیتا ہے۔ایسی حالت میں یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ ایمان واسلام والا آدمی ایسا اقدام کرے جو نتیجہ کے اعتبار سے الٹا (counter productive) ثابت ہونے والا ہو۔

۱۰۔ جیسا کہ معلوم ہے، حدیث کی تدوین عباسی خلافت کے دور میں ہوئی۔اسی زمانہ میں فقہ کی تدوین بھی ہو رہی تھی۔اس بنا پر ایسا ہوا کہ حدیث کا مطالعہ فقہ کی روشنی میں کیا جانے لگا۔یہ سلسلہ کئی سو سال تک جاری رہا۔یہاں تک کہ حدیث کے مطالعہ کا ایک معلوم فریم ورک بن گیا اور وہ فقہی فریم ورک تھا۔مزید یہ کہ مختلف اسباب سے خود فقہ کا مطالعہ زیادہ تر جزئی مسائل یا جزئیات شریعت تک محدود ہوگیا۔

اس کا اثر حدیث کے مطالعہ پر بھی پڑا۔اس کی مثالیں حدیث کی شرحوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ بعد کے زمانہ میں جتنی بھی شرحیں لکھی گئیں تقریباً ہر ایک میں شرح کا وہ انداز غالب آگیا جس میں صرف دو چیزیں شارح کی توجہ کا مرکز بنی رہیں — حدیث کی فنّی حیثیت پر بحث، یا اس کے فقہی پہلوؤں کی وضاحت جن کا تعلق زیادہ تر شریعت کے وقتی یا جزئی پہلوؤں سے تھا۔حدیث کے اس رواجی طرز مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ حدیث کی آفاقی معنویت گم ہوگئی۔حدیث میں ابدی رہنمائی کا جو پہلو تھا وہ امت کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گیا۔اس معاملہ کی مثالیں بعد کے زمانہ میں لکھی جانے والی کتابوں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔یہاں میں اس کی وضاحت کے لیے ایک تازہ مثال درج کرتا ہوں۔

سویڈن شمالی یورپ کا ایک ملک ہے۔ یہاں کا موسم ہمیشہ غیر معتدل رہتا ہے۔ کبھی رات بہت چھوٹی اور دن بہت لمبا اور کبھی دن بہت چھوٹا اور رات بہت لمبی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دن اور رات میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ سویڈن میں کافی مسلمان آکر آباد ہو گئے ہیں۔ ان کے سامنے یہ سوال ہے کہ یہاں کے علاقہ میں پانچ وقت کی نماز کس طرح پڑھی جائے۔ تقلیدی علماء کا اصرار ہے کہ یہاں بھی اسی طرح سورج کے اعتبار سے نماز ادا کی جائے گی جس طرح دنیا کے دوسرے علاقوں میں کی جاتی ہے۔ مگر سویڈن میں مقیم مسلمانوں کے لیے یہ بے حد دشوار گذار ہے، بلکہ تقریباً ناقابل عمل ہے۔ سویڈن کی راجدھانی اسٹاک ہام میں عربوں کے تعاون سے ایک بہت بڑا اسلامک سنٹر اور مسجد کی تعمیر کی گئی ہے۔ جون ۲۰۰۳ میں یہاں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا۔ اس میں عرب کے ایک عالم دکتور یوسف القرضاوی مہمان خصوصی کے طور پر بلائے گئے۔

عرب عالم کے سامنے نماز کے اوقات کا مسئلہ پیش کیا گیا۔ انہوں نے اس کا حل یہ بتایا کہ آپ لوگ ایسا کریں کہ معتدل علاقوں کا اعتبار کرتے ہوئے گھڑی کے لحاظ سے نماز کے اوقات مقرر کرلیں۔ یعنی سورج کا اعتبار نہ کرکے گھڑی کا اعتبار کرنا۔ اپنے اس فتویٰ کی تائید میں انہوں نے ایک حدیث پیش کی۔

صحیح البخاری میں حضرت عائشہ کی ایک روایت ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب بھی آپ کو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ مشکل انتخاب (harder option) کو چھوڑ دیتے اور آسان انتخاب (easier option) کو لے لیتے (ما خیر رسول الله ﷺ بین امرین الا اختار ایسرھما)۔ انہوں نے کہا کہ سویڈن کے حالات میں سورج کا اعتبار کرکے نماز کے اوقات مقرر کرنا مشکل ہے۔ اس کے برعکس گھڑی کا اعتبار کرکے اوقات کو مقرر کرنا آسان ہے اس لیے حدیث کے مطابق آپ کو یہ کرنا چاہئے کہ گھڑی کا اعتبار کرکے نماز کے اوقات مقرر کریں۔ اس اصول کو انہوں نے تیسیر الفتویٰ کا نام دیا۔ یعنی فتویٰ میں آسانی کا طریقہ اختیار کرنا۔

عرب عالم کا یہ فتویٰ بلا شبہہ درست ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ڈکتور یوسف القرضاوی (اور دوسرے علماء) اس شرعی اصول کو فلسطین اور دوسرے مقامات پر ہونے والے متشددانہ جہاد پر منطبق نہ کر سکے۔ اس دوسرے معاملہ میں ان علماء نے تقریباً متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا کہ موجودہ مسلح جہاد عین اسلامی جہاد ہے۔ اور اس میں مرنے والے لوگ شہید کا درجہ پا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ خودکش بمباری (suicide bombing) کو بھی انہوں نے اسلامی جہاد بتایا، حالانکہ صحیح البخاری کی مذکورہ روایت کی روشنی میں تیسیر الفتویٰ کا جو اصول انہوں نے وضع کیا ہے اس کی روشنی میں اگر وہ ان جہادی سرگرمیوں کو دیکھتے تو ان کا فتویٰ بالکل مختلف ہوتا۔ اب وہ کہتے کہ ان مجاہدین کے لیے دو میں سے ایک کے انتخاب (choice) کا معاملہ ہے۔ یعنی پر امن طریقِ کار (peaceful method) اور متشددانہ طریقِ کار (violent method)۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ عمومی پالیسی کے مطابق موجودہ مسلمانوں کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ آسان طریقِ کار کو اختیار کریں۔ یعنی متشددانہ طریقِ کار کو چھوڑ دینا اور پر امن طریقِ کار پر کاربند ہو جانا۔ مگر رواجی فقہی فریم ورک کی بنا پر وہ ایسا نہ کر سکے۔

حدیث اور سنت میں موجودہ زمانہ کے لیے نہایت کامیاب رہنمائی موجود تھی۔ مگر ہمارے علماء کا ذہن رواجی فقہی فریم ورک میں اٹکا رہا۔ اس کا یہ ناقابلِ تلافی نقصان ہوا کہ وہ حدیث کی آفاقی معنویت کو دریافت نہ کر سکے، وہ امت کو جدید حالات کے لحاظ سے صحیح شرعی رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔

مذکورہ محدود ذہنی نقشہ کی بنا پر ایسا ہوا کہ ان علماء نے نماز کے طریقہ کو متعین کرنے کے بارے میں تیسیر الفتویٰ کے اصول کو اختیار کیا، مگر جہاد کے طریقہ کو متعین کرنے کے بارہ میں، برعکس طور پر، تعسیر الفتویٰ کا اصول۔ اس فرق کے نتیجہ میں امت مسلمہ کو موجودہ زمانہ میں جو نقصانات پہنچے وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔

نئی دہلی، ۱۴ جولائی ۲۰۰۳   وحیدالدین

حسن نیت

عمل اور نیت

صحیح البخاری کا پہلا باب اگر چہ آغاز وحی (کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ مگر اہمیت کی بنا پر اس میں سب سے پہلی حدیث نیت سے متعلق درج کی گئی ہے۔ امام البخاری اپنا سلسلۂ سند بتاتے ہوئے روایت کرتے ہیں کہ علقمہ بن وقاص اللیثی کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن الخطاب کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔ ہر آدمی کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس آدمی کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے تھی تو اس کی ہجرت اسی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

کوئی عمل، خواہ بظاہر وہ دینی کیوں نہ ہو، اس کا بدلہ آدمی کو اسی نیت کے اعتبار سے ملتا ہے جس کے تحت اس نے وہ عمل کیا تھا۔ گویا عمل کا مدار آدمی کی اپنی حالت نفسی پر ہے نہ کہ خود عمل کی شکل ظاہری پر۔

مثلاً کلمہ کے الفاظ دہرا کر آدمی مومن بنتا ہے۔ مگر ایمان کا مدار محض کلمہ کے صحت تلفظ پر نہیں ہے، بلکہ ایمان کا اقرار کرنے والے آدمی کی قلبی کیفیت پر ہے۔ نماز کا مدار اس کے مسائل ظاہری کی تعمیل پر نہیں ہے بلکہ خود نمازی کے باطنی خشوع پر ہے۔ انفاق کا مدار اس کی مقدار پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ آدمی نے اپنا انفاق خالص اللہ کے لیے کیا تھا یا اس میں کوئی اور مقصد شامل تھا، وغیرہ۔

آدمی کی جیسی نیت ہو اسی کے لحاظ سے اس کی پسند بنتی ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی کام کی طرف جھکتا ہے جس میں اس کی نیت پوری ہوتی ہو۔ اس کے علاوہ جو کام ہیں ان کی طرف اسے رغبت نہیں ہوتی۔ شہرت چاہنے والا آدمی انہیں کاموں کی طرف دوڑتا ہے جن میں نمائشی پہلو موجود ہو۔ ایک مادیت پسند آدمی انہی میدانوں میں سرگرم ہوتا ہے جن میں اسے مالی فائدہ پانے کی امید ہو۔ ایک قیادت کا شائق آدمی انہی چیزوں میں دھوم مچاتا ہے جن کے

ذریعہ یہ امید ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کا قائد بن جائے گا۔

دنیا کے لیے کرنے والے کا عمل دنیا میں رہ جائے گا اور جو شخص آخرت کے لیے عمل کرے وہ اپنے عمل کا انجام مزید اضافہ کے ساتھ آخرت میں پائے گا۔

قرآن وحدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جو آدمی صالح نیت کے ساتھ عمل کرے اسی کا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوتا ہے۔ اور جس آدمی کی نیت صالح نہ ہو اس کا بظاہر نیک عمل بھی خدا کے یہاں قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کرے گا۔

مثلاً ایک آدمی دکھاوے کے لیے مال خرچ کرے تو اس پر اس کے لیے کوئی ثواب نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی آدمی دکھاوے کے لیے عبادت کرے تو وہ بھی اس کو کسی ثواب کا مستحق نہیں بنائے گی۔ حتی کہ اگر کوئی آدمی شہرت کے لیے جہاد کرے تو ایسا جہاد بھی خدا کی نظر میں بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

اس معاملہ کے دو درجے ہیں۔ ایک کو شعوری اور دوسرے کو غیر شعوری کہا جاسکتا ہے۔ شعوری درجہ یہ ہے کہ آدمی پیشگی طور پر یہ سوچ کر کوئی کام کرے کہ اس کے ذریعہ سے اس کو دنیوی فائدے حاصل ہوں گے۔ لوگوں میں اس کی عزت اور مقبولیت بڑھے گی۔

اس معاملہ کی غیر شعوری صورت یہ ہے کہ آدمی پیشگی طور پر اور بالکل سوچ سمجھ کر تو ایسا کام نہ کرے مگر اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ ایسا بن گیا ہو کہ اس کی صرف نمائشی کاموں میں دلچسپی ہو۔ غیر نمائشی کام اس کو اہم نظر نہ آئیں، اس بنا پر وہ اپنے آپ کو اس میں شریک بھی نہ کرے۔ اس کو مادی فائدے والے کاموں سے رغبت ہو اور غیر مادی قسم کے کاموں سے بے رغبتی۔ ایسا آدمی بھی وسیع تر تقسیم کے اعتبار سے مذکورہ زمرہ ہی میں شامل ہے۔

حقیقت نہ کہ صورت

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اعمال کا دارو مدار نیت پر ہے (إنما الاعمال بالنيات) اس سے معلوم ہوا کہ دین میں جو اعمال بتائے گئے ہیں وہ محض اپنی شکل کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہیں بلکہ حقیقت کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔ یعنی ہر عمل کی ایک روح ہے۔ کسی عمل میں اگر وہ روح پائی جائے جس کے لئے وہ عمل مقرر کیا گیا ہے تو اس عمل کی قیمت ہے اور اگر وہ روح نہ پائی جائے تو پھر اس عمل کی کوئی قیمت اللہ کے یہاں نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ اعمال جن پر بڑے بڑے ثواب بتائے گئے ہیں انھیں کے بارے میں بالکل دوسرے قسم کے اقوال بھی وارد ہیں۔ مثلاً قرآن خدا کی کتاب ہے اور اس کو پڑھنا بہت ثواب ہے۔ مگر اسی کے ساتھ حدیث میں آیا ہے کہ بہت سے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کرتا ہے (رُبّ تال للقرآن والقرآن يلعنه) نماز اہم ترین عبادت ہے مگر حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ نماز نماز نہیں جس میں خشوع نہ ہو (لا صلاة لمن لم يتخشع) روزہ کا اجر اللہ کے یہاں بہت ہے مگر اسی کے ساتھ حدیث بتاتی ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ روزہ سے ان کو بھوک پیاس کے سوا اور کچھ نہیں ملتا (کم من صائم ليس له من صيامه الا الجوع والعطش) اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بہت ثواب کی چیز ہے مگر حدیث میں ہے کہ جس نے دکھانے کے لئے صدقہ کیا اس نے شرک کیا (من تصدق يرائي فقد اشرك) قربانی بہت اعلیٰ عبادت ہے مگر قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کو تمھارا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمھارا تقوی پہنچتا ہے (لن ينال الله لحومها ولا دماؤها ولكن يناله التقوى منكم)

اسی طرح کے نصوص اکثر اعمال کے بارے میں وارد ہیں۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تمھارے جسموں اور تمھاری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے (ان الله تعالیٰ لا ينظر الى اجسامكم ولا الىٰ صوركم ولكن ينظر الى قلوبكم، مسلم) گویا صورت اور جسم کی سطح پر جو عمل ہوتا ہے وہ اللہ کا مطلوب عمل نہیں ہے۔ اللہ کا مطلوب عمل وہ ہے جو دل کی سطح پر کیا جائے۔

اگر آپ کو کسی سے محبت ہے تو دیکھنے میں آپ ظاہری اعضاء سے اس سے محبت کرتے ہیں۔ مگر محبت کا واقعہ حقیقۃً دل کے اندر ہوتا ہے نہ کہ زبان کے الفاظ یا ہاتھ پاؤں کی حرکت کی سطح پر۔ یہی حال اسلامی اعمال کا ہے۔ خدا کے یہاں وہی عمل قیمت والا ہے جو دل سے نکلا ہو۔ جو روح کے اندر پیدا ہونے والی ہلچل کا خارجی ظہور رہو۔ جس میں آدمی کی اندرونی ہستی ڈھل گئی ہو۔ اگر آدمی کا عمل محض اوپری عمل ہو، اس کے دل کی دھڑکنیں اس میں شامل نہ ہوئی ہوں تو ایسے عمل کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

چند حدیثیں

من لبس ثوب شهرة البسه الله ثوب مذلة یوم القیامة (احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)	جو شخص شہرت کا لباس پہنے، اللہ اس کو قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا۔

اس حدیث کا ایک تعلق نمائشی لباس سے ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اگر شہرت پسندی میں مبتلا ہو تو اس کا یہ مزاج اس کو آخرت کی دنیا میں رسوا کرنے والا ثابت ہوگا۔ خاموش کاموں سے بے رغبت ہونا اور ایسے کاموں کے لئے دوڑنا جس میں اخباری اہمیت (نیوز ویلو) ہے، جس سے آدمی کی امیج بڑھتی ہے، جس میں عوامی استقبالیے وصول ہوتے ہیں۔ یہ سب شہرت کے وہ لباس ہیں جو اللہ کو ناپسند ہیں اور آخرت کی ابدی زندگی میں وہ آدمی کے لئے رسوائی کا لباس بن کر ظاہر ہوں گے۔

مَن ذَکَرَ امرأً بشیٔ لیسَ فیه لِیُعیبَه به حَبَسَهُ اللهُ فی نارِ جهنّم حتّٰی یاتِیَ بنفاذِ ماقالَ فیهِ (الطبرانی)	جس نے کسی شخص کے بارے میں ایسی بات کہی جو اس کے اندر نہیں ہے تاکہ اس کے ذریعہ اس کو عیب لگائے تو اللہ اس کو جہنم کی آگ میں روکے گا یہاں تک کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کے حق میں وہ کوئی ثبوت لائے

گویا ایسی تنقید کرنا انگاروں سے کھیلنا ہے جب کہ کسی کی طرف ایسے خیالات منسوب کرکے اس کو نشانۂ تنقید بنایا جائے جو اس نے نہیں کہے یا اس کو ایسی علمی اور اخلاقی کمزوریوں کے لئے متہم کیا جائے جو محض الزام کی حیثیت رکھتی ہوں اور جن کی موجودگی کا کوئی واقعی ثبوت ناقد کی طرف سے پیش نہ کیا گیا ہو۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الله تعالیٰ لا یمحو السیئ بالسیئ ولکن یمحو السیئ بالحسن۔ ان الخبیث لا یمحو الخبیث (احمد وغیرہ)	اللہ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ گندگی کبھی گندگی کو نہیں مٹا سکتی۔

اس حدیث کا ایک پہلو وہ ہے جو انفرادی زندگی سے متعلق ہے۔ ایک شخص کو اپنے پڑوسی سے یا کسی اور سے برے سلوک کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں اگر وہ بھی اس کے ساتھ برا سلوک کرنے لگے تو اس سے برائی میں صرف اضافہ ہوگا۔ اس سے برائی ختم نہیں ہوسکتی۔ برائی کو ختم کرنے کی واحد صورت صرف یہ ہے کہ ایک طرف سے اگر برائی کا اظہار ہونا ہے تو دوسری طرف سے اچھائی کا اظہار کیا جائے۔

یہی اصول اجتماعیات کے لئے بھی صحیح ہے۔ ایک قوم اگر تعصب اور فساد کا طریقہ اختیار کرتی ہے تو دوسری قوم جوابی نفرت اور تعصب سے اس کی اصلاح نہیں کرسکتی۔ ایک حکمراں اگر ظلم کرتا ہے تو ہنگاموں اور توڑ پھوڑ کی سیاست سے اس کا خاتمہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایک گروہ اگر سماجی اور اقتصادی استحصال کرتا ہے تو دوسرا گروہ شور وغل یا منفی تدبیروں سے اس کو دور نہیں کرسکتا۔

اس حدیث میں جس بات کی تعلیم دی گئی ہے اس کو دوسرے لفظوں میں مثبت طریقِ فکر (positive thinking) کیا جاسکتا ہے۔یعنی دوسروں کی طرف سے منفی تجربہ پیش آئے تب بھی آدمی اپنے آپ کو مثبت رویہ پر قائم رکھے۔دوسروں کی طرف سے ستایا جائے تب بھی آدمی ایسا نہ کرے کہ وہ بگڑ کر دوسروں کو ستانے لگے۔دوسرے لوگ اگر بے اصولی کی روش اختیار کریں تب بھی آدمی اپنے آپ کو با اصول روش پر قائم رکھے۔دوسرے لوگ اگر عہد کو توڑ دیں تب بھی آدمی اپنے آپ کو عہد کا پابند بنائے رہے۔

منفی سلوک کے باوجود مثبت سلوک پر قائم رہنے کا یہ طریقہ کوئی بزدلی کا طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ زیادہ بڑا عمل ہے۔یہ طریقہ ایک اعلیٰ تدبیر ہے نہ کہ کسی قسم کی پسپائی۔فطرت کا قانون ہے کہ آگ کو آگ سے بجھایا نہیں جاسکتا۔آگ کو بجھانے کے لیے پانی درکار ہے۔یہی قانون اخلاق دنیا میں انسان سے بھی مطلوب ہے۔

لفظ کا فرق

الامام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری (۲۵۶-۱۹۴ھ) کی کتاب صحیح البخاری حدیث کی مشہور ترین کتاب ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتابیں دو ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم۔ اور صحیح بخاری ان دونوں میں زیادہ صحیح ہے (اتفق العلماء علی أن أصح الكتب بعد القرآن الصحيحان: البخاری ومسلم وكتاب البخاری أصحهما) فتح الباری ۱/۵-۶

امام البخاری نے چھ سو ہزار (چھ لاکھ) حدیثوں کے ذخیرہ میں سے تقریباً ۷۰۰۰ حدیثیں منتخب کیں اور ان سے یہ مجموعہ تیار کیا ہے۔ مزید یہ کہ ہر حدیث کو لینے سے پہلے استخارہ کیا اور دو رکعت نماز پڑھی (صفحہ ۶) حتی کہ خواب میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور انھیں خصوصی طور پر اپنے مجموعہ احادیث کی صحت کے بارہ میں بشارت حاصل ہوئی۔ ایک شاعر نے کہا کہ امام بخاری نے جن حدیثوں کو اپنی کتاب میں جمع کیا ہے، گویا کہ انھوں نے ان احادیث کو براہِ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

كأنّ البخاری فی جمعه　　تلقی من المصطفیٰ ما اکتسب

ان ساری خصوصیات کے باوجود صحیح بخاری غلطیوں سے پاک نہیں، چنانچہ علماء حدیث نے صحیح بخاری میں متعدد نہایت واضح قسم کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

مثال کے طور پر صحیح بخاری کی کتاب الجنائز کا ایک باب ہے: إحداد المرأة علی غیر زوجها۔ یعنی عورت کا اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور شخص کی موت پر سوگ منانا۔ اس باب کی دوسری حدیث یہ ہے:

عن زينب ابنةِ أبی سلمةَ قالت۔ لما جاءَ نعیُ أبی سفیانَ من الشام دعت أمُّ حبيبةَ رضی الله عنها بصُفرةٍ فی اليوم الثالث فمسحت عارِضيها وذِراعيها وقالت۔ إنی كنتُ عن هذا

زینب بنت ابی سلمہ کہتی ہیں کہ جب ابوسفیان کی موت کی خبر شام سے آئی تو ام حبیبہؓ نے تیسرے دن ایک زرد خوشبو منگوائی۔ پھر اس کو اپنے دونوں رخساروں اور دونوں بازوؤں پر ملا اور کہا۔ مجھے اس کی ضرورت نہ تھی مگر میں

لغنيةٌ لولا أن سمعتُ النبي صلى الله عليه وسلم يقول : لا يحلُّ لامرأةٍ تؤمنُ بالله واليوم الآخر أن تُحِدَّ على ميتٍ فوق ثلاثٍ إلا على زوج ، فإنها تُحِدُّ عليه أربعةَ أشهُرٍ وعَشرا۔

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی عورت جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مُردہ شخص پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے ، سوا اپنے شوہر کے ، کیوں کہ اس پر وہ چار مہینہ اور دس دن تک سوگ منائے گی ۔

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابوسفیان بن حرب کا انتقال شام میں ہوا۔ مگر یہ بیان واقعہ کے مطابق نہیں ۔ کیوں کہ متفقہ روایات کے مطابق ، حضرت ابوسفیان کا انتقال مدینہ میں ۳۱ ھ میں ہوا۔ جو واقعہ مدینہ میں پیش آیا ، اس واقعہ کو اس روایت میں شام سے منسوب کیا گیا ہے (فتح الباری ۳/۱۷۶ ۔ ۱۷۵)

اس فروگزاشت پر ردعمل کا ایک غیر سنجیدہ طریقہ ہے ، اور دوسرا سنجیدہ طریقہ ۔ غیر سنجیدہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو شوشہ کے طور پر استعمال کیا جائے ۔ اور سنجیدہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے ۔

جو آدمی اس فروگزاشت کو شوشہ بنائے وہ اس کی بنیاد پر پوری صحیح بخاری کو مشتبہ قرار دے سکتا ہے ۔ وہ امام بخاری کے علم کا مذاق اڑائے گا ۔ وہ ان کے احتیاط کی روایتوں کو فرضی قصے قرار دے گا ۔ وہ کہے گا کہ جب بخاری کو اتنا بھی نہیں معلوم تھا کہ ابوسفیان کا انتقال شام میں ہوا یا مدینہ میں تو ان کی مرتب کی ہوئی کتاب پر کیوں کر بھروسہ کیا جا سکتا ہے ۔

اس کے برعکس سنجیدہ آدمی اس کو ایک انسانی سہو قرار دے کر کہے گا کہ اس سے اصل کتاب پر کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ امام بخاری اس حدیث کو جس ترجمۂ باب کے تحت لائے ہیں ، اس کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس سے ان کی منشا یہ بتانا ہے کہ کسی عورت کے لیے درست نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی اور شخص کی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے ۔ اصل مدعا مذکورہ تسامح کے باوجود ثابت ہے ۔ ابوسفیانؓ کی وفات مدینہ میں ہو تب بھی اور شام میں ہو تب بھی ۔

اسلام کا طریق انقلاب

اسلام کا طریق انقلاب انسانی زندگی میں عین وہی ہے جو نباتات کی زندگی میں درخت کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ درخت اپنی ذات میں ایک مکمل وجود ہے۔ مگر اس مکمل وجود کو ظہور میں لانے کا کام بیج سے شروع ہوتا ہے نہ کہ مکمل درخت سے۔ درخت دراصل بیج کے تدریجی مراحل سے گذر کر اپنی تکمیل تک پہنچنے کا دوسرا نام ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ انسانی زندگی کا ہے۔ انسانی زندگی میں اصلاح کا عمل فرد کے اندر انقلاب سے شروع ہوتا ہے اور پھر ضروری تدریجی مراحل سے گزرتے ہوئے مکمل انقلاب کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کے برعکس اجتماعی زندگی سے عمل کا آغاز کرنا گویا گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا ہے۔ یہ ایک غیر فطری طریقہ ہے جو خدائی منصوبہ کے سراسر خلاف ہے۔ اس قسم کا غیر فطری منصوبہ کبھی موجودہ دنیا میں کامیاب ہونے والا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ایمان اور مومن کے معاملہ کو درخت جیسا ایک معاملہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے: کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر حین پر اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے اور اللہ لوگوں کے لئے مثال بیان کرتا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ (ابراھیم ۲۴۔۲۵)

ایک جائزہ

موجودہ زمانہ کی مسلم دنیا میں ایک عجیب وغریب منظر دکھائی دیتا ہے۔ پچھلے کئی سو سال کے دوران ساری مسلم دنیا میں بڑے بڑے انقلابی رہنما اٹھے۔ انہوں نے ہنگامہ خیز تحریکیں چلائیں۔ مسلمانوں نے جان و مال کی بے شمار قربانیوں کے ذریعہ ان کا ساتھ دیا۔ مگر یہ تمام کی تمام تحریکیں ظاہری ہنگاموں کے باوجود حبط اعمال کا شکار ہوگئیں۔ ان کا کوئی بھی مثبت نتیجہ ملت کے حصہ میں نہیں آیا۔

سب سے پہلے پوری مسلم دنیا میں مغربی استعمار کے خلاف تحریک اٹھائی گئی۔ مگر لمبی خونیں جدوجہد کے بعد جب مغربی استعمار کا خاتمہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ہر مسلم ملک میں مغرب پسند مسلمان لیڈروں نے حکمرانی کے مقام پر قبضہ کرلیا ہے۔ اب ان مسلم حکمرانوں کے خلاف تحریکیں شروع ہوئیں۔ کسی کو جلاوطن کیا گیا، کسی کو گولی ماری گئی۔ کسی کو پھانسی دی گئی۔ ابھی یہ عمل جاری تھا کہ معلوم ہوا کہ میڈیا اور ٹی وی کے ذریعہ مغربی تہذیب ہر مسلم گھر میں نئے راستوں سے داخل ہوگئی ہے۔ اب ملکی ٹی وی اسٹیشنوں کو توڑنے کی مہم شروع ہوئی۔ مگر فتح کے نعروں کے درمیان انکشاف ہوا کہ غیر مسلم ملکوں کی ٹی وی نشریات فضا کے ذریعہ ہر مسلم گھر میں داخل ہورہی ہیں۔ مسلم عورتوں اور مسلم مرد انہیں انتہائی دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اب چھتوں کے ڈش انٹینا توڑے جانے لگے تاکہ مسلمان غیر ملکی ٹی وی نہ دیکھ سکیں۔ مگر عین اسی وقت معلوم ہوا کہ دنیا انٹرنیٹ کے دور میں داخل ہوگئی ہے۔

اب حال یہ ہے کہ جن اخبارات کے دفتروں کو مسلم ملکوں میں جلایا جاتا ہے یا جن کتابوں کو مسلم دشمن بتا کر ان کے اوپر پابندی (ban) لگائی جاتی ہے وہ سب کے سب انٹرنیٹ کے ذریعہ پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں پہنچ رہی ہیں۔ اور انٹرنیٹ وہ بلا ہے جس کے پھیلاؤ کو روکنا کسی سپر پاور کے بس میں بھی نہیں۔

غلطی کہاں ہے

یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اہل ایمان کی کوششوں کو بارآور کرے گا پھر موجودہ زمانہ میں برعکس طور پر کیوں ایسا ہورہا ہے کہ مسلم رہنماؤں کی کوششیں ایک کے بعد ایک مکمل طور پر بے نتیجہ ہوتی جارہی ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ ان نام نہاد اسلامی قائدین کا نشانہ عمل ہی غلط تھا۔ وہ اپنی تمام کوششیں سسٹم کو بدلنے پر لگاتے رہے۔ جب کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فرد کو بدلنے پر ساری کوشش صرف کی جائے۔ سسٹم پر عمل کرنا درخت کی شاخوں پر عمل کرنا ہے۔ اور فرد یا ذہن پر عمل کرنا درخت

کی جڑوں پرعمل کرنا۔ درخت کی شاخوں پرعمل خدا کی اس دنیا میں کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔ اس کے برعکس اگر درخت کی جڑوں پرعمل کیا جائے تو نتیجہ اتنا ہی یقینی ہو جاتا ہے جتنا شام کے بعد اگلی صبح کو سورج کا نکلنا۔

اسلامی نقطہ نظر سے اصل کام یہ ہے کہ فرد کو بدلا جائے۔ فرد کی سوچ میں تبدیلی لائی جائے۔ فرد کی پسند ناپسند کے معیار کو درست کیا جائے۔ فرد کے اندر غیر حق پسندی کے مزاج کو ختم کر کے اس کو حق پسند بنایا جائے۔ فرد بدلے گا تو انسان بدلے گا۔ انسان بدلے گا تو سماج بدلے گا۔ اور جب سماج بدلے گا تو اس کے بعد سسٹم اپنے آپ بدل جائے گا۔

مبنی بر نظام جدوجہد کے مقابلہ میں مبنی بر انسان جدوجہد کی اہمیت یہ ہے کہ ہر چیز آخر کار انسان کے ہاتھ میں ہے۔ باطل نظام کو بدلنے کے نام سے پچھلی صدیوں میں جن چیزوں کے خلاف تحریکیں چلائی گئیں ان سب کو بنانے اور چلانے والا براہ راست یا بالواسطہ طور پر انسان ہی تھا۔ کوئی بھی نظام اپنے آپ وجود میں نہیں آتا۔ بلکہ کچھ انسان اس کو وجود میں لاتے ہیں۔ اس لئے نظام کو بدلنے کا کام انسان کو بدلنے سے شروع ہوگا، جس طرح درخت کو وجود میں لانے کا عمل بیج پرعمل سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ اس دنیا میں نہ ممکن ہے اور نہ نتیجہ خیز۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں

قرآن اور حدیث کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک انسانی اصلاح کے معاملہ میں اصل اہمیت قلب کی ہے۔ اسلامی جدوجہد کا سارا نشانہ یہ ہے کہ انسان کے قلب کو بدلا جائے۔ قلب ہی کی درستگی پر کسی انسان کو جنت کا داخلہ ملتا ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: إلا من أتى الله بقلب سليم (الشعراء ۸۹) یعنی جنت میں داخلہ صرف اس شخص کو ملے گا جو قلبِ سلیم کے ساتھ وہاں پہنچے۔

یہی بات حدیث میں مختلف انداز سے بیان ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث وہ ہے

جو صحیح مسلم، ابن ماجہ، الدارمی وغیرہ میں آئی ہے۔ صحیح البخاری (کتاب الإیمان) کے الفاظ یہ ہیں:
ألا و إن فی الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد کلّه، و إذا فسدت فسد الجسد کله، ألا و هی القلب (سن لو کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے تو پورا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سن لو کہ وہ قلب ہے۔)

اسلام میں انسان کی جو اہم صفات بتائی گئی ہیں ان سب کا تعلق قلب سے ہے۔ مثلاً معرفت، اخلاص، حسن نیت، تقویٰ، شکر، خشوع، تضرع، انابت، اخبات، وغیرہ، سب کا سرچشمہ قلب ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی پوری تحریک قلب پر مبنی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، انسان سے جو چیز مطلوب ہے وہ داخل القلب ایمان (الحجرات ۱۴) ہے۔ اسلام پہلے قلب کے اندر جڑ پکڑتا ہے، اس کے بعد وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا نتیجہ ظاہر کرتا ہے۔

یہ قلب کہاں ہوتا ہے۔ قلب نہ سماج میں ہوتا ہے اور نہ حکومتی ادارہ یا سیاسی نظام میں۔ قلب ہمیشہ ایک فرد انسانی میں ہوتا ہے۔ سماج یا سیاسی ادارہ افراد ہی کے مجموعے کا ایک علامتی نام ہے۔ افراد سے الگ ہو کر سماجی نظام یا سیاسی ادارہ کا کوئی وجود ہی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تحریک کا اصل نشانہ فرد ہے، سماجی یا سیاسی نظام اسلامی تحریک کا براہ راست نشانہ نہیں۔ اسلام کا تقاضہ ہے کہ اصلاح کی ساری کوشش افرادِ انسانی پر جاری کی جائے کیوں کہ افراد ہی کی اصلاح سے اجتماعی زندگی کی اصلاح ہوگی، اور افراد ہی کے بگڑنے سے اجتماعی زندگی بگڑ جائے گی۔

اسلامی تاریخ کی مثال

اسلامی تاریخ اس اصول کی ایک نہایت کامیاب مثال ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد امت کو جو ہدایات دیں، ان میں ایک انتہائی اہم ہدایت یہ تھی کہ سیاسی نظام میں بگاڑ ہو تب

بھی تم لوگ نظام سے نہ ٹکرانا بلکہ نظام (سسٹم) کونظر انداز کرتے ہوئے فرد کی اصلاح پر اپنی ساری کوششیں جاری رکھنا۔ (تفصیلی حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو'فکر اسلامی')

واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں کچھ مسلم رہنماؤں کے استثناء کو چھوڑ کر اسلام کی اب تک کی پوری تاریخ میں پیغمبر اسلام کی اس ہدایت پر عمل ہوتا رہا ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد بنوامیہ کے زمانہ ہی میں سیاسی بگاڑ آ گیا تھا۔ یہ بگاڑ انیسویں صدی کے مسلم حکمرانوں تک جاری رہا۔ مگر ہر دور میں امت کے نمائندہ لوگوں نے اعراض کی پالیسی اختیار کی۔ وہ مختلف پہلوؤں سے اس کام پر لگے رہے جس کو ہم نے اصلاح افراد یا اصلاح قلب کا نام دیا ہے۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، علماء اور صوفیاء ہر دور میں کثیر تعداد میں پیدا ہوئے مگر تقریباً ہر ایک نے اصلاح پر اپنے آپ کو وقف رکھا۔ وہ موجودہ طرز کے انقلابی نظام والے کام میں کبھی مشغول نہیں ہوئے۔

اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام کی پچھلی ہزار سالہ تاریخ ان تباہیوں سے پاک رہی جس کا نمونہ موجودہ زمانہ میں دیکھا جا رہا ہے۔ اسلامی ادارے پر سکون طور پر کام کرتے رہے۔ اسلامی علوم کی خدمت موافق حالات میں جاری رہی۔ دعوت واصلاح کا کام کسی رکاوٹ کے بغیر فطری انداز میں جاری رہا۔ مسلم معاشرہ میں کم وبیش اسلامی قدروں کا رواج ہر دور میں باقی رہا، وغیرہ۔

تفسیر کے نام پر تحریف

مذکورہ برائی کی آخری بدترین صورت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ایسے مسلم مفکرین اٹھے جنھوں نے اسلام کی محرفانہ تعبیر کر کے انقلابی نظام کے کام ہی کو امت مسلمہ کا مشن ثابت کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے شرک کی فہرست میں ''سیاسی شرک'' کا اضافہ کیا۔ انہوں نے طاغوت کے مفہوم میں خود ساختہ توسیع کر کے سیکولر حکمرانوں کو طاغوت کے ہم معنی قرار دیا۔ انہوں نے عبادت کو اطاعت بتایا اور اس کے بعد ساری سیاست کو اس میں داخل کر دیا۔ انہوں نے حکم کو فوق الفطری حکم کے بجائے سیاسی حکم کے ہم معنیٰ بنا کر اعلان کیا کہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم خدا کی سیاسی

حکمرانی کو زمین پر قائم کریں۔ قرآن کے لازم کو متعدی بنا کر یہ کیا کہ عدل کی پیروی کرنے کے بجائے عدل کا جھنڈا اٹھانے کو مسلمانوں کا فریضہ منصبی قرار دیا۔ انہوں نے دعوت کو عملی شہادت سے جوڑ کر یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ جب تک سیاسی اقتدار پر قبضہ کر کے زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی قوانین جاری نہ کئے جائیں اس وقت تک دعوت وشہادت کا کام انجام ہی نہیں دیا جاسکتا، وغیرہ۔

اس قسم کی ہر تعبیر سراسر محرفانہ تعبیر ہے۔ وہ اسلام کے پورے ڈھانچے کو بدل دینے والی ہے۔ ان تعبیرات کا نتیجہ صرف یہ ہوسکتا ہے کہ ان سے متأثر ہونے والوں کے اندر احتسابِ خویش کے بجائے احتساب غیر کا مزاج پیدا ہو۔ ان کے اندر متقیانہ ذہن کے بجائے سیاسی ذہن تشکیل پائے، وہ اہل عالَم کو مدعو کے بجائے حریف کی نظر سے دیکھنے لگیں، وہ محبت انسانیت کے بجائے نفرتِ انسانیت میں جینے لگیں۔ وہ مسلم معاشرہ کو حکمراں اور غیر حکمراں میں تقسیم کر کے لامتناہی قسم کی باہمی نزاع چھیڑ دیں۔ وہ لوگوں کو تعمیری کام کے بجائے تخریبی کام میں مشغول کر دیں۔ خلاصہ یہ کہ اسلام کے نام پر وہ لوگوں کو غیر اسلام کی راہوں میں دوڑا دیں۔

ایمان

ذائقہ ایمان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربّاً وبمحمد رسولاً وبالاسلام دیناً۔ ایمان کا مزہ چکھا اس شخص نے جو اللہ کی ربوبیت پر راضی ہوگیا۔ جو محمدؐ کی رسالت پر راضی ہوگیا اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوگیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان و اسلام کا معاملہ کوئی خشک معاملہ نہیں ہے بلکہ ذائقہ کا معاملہ ہے۔ اگر آپ پھل کے چھلکے کو کھائیں تو آپ کو اس سے کوئی ذائقہ نہیں ملے گا۔ مگر جب آپ پھل کا مغز کھاتے ہیں تو آپ کو اس میں ایک ذائقہ ملتا ہے۔ یہی معاملہ ایمان کا ہے۔ ایمان کو بھی اگر حقیقی طور پر اختیار کیا جائے تو وہ آدمی کے لیے نہایت اعلیٰ ذائقہ کی چیز بن جائے گا۔

حدیث کے مطابق، ایمان کا یہ درجہ آدمی کو "رضامندی" کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ آدمی جب دل کی آمادگی کے ساتھ پوری طرح دین پر راضی ہو جائے تو دین اس کے لیے ذائقہ کی چیز بن جاتا ہے۔

ذائقہ ایک تقابلی لفظ ہے یعنی بدمزگی کے مقابل میں خوش مزگی۔ ایمان آدمی کے اندر یہ استعداد پیدا کرتا ہے کہ غیر دینی بات اس کو بدمزہ معلوم ہو اور وہ اس کو کراہت کے ساتھ چھوڑ دے۔ اس کے مقابلے میں دینی بات اس کو خوش مزہ محسوس ہو اور اس کو وہ پسندیدگی کے ساتھ اختیار کرلے۔

خدا کو اپنا رب بنانے کا مطلب خدا کو اپنا سب کچھ بنالینا ہے۔ جب کوئی آدمی پورے معنوں میں خدا کو اپنا سب کچھ بناتا ہے تو بار بار اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسا کرنے کے نتیجے میں بظاہر وہ دنیوی نقصان سے دوچار ہو رہا ہے مگر وہ اس نقصان کو بخوشی برداشت کرتا ہے۔ کیوں کہ خدا سے تعلق ہی اس کے لیے لذیذ ترین تجربہ بن جاتا ہے۔ خواہ اس میں نقصان ہو یا فائدہ۔

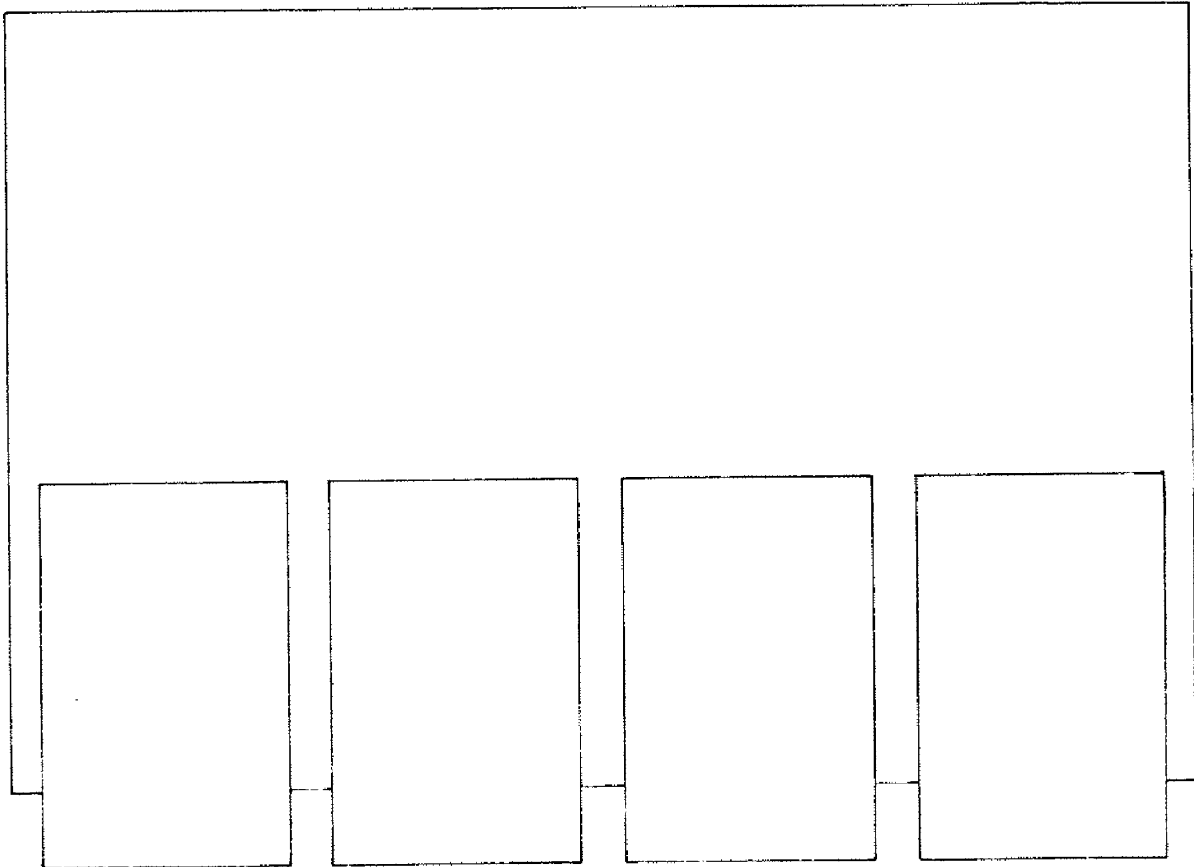
اسی طرح ایک مومن جب زندگی کے میدان میں داخل ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو اختیار کرنے میں دنیوی مصلحتیں مجروح ہو رہی ہیں۔ اس کے باوجود وہ طریقۂ نبویؐ پر قائم رہتا ہے۔ کیوں کہ طریقۂ نبوی کو چھوڑنا اس کے لیے بدذائقہ چیز بن جاتی اور طریقۂ نبوی پر قائم ہونا ایک خوش ذائقہ چیز۔

یہی معاملہ وسیع تر معنوں میں پورے اسلام کا ہے۔ اسلام کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی پوری زندگی

اس طرح گزارے کہ وہ ہر معاملے میں خدائی احکام کی پیروی کر رہا ہے۔ اندرونی خواہشوں کو زیر کرنے سے لے کر بیرونی کردار کو ربانی بنانے تک، ہر معاملے میں وہ خدا کا تابعدار بنا رہے، وہ اپنی پوری زندگی کو خدا کے رنگ میں رنگ لے۔

اس قسم کی زندگی گزارنا کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ پورے معنوں میں ایک مجاہدانہ معاملہ ہے۔ مسلسل جدوجہد ہی کے ذریعہ آدمی اس پر قائم رہ سکتا ہے۔

اس طرح اسلامی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے دو راہیں آتی ہیں۔ ایک وہ جو اسلامی ہے، مگر اس میں طرح طرح کی مشکلات ہیں۔ دوسرے وہ جو اسلامی نہیں، مگر بظاہر اس میں آسانیاں ہی آسانیاں ہیں، مگر جو سچا مومن ہے وہ بلا جھجک اسلامی طریقے کو اختیار کر لیتا ہے اور غیر اسلامی طریقے کو ترک کر دیتا ہے۔ کیوں کہ اسلامی طریقہ ظاہری ناموافقت کے باوجود اس کے لیے خوش مزہ بن جاتا ہے اور غیر اسلامی طریقہ ظاہری موافقت کے باوجود اس کو سخت بدمزہ محسوس ہونے لگتا ہے۔



مخلصانہ ایمان

عن زید بن أرقم رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من قال لا الہ إلا اللہ مخلصا دخل الجنۃ۔ قیل وما اخلاصھا۔ قال أن تحجزہ عن محارم اللہ (الترغیب والترہیب)

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص اخلاص کے ساتھ لاالٰہ الااللہ کہے وہ جنّت میں جائے گا۔ کہا گیا کہ اس کا اخلاص کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ کہ یہ کلمہ اس کو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے روک دے۔

اخلاص اسی کیفیت کے لیے ایک دینی لفظ ہے جس کو نفسیات کی اصطلاح میں سنجیدگی کہا جاتا ہے۔ جو آدمی اس حقیقت کو جان لے کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور وہ فی الواقع پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کا اقرار کرے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی زندگی اور اس کے قول وعمل میں اس کا اظہار ہونے لگے گا۔ سنجیدہ قول اور اس کے عملی اختیار میں کوئی فرق نہیں۔

ایک شخص جب یہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، تو وہ حقیقۃً اپنی اس دریافت کو بیان کرتا ہے کہ اس کائنات میں ساری عظمتیں صرف ایک اللہ کو حاصل ہیں۔ اللہ کو اس کی تمام شان عظمت کے ساتھ جان لینے کے بعد آدمی کے اندر جو کیفیت ابھرتی ہے اسی کا نام اخلاص ہے۔

آدمی جب اللہ کو اس کے جلال وکمال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ اپنے عجز اور اپنے احتیاج کو بھی دریافت کر لیتا ہے۔ یہ دریافت اس کے اندر عبدیت کا جذبہ ابھارتی ہے۔ وہ خدا کی نعمتوں کو جان کر شکر وسپاس کی کیفیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد خدا کے سامنے حاضری کا تصور اس کو اپنے قول وعمل کے بارہ میں آخری حد تک چوکنا بنا دیتا ہے۔ ان کیفیات کے مجموعہ کا نام اخلاص ہے، اور ان کے زیر اثر جو انسان بنتا ہے اسی کا نام مخلص انسان ہے۔

اس نوعیت کا اخلاص جب کسی آدمی کے اندر پیدا ہو تو اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرے، وہ خدا کی منع کی ہوئی چیزوں کو اپنے لیے حلال کر لے۔

ایک سچے انسان کے لیے قول اور عمل میں کوئی فرق نہیں۔ جو شخص سچے دل سے اللہ کی معبودیت کا اقرار کرے گا، اس کے بعد ناممکن ہے کہ اس کا عمل اس کے اقرار کے تابع نہ ہو جائے۔

ایک حدیث

صحیح مسلم کا آغاز کتاب الایمان سے ہوتا ہے۔ اس کے ایک باب کا عنوان یہ ہے کہ جوشخص قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے اس کے لئے جہنم کی وعید ہے (**باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین فاجرة بالنار**):

عن ابی امامة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: من اقتطع حق امرئ مسلم بیمینه فقد اوجب الله له النار وحرم علیه الجنة، فقال له رجل وان کان شیئا یسیرا یا رسول الله، قال: وإن کان قضیباً من اراك (الجامع لأحکام القرآن ۱۲۰/۴)

ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جوشخص کسی مسلمان آدمی کا مال قسم کھا کر مارلے تو اللہ اس کے لیے آگ کو واجب کر دیتا ہے۔ اور اس پر جنت حرام کر دیتا ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اگر چہ وہ کوئی معمولی چیز ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اگر چہ وہ پیلو کی ایک ٹہنی کیوں نہ ہو۔

دوسرے کی چیز ہڑپ کرنے کے بعد قسم کھانا دراصل اپنے آپ کو جائز ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ آدمی کبھی قسم کے ذریعہ سے اپنی تبریر کرتا ہے اور کبھی دوسرے ذریعہ سے۔ آدمی جھوٹے الفاظ بول کر انسانوں کے سامنے اپنی سرخروئی باقی رکھنا چاہتا ہے، اس لیے وہ قسم جیسی تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب کہ آدمی اپنے آپ کو اہل دنیا کے سامنے پاکباز ثابت کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوتا ہے، اللہ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ اس کو جہنمی انسانوں کی فہرست میں لکھ لو۔ ناحق کسی کی چیز لینا برا ہے۔ مگر یہ اور بھی زیادہ برا ہے کہ آدمی جھوٹے الفاظ بول کر اپنی اس برائی کو بھلائی ثابت کرے۔ ایسا کرنا خدا پر جسارت ہے۔ یہ جرم پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ ایسا آدمی اپنے بارہ میں ثابت کر رہا ہے کہ وہ اخلاقی کمزوری کے ساتھ بے حسی اور ہٹ دھرمی اور خدا سے کامل بے خوفی جیسے شدید تر امراض میں مبتلا ہے۔

ایمان پر قائم رہنا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم کو جنت کی بشارت ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ (حم السجدہ ۳۰)

اس کی تفسیر کے تحت دو اقتباس یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

عن سفیان بن عبد الله الثقفی قال، قلت یارسول الله قل لی فی الاسلام قولاً لا اسئلُ عنه احداً بعدك. قال صلی الله علیه وسلم: قل امنتُ بالله ثم استقم

(تفسیر ابن کثیر، جلد ثالث،)

حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے اسلام کے بارہ میں ایسی بات بتائیے کہ اس کے بارہ میں آپ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر ثابت قدم رہو۔

قال الحافظ ابو یعلی الموصلی عن انس بن مالك رضی الله عنه قال: قرأ علینا رسول الله صلی الله علیه وسلم هٰذه الآیة (إنَّ الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا) فقال قد قالها ناس ثم کفر اکثرهم فمن قالها حتی یموت فقد استقام علیها۔

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے یہ آیت پڑھی (جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے) آپ نے فرمایا کہ لوگوں نے یہ کلمہ کہا۔ پھر ان میں سے اکثر اس کے منکر بن گیے۔ جس شخص نے اس کو موت تک کہا تو وہ اس پر قائم رہا۔

ایمان لانا اس بات کا عہد کرنا ہے کہ آدمی دنیا میں خدا کا بن کر رہے گا۔ وہ اپنے ہر معاملہ میں وہی کرے گا جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو اور وہ نہ کرے گا جو خدا کی مرضی کے مطابق نہ ہو۔ مومن وہ ہے جو یہ عہد کرکے زندگی میں داخل ہو اور پھر ہر معاملہ میں اس عہد پر قائم رہے خواہ وہ اس کی خواہش کے مطابق ہو یا اس کی خواہش کے خلاف۔ منافق وہ ہے جس نے زبان سے یہ عہد کیا مگر جب اس عہد پر عمل کرنے کا وقت آیا تو وہ پھر گیا۔ وہ خدا کو بھول کر اپنے نفس کے پیچھے چل پڑا۔

منافقانہ خوبی

قرآن میں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: اور جب تم انہیں دیکھو تو ان کے جسم تم کو اچھے لگتے ہیں۔ اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو تم ان کی بات کو سنتے ہو (واذا رایتھم تعجبك اجسامھم وان یقولوا تسمع لقولھم) المنافقون ۴۔

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ امانت (honesty) لوگوں کے دلوں سے اُٹھ جائے گی۔ اس زمانہ میں بظاہر لوگوں کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ کتنا زیادہ عاقل ہے اور وہ کتنا زیادہ ظرف والا ہے اور وہ کتنا زیادہ صبر واستقلال والا ہے۔ حالاں کہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا:

(ویقال للرجل ما اعقله وما اظرفه وما اجلده ومافی قلبه مثقال حبة من خردل من ایمان) فتح الباری ۱۱/ ۳۴

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کردار کی دو قسمیں ہیں — مخلصانہ اور منافقانہ۔ جو اخلاقی خوبیاں ایک مخلص انسان کے اندر ہوتی ہیں، بظاہر وہی غیر مخلص انسان کے اندر بھی ہوسکتی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کو صرف مخلصانہ کردار مطلوب ہے، غیر مخلصانہ کردار کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ مخلصانہ کردار خوفِ خدا کے تحت پیدا ہوتا ہے اور منافقانہ کردار خوف انسان کے تحت۔ مخلصانہ کردار کا محرک آخرت کا معاملہ ہے اور منافقانہ کردار کا محرک دنیا کا معاملہ۔ مخلصانہ کردار خدا پرستانہ جذبہ کے تحت ابھرتا ہے اور منافقانہ کردار صرف تاجرانہ جذبہ کے تحت۔

ایمان کا ذائقہ

امام مسلم بن الحجاج (۲۶۱ - ۲۰۶ ھ) بلند پایہ محدث ہیں۔ الجامع الصحیح یا الصحیح لمسلم ان کی مشہور کتاب ہے۔ اس کے "کتاب الایمان" میں ایک باب ان الفاظ کے تحت قائم کیا گیا ہے: باب الدلیل علی انّ من رضی باللّٰہ ربّاً وبالاسلام دیناً وبمحمدٍ رسولاً فھو مومن و ان ارتکب المعاصی الکبائر۔ اس باب کے ذیل میں انھوں نے یہ حدیث نقل کی ہے:

عن العباس بن عبد المطلب انہ سمعَ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: ذَاقَ طَعْمَ الایمانِ مَن رَضِیَ باللّٰہِ ربًّا وبالاسلام دیناً وبمحمدٍ رسولاً۔

عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ ایمان کا مزا چکھا اس شخص نے جو راضی ہوگیا اللہ کو رب بنانے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد کے رسول ہونے پر۔

انسان کے اندر سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ انا (ego) کا جذبہ ہے۔ آدمی ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے مگر وہ انا کی قربانی دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ موجودہ زمانہ میں ہیومنزم کی صورت میں اس نے آخری فتنہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ہیومنزم کا مطلب ہے ——— تقدیر کی نشست کا خدا کے بجائے انسان کی طرف منتقل ہو جانا،

Transfer of seat from God to man.

ایمان در اصل اسی انا کی قربانی کا نام ہے۔ مومن اپنی انا کو دفن کرکے خارجی حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ اِس کے لیے راضی ہوتا ہے کہ اس کے اپنے لیے عبد کی سیٹ ہو اور خدا کے لیے معبود کی سیٹ۔ وہ خدا کے پیغمبر کو پیغمبر کا مقام دے اور خود اپنے لیے غیر پیغمبر کے مقام کو پسند کرلے۔ وہ صرف خدا کے دین کو دین کا درجہ دے اور خود دین وضع کرنے کے حق سے مکمل طور پر دست بردار ہو جائے۔

اس قسم کا ایک فیصلہ زبردست فکری انقلاب کے بعد ممکن ہوتا ہے۔ ایسا آدمی معرفت کا خصوصی ذائقہ چکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ اس خصوصی قربانی کے لیے کبھی آمادہ نہ ہو سکے۔

ایمان کی برکتیں کس کو ملتی ہیں

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا وبمحمد رسولا وبالاسلام دینا

ایمان کا مزہ چکھا اس شخص نے جو راضی ہوگیا اللہ کو رب بنانے پر، محمد کو اپنا رسول بنانے پر اور اسلام کو اپنا دین بنانے پر۔

ثلاث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان، من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما و من احب عبدا لا یحبہ الا للہ ومن یکرہ ان یعود فی الکفر بعد اذ انقذہ اللہ کما یکرہ ان یلقی فی النار (بخاری)

ایمان کی مٹھاس پائی اس شخص نے جس کے اندر تین باتیں ہوں، جس کے لئے اللہ اور رسول تمام دوسری چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔ جو کسی شخص سے صرف اللہ کے لئے محبت کرے۔ جو کفر سے نکلنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف لوٹنے کو اسی طرح ناپسند کرے جس طرح وہ آگ میں گرنے کو ناپسند کرے گا۔

مومن بننا کیا ہے یہ دنیا میں رہ کر آخرت پسندانہ زندگی اختیار کرنا ہے، یہ نفس اور شیطان کے ماحول میں رہتے ہوئے خدا والا بن کر رہنا ہے، یہ دکھائی دینے والی چیزوں میں گھر کر نہ دکھائی دینے والی چیزوں کا چاہنے والا بننا ہے۔ یہ ایک مشکل فیصلہ ہے اور کسی شخص کو اس مشکل فیصلہ پر قائم رکھنے کی ضامن صرف دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان اس کے لئے ذائقہ (مزہ) کی چیز بن گیا ہو جس طرح ایک لذیذ کھانا آدمی کے لئے ذائقہ کی چیز ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایمان اس کے لئے ایک محبت کا معاملہ بن جائے جس طرح عزیز بیٹے سے تعلق کسی باپ کے لئے محبت کا معاملہ ہوتا ہے۔

کوئی چیز جب آدمی کے لئے مزہ کی چیز بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کا تعلق ذاتی مفاد کی حد تک وابستہ ہوگیا ہے۔ جس چیز میں آدمی مزہ پانے لگے اس کو وہ کبھی نہیں چھوڑتا، وہ ہر قیمت پر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چیز جس سے آدمی کی روح کو غذا ملے، جس سے اس کے دل کو تسکین حاصل ہوتی ہو، جو اس کے دماغ کو فکری یکسوئی عطا کرتی ہو، جس کے کھونے سے آدمی خالی ہو جائے اور جس کے پانے سے وہ اپنے آپ کو بھرپور محسوس کرے۔ ایسی چیز آدمی کے لئے اسی طرح ضروری ہو جاتی ہے جیسے اس کا اپنا وجود۔ ایمان کی برکتیں آدمی کو اسی وقت ملتی ہیں جب ایمان اس کے لئے اس قسم کا ذائقہ والا ایمان بن جائے۔

باہر کے کسی آدمی سے آپ کو تکلیف پہنچ جائے تو آپ کے دل میں اس کے خلاف مستقل نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اپنے بیٹے یا بیٹی سے تکلیف پہنچتی ہے تو وقتی احساس کے بعد آپ اس کو بھول جاتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ باہر کے کسی آدمی سے آپ کا تعلق محض رسمی تعلق ہے جب کہ بیٹے اور بیٹی سے آپ کا تعلق محبت کا تعلق ہے۔ رسمی تعلق ہو تو شکایت اور اختلاف پیدا ہوتے ہی تعلق میں فرق آجاتا ہے۔ مگر کسی کے ساتھ محبت کا تعلق پیدا ہو جائے تو شکایت اور اختلاف کے باوجود تعلق میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ محبت کا جذبہ کسی تعلق کو ایسی سطح پر پہنچا دیتا ہے جہاں تمام مخالف اسباب حذف ہو جاتے ہیں اور صرف موافق اسباب باقی رہتے ہیں۔ اللہ اور رسول سے اسی قسم کا محبت کا تعلق مطلوب ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو آدمی امتحان کے کٹھن حالات میں خدا پرستی پر قائم نہیں رہ سکتا۔

منافقت کا نیا دور

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بعد کے زمانے میں لوگوں کے درمیان سے امانت (honesty) اٹھ جائے گی۔ تقریباً تمام لوگ خائن (dishonest) ہوجائیں گے۔ مگر یہ زوال صرف داخل کے اعتبار سے آئے گا۔ جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ:

ویقال للرجل : ماأعقله وما اظرفه وما اجلده وما فی قلبه مثقال حبة خردل من ایمان (صحیح البخاری، کتاب الفتن) یعنی اورایک آدمی کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ کتنا زیادہ عقل مند ہے، وہ کتنا زیادہ خوش گفتار ہے، وہ کتنا زبردست ہے۔ حالانکہ اس کے دل میں رائی کے ایک دانہ کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

اس حدیث میں غالباً ان منافقین کا ذکر ہے جو صنعتی تہذیب کے دور میں پیدا ہونے والے تھے۔ منافقت دراصل مفاد پرستانہ کردار کا دوسرا نام ہے۔ یعنی آدمی کے اندر ایمان واخلاق کی روح موجود نہ ہو۔ مگر مادی فائدے کے لئے یا لوگوں کے درمیان اچھا بننے کے لئے وہ ظاہری طور پر ایمان واخلاق کی نمائش کرے۔

یہ عین وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں پروفیشنل اخلاق کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اس قسم کے مصنوعی اخلاق کے فائدے ہزاروں گنا بڑھ گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ مصنوعی اخلاق کے وسائل میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اس زمانی فرق نے منافقانہ روش اختیار کرنے کے محرکات میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ اس بنا پر یہ بالکل فطری ہے کہ صنعتی تہذیب کے دور میں ایسے شاندار منافقین ظہور میں آئیں جن کا ظہور قدیم زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ نئے دور کی منافقت کو دوسرے لفظوں میں پروفیشنل اسلام بھی کہا جاسکتا ہے۔ دور جدید کے پررونق اسباب ووسائل نے پروفیشنل اسلام کو اتنا زیادہ شاندار بنا دیا ہے جو بظاہر مخلصانہ اسلام میں بھی موجود نہیں۔

منافق کی پہچان

صحیح بخاری اور صحیح مسلم (کتاب الایمان) میں منافقت کی پہچان کے بارہ میں کچھ روایتیں آئی ہیں۔ معمولی لفظی فرق کے ساتھ وہ روایت یہ ہے :

اربعٌ مَن کنَّ فیہ کانَ منافِقاً خالصاً۔ اِذا ائتُمِنَ خانَ - وَ اذا حدَّثَ کذَبَ - و اذا عاھدَ غدَرَ و اذا خاصَمَ فَجَرَ - و اِن صامَ وصلّیٰ و زعَمَ اَنّہ مُسلِمٌ -

چار خصلتیں جس میں ہوں وہ پورا منافق ہے۔ جب وہ امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ اور جب وہ وعدہ کرے تو اس سے پھر جائے اور جب وہ بحث کرے تو انصاف سے ہٹ جائے۔ خواہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور گمان کرے کہ وہ مسلمان ہے۔

اجتماعی زندگی میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان جو باہمی معاملات پیش آتے ہیں ان کی مختلف صورتیں ہیں۔ تاہم بڑی تقسیم میں وہ چار ہیں۔ آدمی کی اندرونی شخصیت کیسی ہے، اس کا اظہار ان پہلوؤں میں ہوتا رہتا ہے۔ ایک قسم کا اظہار آدمی کے مخلص ہونے کی پہچان ہے اور دوسرے قسم کا اظہار آدمی کے منافق ہونے کی پہچان۔

مال اور جائداد کے سلسلہ میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کی چیز دوسرے انسان کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ اب جو آدمی دوسرے کی چیز کو حق دار کے حوالے نہ کرے بلکہ اس پر خود قبضہ کرنے لگے وہ ایسا کر کے اپنے آپ کو منافق ثابت کر رہا ہے۔

یہی معاملہ قول کا ہے۔ ایک آدمی اگر اپنے قول میں محتاط نہ ہو، وہ بات کرے تو اس میں جھوٹ ملا دے تو ایسا آدمی اللہ کے نزدیک منافقین میں شامل ہے۔

اسی طرح ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان بسا اوقات معاہدہ کی صورت پیش آتی ہے۔ اب جو شخص معاہدہ تو کرلے مگر معاہدہ پورا کرنے کا وقت آئے تو اس کو پورا نہ کرے تو وہ حقیقت کے اعتبار سے منافق ہے۔

مومن با اصول انسان کا نام ہے اور منافق بے اصول انسان کا نام۔

ایمانی کیفیات

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عرض علی ربی عزو جل لیجعل لی بطحاء مکة ذهبا فقلت لا یا رب، ولکن اشبع یوماً و اجوع یوماً فاذا جعت تضرعت الیك و ذکرتك و اذا شبعت حمدتك و شکرتك (مسند احمد ۲۵۴/۵)
یعنی اللہ نے یہ پیشکش فرمائی کہ تمہارے لیے مکہ کی وادی کو سونا بنادیا جائے۔ میں نے کہا کہ اے میرے رب، نہیں۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ میں ایک دن سیر ہوکر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ پھر جب مجھے بھوک لگے تو میں تجھ سے تضرع کروں اور تجھ کو یاد کروں اور جب مجھے سیری حاصل ہو تو میں تیری حمد کروں اور تیرا شکر کروں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمانی کیفیات کا تعلق براہ راست طور پر حالات سے ہے۔ زندگی میں جب بھی کوئی صورت حال پیش آتی ہے تو اس کے لحاظ سے مومن کے لیے ایمانی کیفیات کا سرمایہ موجود رہتا ہے۔ جس طرح احوال کی بہت سی قسمیں ہیں اسی طرح ایمانی کیفیات کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور ہر قسم میں اُس کے مطابق، آدمی کے اندر ایمانی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی کو امتحان کے لیے رکھا گیا ہے۔ اسی لیے یہاں ہر عورت اور مرد کے ساتھ طرح طرح کے احوال پیش آتے ہیں۔ ایسا اسی لیے ہوتا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ کون اپنی جانچ پر پورا اُترا اور کون اس میں ناکام ہوگیا۔

اس دنیا میں آرام کی حالت ہو یا تکلیف کی حالت ہو، دونوں حالتیں اضافی ہیں۔ دونوں حالتوں میں اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ اُس کے اندر کسی عورت یا مرد سے جو مطلوب رویہ درکار تھا اس کا ثبوت اُس نے دیا یا نہیں دیا۔ اصل اہمیت حالات کے مقابلہ میں ردعمل کی ہے، نہ کہ خود حالات کی۔ یہ حقیقت جس عورت اور مرد پر واضح ہوجائے اُس کا حال یہ ہوجائے گا کہ اُس کی نظر آرام اور تکلیف پر نہ ہوگی بلکہ اس بات پر ہوگی کہ ملے ہوئے حالات میں اس نے کس قسم کے ردعمل کا ثبوت دیا۔ شکر کا یا ناشکری کا، صبر کا یا بے صبری کا۔ ایسے لوگ ہر حال میں اپنا احتساب کریں گے، نہ کہ خارجی حالات کا شکوہ کرتے رہیں۔

اسلام

ارکان اسلام

عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بُنی الاسلامُ علی خمس۔ شھادۃِ اَن لا الٰہ الا اللہ و اَنّ محمداً عبدُہ و رسولُہ واقامِ الصلاۃ وایتاء الزکاۃ والحجّ وصوم رمضان (متفق علیہ)

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

اس حدیث کے مطابق، اسلام میں پانچ چیزیں ستون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح عمارت کچھ ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے، اسی طرح اسلامی زندگی پانچ بنیادی ارکان پر قائم ہوتی ہے۔ یہ پانچ ارکان دراصل پانچ اصول کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مومن وہ ہے جو اپنی زندگی کو ان پانچ اصولوں پر قائم کرے۔

کلمۂ شہادت کا مطلب خدا کی خدائی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا اعتراف ہے۔ اس کلمہ کے ذریعہ ایک آدمی خدا کا اس کے تمام صفات کمال کے ساتھ اقرار کرتا ہے۔ وہ محمد عربی کی اس حیثیت کا اقرار کرتا ہے کہ خدا نے ان کو تمام انسانوں کا ابدی رہنما بنایا۔ یہ حقیقت جس کے دل میں اتر جائے وہ اس کی پوری نفسیات میں شامل ہو جاتی ہے۔ ایسے آدمی کا سینہ ہر سچائی کے اعتراف کے لیے کھل جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جس کے لیے کوئی بھی چیز حق کے اعتراف میں رکاوٹ نہ بنے۔

نماز کی اصل تواضع ہے۔ جس آدمی کے اندر نماز کی حقیقت پیدا ہو جائے وہ گھمنڈ اور انانیت جیسی چیزوں سے یکسر خالی ہو جائے گا، اس کا رویہ ہر معاملہ میں تواضع کا رویہ بن جائے گا۔

زکاۃ کی حقیقت خدمت خلق ہے۔ جس آدمی کے اندر فی الواقع زکاۃ کی روح پیدا ہو جائے وہ تمام انسانوں کا خیر خواہ بن جائے گا، وہ ہر ایک کے لیے مفید بن کر زندگی گزارے گا۔

حج کی حقیقت اتحاد ہے۔ جو آدمی سچے جذبہ کے ساتھ حج کے مراسم ادا کرلے اس کے اندر اختلاف کا مزاج ختم ہو جائے گا۔ وہ اتحاد و اتفاق کے ساتھ لوگوں کے درمیان رہنے لگے گا۔

روزہ کی حقیقت صبر ہے۔ جو آدمی سچا روزہ دار ہو، وہ اسی کے ساتھ لازماً صبر دار بھی ہوگا۔ اس کے اندر یہ عمومی مزاج پیدا ہو جائے گا کہ وہ ناگواریوں کو برداشت کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان زندگی گزارے۔

نتیجہ نہ کہ ہدف

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز بظاہر صحیح ہوتی ہے مگر سیاق کے بدلنے سے وہ غلط ہو جاتی ہے مثلاً ایک چیز جو کسی عمل کا نتیجہ ہو اس کو آپ اپنے عمل کا ہدف بنالیں تو یہ غلط بھی ہوگا اور اپنے انجام کے اعتبار سے لاحاصل بھی۔

قرآن مجید کی سورہ ۹۴ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے تمہارا آوازہ بلند کیا (ورفعنالك ذكرك) اس سے مراد وہ غیر معمولی شہرت وعزت ہے جو پیغمبر اسلام کو دنیا میں حاصل ہوئی۔ آپ کا رفع ذکر ساری دنیا میں اتنا مسلم ہو چکا ہے کہ آج ایک غیر مسلم جب ساری تاریخ انسانی کے ایک سو بڑوں کی فہرست بناتا ہے تو اس میں وہ آپ کا نام سب سے پہلے درج کرتا ہے۔

مگر اپنا آوازہ بلند کرنا آپ کا ہدف نہیں تھا بلکہ آپ کے اصل مشن کا ایک نتیجہ تھا۔ اس سلسلے میں ایک حدیث یہاں نقل کی جاتی ہے:

قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم اتاني جبريل فقال ان ربّي وربك يقول كيف رفعت ذكرك. قال الله اعلم، قال اذا ذكرتُ ذكرتَ معي۔

(تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل میرے پاس آئے اور کہا کہ میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کیسے تمہارا نام بلند کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ جبریل نے کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ اس طرح کہ جب میرا نام لیا جائے تو تمہارا نام بھی لیا جائے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ آپ کا نام کیسے بلند ہوا یا کیسے بلند ہوگا۔ یہ جو کچھ ہوا یہ سراسر آپ کی کوشش اور آپ کی خواہش کے بغیر ہوا۔

اس مثال سے ہدف اور نتیجہ کا فرق سمجھ میں آتا ہے۔ دعوت آپ کا ہدف تھا اور رفع ذکر اس کا نتیجہ اب اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ وہ "رفع ذکر" کو ہدف (پیغمبر کا مشن) سمجھ لے اور اپنا نام بلند کرنے کی کوشش کرنے لگے تو یہ بالکل غلط ہوگا۔ یہ پیغمبر کی سنت کی خلاف ورزی ہوگی نہ کہ اس کی پیروی۔

یہی معاملہ دنیوی اقتدار کا ہے۔ اقتدار خدا کا ایک انعام ہے جو دعوتی عمل کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے کسی گروہ کو دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی گروہ ایسا کرے کہ دنیوی اقتدار کے حصول کو نبوت کا ہدف قرار دے کر ہنگامہ آرائی شروع کر دے تو یہ بھی سراسر غلط ہوگا۔ یہ اسی طرح نتیجہ کو ہدف کا مقام دینے کے ہم معنی ہوگا جس طرح وہ رفع ذکر کی مذکورہ بالا مثال میں نظر آتا ہے۔

اعتصام بحبل اللہ

قرآن (آل عمران ۱۰۳) میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ -----
اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور متفرق نہ ہو۔ اور اللہ کا یہ انعام اپنے اوپر یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ پس تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے (واعتصموا بحبل الله جميعا ولاتفرقوا واذكروا نعمة الله عليكم اذ كنتم اعداءً فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا)

اس آیت میں اللہ کی رسی سے مراد اللہ کی کتاب قرآن ہے۔ اور تفرق کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ اپنے اپنے ذاتی مفاد کو لے کر متفرق نہ ہو جاؤ اور اللہ کے دین میں سب بھائی بھائی بن کر رہو (**ويجوز ان يكون معنا ه ولاتفرقوا متابعين للهوى والاغراض المختلفة، وكونوا في دين الله اخوانا)تفسير القرطبي ۴/۱۵۹**)

زندگی کے دو طریقے ہیں------- متابعت قرآن، متابعت ھویٰ۔ جو لوگ سچے مومن ہوں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ قرآن کا اتباع کرنا چاہتے ہوں ان کی ساری توجہ خدائی احکام کی طرف لگ جائے گی۔ ان کا تقوی ان کے اندر یہ شدید جذبہ پیدا کرے گا کہ وہ بے لاگ طور پر خدا کی مرضی کو جانیں اور پوری طرح اس پر قائم ہو جائیں۔ اس کے برعکس جن لوگوں کی دلچسپی کا مرکز ان کی خواہشیں اور ان کے اغراض ہوں وہ کبھی یکساں ذہن کے تحت نہیں سوچ سکتے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی خواہش اور اپنے مفاد کی طرف دوڑے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان میں سے ہر ایک کی راہ دوسرے سے الگ ہو جائے گی۔

جو لوگ سچائی کے ساتھ خدا کی کتاب کو اپنا رہنما بنائیں ان کے اندر لازمی طور پر

اتحاد ہوگا۔ اور جن لوگوں کی خواہشیں ان کی رہنما بن جائیں وہ لازمی طور پر متفرق اور مختلف ہو جائیں گے، وہ کبھی متحد گروہ نہیں بن سکتے۔

کتاب اللہ کو رہنمابنانے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ برتر سچائی لوگوں کی توجہ کامرکز ہوتی ہے۔ یہ برتر سچائی چونکہ ایک ہے اس لئے تمام لوگوں کی توجہ صرف ایک نقطہ پر لگ جاتی ہے۔ اس فکری اتحاد کا نتیجہ عملی اتحاد کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس کے برعکس جب لوگوں کی توجہ کا مرکز ان کی اپنی خواہش بن جائے تو ہر ایک کی خواہش چونکہ الگ الگ ہوتی ہے اس لئے لوگوں کے نشانے بھی الگ الگ ہو جائیں گے۔ اسی کے نتیجہ کا دوسرا نام اختلاف وافتراق ہے۔

آیت میں "جمیعاً" کا لفظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ قرآن کی مخلصانہ پیروی کا ذہن اتحاد کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں پوری جماعت متحد العمل بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس اہواء اور اغراض عین اپنی نوعیت کے اعتبار سے تفرق کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ افکار و اعمال کے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ عام حالات میں یہ شکایت پیدا ہو کر بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اپنی اپنی شکایتوں کی بنا پر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تفرق کی صورت میں نکلتا ہے۔

مگر جن لوگوں کو ایمانی شعور حاصل ہو جائے وہ انسانی شکایتوں سے اوپر اٹھ کر خدا میں جینے لگتے ہیں۔ شکایتیں ان کے اتحاد میں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ وہ شکایتوں کے باوجود اس طرح ہو جاتے ہیں جیسے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہوں۔

مغربی تہذیب اور اسلام

صحیح البخاری میں روایت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ان اللہ لیؤید ھذا الدین برجل فاجر (اللہ اس دین کی مدد فاجر wicked شخص سے بھی کرے گا) یہ حدیث آرٹ آف تھنکنگ کے اعتبار سے بیحد اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) کی غلطی کو بتاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان صرف دو کیٹگری —— صالح اور فاجر میں تقسیم نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کی ایک تیسری قسم بھی ہے، اور وہ مؤید (supporter) کی ہے۔ یعنی ایک انسان بظاہر صالح نہیں ہے، بظاہر وہ فاجر دکھائی دیتا ہے۔ تب بھی یقینی طور پر اس کے اندر ایک تیسری صفت ہوسکتی ہے، اور وہ یہ کہ وہ کسی اعتبار سے ہمارے لیے تائید (support) کا ذریعہ بن جائے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں حدیبیہ اسی غیر ثنائی طرز فکر کی ایک عملی مثال ہے۔ ظاہری حالات کے اعتبار سے حدیبیہ کا فریق مقابل اسلام دوست نہ تھا، اس لیے لوگوں نے اپنے ثنائی ذہن کے مطابق یہ سمجھ لیا کہ وہ اسلام دشمن ہے۔ مگر پیغمبر اسلام اپنی ربانی فراست (وزڈم) کی بنا پر اس dichotomy کا شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے دریافت کرلیا کہ یہاں ایک تیسری صورت بھی موجود ہے۔ اور وہ خود فریق مخالف میں دعوت کے چھپے ہوئے امکانات ہیں۔ چنانچہ آپ نے فریق ثانی سے امن کا معاہدہ کرکے دعوت کے امکانات کو کھول دیا۔ اس کے بعد موافق ماحول میں دعوت کے امکانات استعمال ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سال میں اسلام کی تاریخ بدل گئی۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب کا معاملہ بھی عین یہی ہے۔ آج دوبارہ مسلمان اس معاملہ میں اسی قسم کی dichotomy کا شکار ہورہے ہیں۔ چوں کہ بظاہر مغربی تہذیب انھیں اسلام دوست دکھائی نہیں دیتی اس لیے ثنائی طرز فکر کی بنا پر وہ سمجھ لیتے ہیں کہ مغربی تہذیب اسلام کی دشمن ہے۔ حتیٰ کہ کچھ انتہا پسند (extremists) اس کو دجال بتا رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس dichotomy سے باہر آجائیں تو معلوم ہوگا کہ مغربی تہذیب اگر اسلام دوست نہیں تو وہ اسلام دشمن بھی نہیں۔ بلکہ حدیث کی زبان میں وہ اسلام کی معاون (supporter) ہے۔

آج دوبارہ اسی مومنانہ فراست (divine wisdom) کی ضرورت ہے جو حدیبیہ کے موقع پر اختیار کی گئی۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو دوبارہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔ ناموافق صورت حال میں موافق حالات برآمد ہو جائیں گے اور ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ان چھپے ہوئے موافق امکانات کو استعمال کر کے اسلام کی نئی تاریخ بنا سکیں۔

مغربی تہذیب کے علم بردار اپنے سیاسی اور اقتصادی انٹرسٹ کے تحت بہت سی ایسی کارروائیاں کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک ہمارے ملّی انٹرسٹ کے خلاف ہوتی ہیں۔ بطور واقعہ میں اس بات کو درست مانتا ہوں۔ مگر اس کا تعلق حقیقتاً اسلام دشمنی سے نہیں ہے۔ یہ تمام تر کامپٹیشن کا معاملہ ہے۔ یہ دنیا کامپٹیشن کے اصول پر بنائی گئی ہے، اس لیے اس قسم کے واقعات یہاں ہمیشہ جاری رہتے ہیں اور جاری رہیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ان کو فطرت کا تقاضا قرار دیتے ہوئے اپنی ساری توجہ اُن امکانات کی تلاش اور ان کو استعمال کرنے میں لگا دیں جو بظاہر مخالف حالات کے باوجود ہمارے لیے یہاں پوری طرح موجود ہیں۔

دجال کی حدیث بذاتِ خود صحیح ہے۔ مگر جہاں تک جدید مغربی تہذیب کا تعلق ہے وہ یقینی طور پر حدیث دجال کے تحت نہیں آتی۔ مغربی تہذیب کا معاملہ زیادہ صحیح طور پر اُس دوسری حدیث سے تعلق رکھتا ہے جو ادخالُ الکلمہ کی نسبت سے بطور پیشین گوئی وارد ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب ادخال الکلمہ کی خدائی اسکیم کے لیے ایک معاون عامل (supporting factor) بن کر ابھری ہے۔ دجال والی حدیث سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔

مذکورہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ اسلام کا کلمہ ساری دنیا کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر کے اندر داخل ہو جائے گا۔ غور کیجئے تو موجودہ اسباب کی دنیا میں اس پیشین گوئی کو عملی طور پر واقعہ بنانے کے لیے بہت سے معاون ذرائع درکار تھے۔ یہ معاون ذرائع پچھلے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ یہ صرف جدید مغربی تہذیب ہے جس نے تاریخ میں پہلی بار ان تمام وسائل و ذرائع کو مکمل طور پر مہیا کر دیا ہے جو ادخال الکلمہ کے عمل کی تکمیل کے لیے ضروری تھے۔

اس طرح حدیث کے الفاظ میں، مغربی تہذیب کا کیس نہ دوست کا کیس ہے اور نہ دشمن کا کیس، بلکہ اس کا کیس تیسرا ہے، اور وہ مؤید (سپورٹر) کا کیس ہے۔ اس معاملہ کی عملی وضاحت کے

سیلے اس نوعیت کی کچھ تائیدی چیزیں مختصر طور پر بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ ادخالُ الکلمہ کے لیے سب سے پہلی ضروری چیز جو درکار تھی وہ کمیونی کیشن کے عالمی ذرائع ہیں۔ اور یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ مغرب کا لایا ہوا تہذیبی انقلاب انسانی تاریخ کا وہ پہلا واقعہ ہے جس نے اس قسم کے عالمی کمیونی کیشن کو ہماری دسترس میں دے دیا جو اس عمل کی تکمیل کے لیے ناگزیر طور پر درکار تھا۔

۲۔ دوسری لازمی ضرورت کھلی مذہبی آزادی تھی۔ اگر مذہبی آزادی نہ ہو تو مطلوب نوعیت کی کامیاب عالمی پیغام رسانی ممکن نہیں۔ یہ بھی مغربی تہذیب ہی کی دین ہے کہ اس نے ایک ایسا دور پیدا کیا جہاں تاریخ میں پہلی بار مذہبی آزادی کو انسان کے مقدس حق کے طور پر مان لیا گیا۔

۳۔ ادخالُ الکلمہ کی اسکیم کو عالمی سطح پر مکمل کرنے کے لیے بے پناہ دولت درکار تھی۔ یہ چیز بھی مغربی تہذیب ہی کے ذریعہ بالواسطہ طور پر مسلم ملکوں کو حاصل ہوئی ہے۔ یہ مغربی تہذیب ہی کے حاملین تھے جنھوں نے مسلم ملکوں میں پٹرول کی دولت دریافت کی۔ پھر یہی لوگ ہیں جنھوں نے جدید مشینی دور پیدا کر کے اس پٹرول کو قیمتی (commodity) کی حیثیت دے دی۔ اس طرح سے حاصل شدہ دولت نے مسلمانوں کو آج اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ ادخالُ الکلمہ کی عالمی مہم کی بڑی سے بڑی قیمت دے کر اسے جاری رکھ سکیں۔

۴۔ مغربی تہذیب کے ذریعہ حاصل شدہ تائیدوں میں سے ایک تائید یہ ہے کہ اس نے پہلی بار فری انکوائری کے اصول کو کامیابی کے ساتھ مقدس کتابوں تک وسیع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری تمام مذہبی کتابیں غیر تاریخی ثابت ہو گئیں۔ اب استثنائی طور پر صرف قرآن ایک تاریخی طور پر ثابت شدہ کتاب کی حیثیت سے باقی رہا۔ اس طرح مغربی تہذیب کے پیدا کردہ علمی انقلاب نے اسلام کو مناپلی کے درجہ میں مذہب کا واحد قابل اعتبار نمائندہ بنا دیا۔

۵۔ پھر یہ مغربی تہذیب ہی ہے جس نے فطرت کے چھپے ہوئے رازوں کو دریافت کیا جو کہ قرآن کی سچائی کی تصدیق کرنے والے تھے۔ اس طرح مغربی تہذیب ہی کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے قرآن کی اس آیت کی سائنسی تفسیر لکھی کہ —— ہم انھیں آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ یہ حق ہے (41:53)

مغربی تہذیب کے حاملین کے ذریعہ عالم فطرت کے بے شمار نئے حقائق سامنے آئے ہیں جو کہ اسلام کی صداقت کو خالص علمی بنیادوں پر درست ثابت کر رہے ہیں۔

مذکورہ اسباب کی بنا پر میری قطعی رائے ہے کہ مغربی تہذیب دجال کا ظہور نہیں، اپنے امکانات کے اعتبار سے وہ اسلام کے حق میں تائید الٰہی کا ظہور ہے۔ اس نے وہ تمام اسباب پیدا کر دیے ہیں جو ادخال الکلمہ کی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان امکانات کو استعمال کرتے ہوئے یہ کام بخوبی طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔

یہ پراسس بالفعل شروع ہو چکا ہے۔ آج ہر دن ہزاروں لوگ اسلام کو دین فطرت پا کر اس کو قبول کر رہے ہیں۔ حدیبیہ کا معاملہ طے ہونے کے بعد قرآن کی سورہ الفتح اتری تھی اس میں کہا گیا کہ:

that it may be a sign for the believers, and that He may guide you to a straight path. (48:20)

دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ معاملہ اس لیے ہوا تا کہ تم کو ایک علامتی واقعہ کی صورت میں بتایا جائے کہ اس طرح کے معاملات میں تم dichotomy میں گرفتار نہ ہو بلکہ تیسرا راستہ تلاش کرو۔ یہ حدیبیہ پرنسپل ہے اور مغربی تہذیب کے معاملہ میں ہمیں اسی حدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنا ہے۔ اس کے بعد خدا کی یہ بشارت ہمارے اوپر صادق آئے گی کہ ہم نے تم کو کھلی فتح دے دی (48:1)

غسل اسلام میں

اسلام میں قلب و روح کی پاکی کے ساتھ جسم کی پاکی پر بھی بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پاکیزگی آدھا ایمان ہے (الطہور نصف الایمان) نماز اسلام کی اہم ترین عبادت ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ کوئی نماز جسمانی پاکی کے بغیر قبول نہیں کرتا (لا یقبل اللہ صلاۃً بغیر طہور) ہر نماز کے ساتھ وضو کو لازم قرار دیا گیا جو گویا کہ آدھا غسل ہے۔

جہاں تک مکمل جسمانی غسل کا تعلق ہے تو حدیث کی کتابوں میں طہارت کے ابواب پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب عام طور پر روزانہ غسل کرتے تھے۔ اس زمانہ میں فجر سے پہلے غسل کا عام رواج تھا۔ اس واقعہ کو حدیث کے کسی بھی مجموعہ میں کتاب الطہارۃ کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔

مسند احمد کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ ہر دن ایک بار غسل کرتے تھے (کان عثمان یغتسل کل یوم مرّۃً) ہر روز صبح کو غسل کرنا انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔ یہ فطری تقاضا یقینی طور پر اسلام میں بھی شامل ہے جو کہ حقیقی معنوں میں فطرت کا دین ہے۔

اس معاملہ میں بعض لوگوں کو ایک روایت سے اشتباہ پیش آیا ہے۔ صحیح البخاری میں روایت ہے۔ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں کہ جمعہ کے دن لوگ دور دور سے چل کر مدینہ آتے تھے۔ چنانچہ وہ غبار آلود ہوتے تھے اور ان کے جسم سے پسینہ نکل رہا ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر ان کے ایک آدمی سے کہا: لو انکم تطہّرتم لیومکم ھذا (فتح الباری ۲/۴۴۷) یعنی کاش تم اپنے آج کے دن اپنے آپ کو پاک کر لیتے۔

اس حدیث کا کوئی تعلق روزانہ غسل یا ہفتہ وار غسل سے نہیں ہے۔ اس کا مطلب سادہ طور پر صرف یہ ہے کہ آج تم بہت سے لوگوں کے درمیان بیٹھو گے۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو گے۔ ایسے اجتماعی موقع کا تمہیں لحاظ کرنا چاہیے اور نہائے بغیر اس میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ یہ موقع کے اعتبار سے غسل کی خصوصی اہمیت کا بیان ہے نہ کہ غسل کے وقت اور میعاد کا تعین۔

دین فطرت

خورشید بسمل صاحب (پیدائش ۱۹۴۷) سے ۲۲ جون ۱۹۹۱ کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ وہ جموّں کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے کئی سبق آموز واقعات بتائے۔

انھوں نے بتایا کہ ضلع راجوری میں ایک مقام کالاکوٹ ہے۔ یہاں ایک صاحب راجہ رام شرما ہیں۔ اِس وقت وہ محکمۂ تعلیم میں ڈسٹرکٹ پلاننگ افسر ہیں۔ ان کے پاس ایک آدمی ان کی گائے خریدنے کے لیے آیا۔ انھوں نے کہا کہ میرے پاس گائے تو ہے، مگر اس کو حال میں باولے کتّے نے کاٹ لیا ہے۔ اگر آپ یہ جاننے کے بعد بھی خریدنا چاہیں تو آپ اس کو خرید سکتے ہیں۔

کچھ دنوں بعد پاکستان ٹی وی دیکھتے ہوئے شرما صاحب نے ایک حدیث کا مضمون سنا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ مسلمان وہ ہے جو تجارت کے وقت اپنے سودے کی خرابی سے گاہک کو آگاہ کردے۔ شرما صاحب کو یہ پروگرام سن کر اپنا گائے کا واقعہ یاد آیا۔ انھوں نے کہا: اس لحاظ سے تو میں بھی مسلمان ہوں۔ یہ حدیث سنن ابن ماجہ میں ہے۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

عَن وَاثِلَةَ بْنِ الاسْقَع، قال سَمِعتُ رسولَ الله صَلّى اللهُ عَليهِ وَسَلّم يقولُ: مَن باعَ عيبًا لَمْ يُنَبِّه لَمْ يَزَلْ فى مقتِ اللهِ اَوْلَمْ تَزَلِ المَلائِكَةُ تَلْعَنُه۔

(مشكاة المصابيح ۲/ ۸۶۹)

واثلہ بن اسقع کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس آدمی نے عیب دار چیز بیچی اور خریدار کو اس کے عیب سے آگاہ نہیں کیا تو وہ برابر اللہ کی ناراضگی میں رہتا ہے، یا فرشتے برابر اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کوئی اجنبی چیز نہیں۔ اسلام دین فطرت ہے۔ ہر آدمی جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے، اسی کو اسلام الفاظ کی صورت دیدیتا ہے۔ اگر باہمی نفرت اور قومی جھگڑوں کی فضا ختم کر دی جائے اور اسلام کی نمائندگی کرنے کے لیے صرف قرآن اور حدیث لوگوں کے سامنے ہو تو بے شمار آدمی اسلام کو عین اپنے دل کی آواز سمجھیں گے اور اس کو اس طرح اپنا لیں گے جیسے کہ وہ خود ان کی اپنی چیز تھی جو کچھ عرصہ گم رہنے کے بعد دوبارہ انھیں واپس مل گئی۔

دین فطرت اپنے آپ میں ایک طاقت ہے، اس کو کسی مزید طاقت کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ حدیث کوئی ایک حدیث نہیں۔قرآن اور حدیث کی تمام تعلیمات کا معاملہ یہی ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تمام تعلیمات فطرت پر مبنی ہیں۔ جو فطرت ہے وہی اسلام ہے اور جو اسلام ہے وہی فطرت ہے۔ دونوں کے درمیان یہ تعلق ایسا ہے جو کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔اسی حقیقت کو قرآن میں اس طرح بتایا گیا ہے، پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو، اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔اس کے بنائے ہوئے کو بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے۔(الروم ۳۰)

عبادات

وضو کی برکت

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے وضو کیا۔ پھر بہتر طریقہ پر وضو کیا، اس سے اس کی خطائیں جاتی رہتی ہیں۔ حتی کہ ناخن کے نیچے کی بھی (من توضّأ فاحسن الوضوءَ خرجت خطایاہُ حتی تخرج من تحتِ اظفارہ، رواہ مسلم)

بہتر وضو سے کیا مراد ہے، اس کی وضاحت دوسری روایتوں سے ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص بھی وضو کرے، پھر وہ اس کو پوری طرح کرے۔ اس کے بعد وہ کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، وہ جس دروازہ سے چاہے داخل ہوجائے (مامنکم من احدٍ یتوضّأ فیبلغ الوضوء ثم قال: اشھدُ ان لّا الٰہ الّا اللّٰہُ وحدہ لاشریک لہ واشھدُ انّ محمداً عبدُہ ورسولُہ الا فُتحت لہ ابواب الجنۃ الثمانیۃ یدخلُ من ایّھا شاء، رواہ مسلم)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ کوئی شخص جب وضو کرے تو اس کے بعد یہ دعا پڑھے کہ خدایا مجھ کو توبہ کرنے والوں میں سے بنا، اور مجھ کو پاک صاف لوگوں میں سے بنا (اللّٰھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین، الترمذی) ایک اور روایت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اس کے بعد آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ خدایا، مجھے خطاؤں سے پاک کردے جس طرح سفید کپڑا دھوکر میل سے پاک کردیا جاتا ہے (اللّٰھم نقّنی من الخطایا کما ینقّی الثوب الابیضُ من الدنس)

مختلف روایتوں میں یہ بات مختلف انداز سے بتائی گئی ہے کہ وضو سے آدمی کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ وضو اس کے گناہوں کے میل کو دھوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے

دیرپا عمل

ایک روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح البخاری (کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل) کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ان احب الاعمال الی الله ادومها و إن قلّ (اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جو دیرپا ہو، اگر چہ وہ کم ہو) فتح الباری ۱۱/۳۰۰

اس قول رسول کا ایک تعلق عبادات سے ہے۔ مثلاً نفل نماز یا نفل روزہ میں آدمی کو ایسی مقدار کو اپنا معمول بنانا چاہئے جس کو وہ ہمیشہ جاری رکھ سکتا ہو۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ تھوڑے دن تو بہت زیادہ نوافل کا اہتمام کرے اور اس کے بعد وہ کم پر بھی قائم نہ رہے۔

یہ ایک مستقل اصول حیات ہے۔ اور اس کا تعلق زندگی کے ہر پہلو سے ہے، دوسرے لفظوں میں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام بھی شروع کرو اس کو ایسی صورت میں شروع کرو جو برابر جاری رہنے والی (sustainable) ہو۔ یہ منصوبہ بند عمل کا اہم ترین اصول ہے۔ اس دنیا میں ہر بڑا نتیجہ منصوبہ بند عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اور نتیجہ خیز منصوبہ وہی ہے جو شروع کرنے کے بعد دیر تک جاری رہ سکے۔

اس دنیا میں کسی عمل کا نتیجہ ہمیشہ دیر میں نکلتا ہے۔ تھوڑے وقت میں کوئی بڑا نتیجہ پالینا موجودہ دنیا کے نظام میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔ ایسی حالت میں نتیجہ خیز عمل وہی ہوسکتا ہے جو دیرپا عمل ہو۔ جو عمل دیر تک جاری نہ رہے اس کے متعلق پیشگی طور پر جان لینا چاہئے کہ وہ اس دنیا میں بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گا۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ جو کام شروع کرے اس کو مستقل مزاجی کے ساتھ مسلسل جاری رکھے۔ اور جس عمل کو مسلسل جاری رکھنا اس کے لئے ممکن نہ ہو اس کو وہ شروع ہی نہ کرے۔ کیوں کہ ایسے آغاز کا کوئی انجام اس دنیا میں ہرگز نکلنے والا نہیں۔

نماز

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اور کفر کے درمیان ترک صلاۃ ہے۔ (بین الرجل والکفر ترك الصلاۃ) حضرت عمر نے فرمایا کہ نماز دین کا کھمبا ہے۔ (الصلاۃ عماد الدین) نماز "اللہ اکبر" کے قول سے شروع ہوتی ہے اور "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کے قول پر ختم ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: تحریمها التکبیر وتحلیلها التسلیم۔

نماز کی ابتدائی تیاری وضو سے شروع ہوتی ہے۔ وضو کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے کہ اس شخص کی نماز نہیں جس کا وضو نہ ہو اور اس کا وضو نہیں جس نے اس پر اللہ کے نام کو یاد نہ کیا (لا صلاۃ لمن لا وضوء له ولا وضوء لمن لم یذکر اسم الله علیه) وضو حقیقۃً ایک قسم کی عملی دعا ہے۔ آدمی اپنے جسم کے کچھ نمائندہ حصوں کو دھو کر اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہے کہ اسی طرح تو اپنی رحمت کے پانی سے میرے پورے وجود کو پاک کر دے، تو میرا تزکیہ کرکے مجھے جنت میں داخل کر دے۔

مؤذن جب اذان کے کلمات کہتا ہے تو اس کے بارہ میں حکم ہے کہ تمام نمازی اس کو سن کر اسی طرح اپنی زبان سے دہرائیں۔ یہ دہرانا درحقیقت مؤذن کی پکار پر لبیک کہنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اس دینی عمل کے لیے پوری طرح تیار ہے جس کی طرف اس کو بلایا گیا ہے۔

اس کے بعد آدمی اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) کہہ کر نماز میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہ اس حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے کہ اس دنیا میں بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہے۔ پھر آدمی ادب سے کھڑا ہوتا ہے، وہ جھکتا ہے اور زمین پر اپنا سر رکھ دیتا ہے۔ یہ اس بات کا عملی اقرار ہے کہ خدا بڑا ہے، میں چھوٹا ہوں۔ میں آخری حد تک اس کی اطاعت کرنے کے لیے تیار ہوں۔

آخر میں نمازی اپنے دائیں اور بائیں چہرہ پھیر کر کہتا ہے کہ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ اس طرح گویا وہ زمین پر بسنے والے تمام لوگوں کے لیے سلامتی اور خیر خواہی کے جذبہ کا اظہار کرتا ہے۔ خدا کو گواہ بنا کر وہ عہد کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے گا کہ اس کی وجہ سے کسی کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، ہر ایک کی جان اور مال اور آبرو، ہر چیز اس سے محفوظ اور مامون رہے۔

نماز ذریعۂ علاج

كانَ فتىً من الانصار يصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم ولا يدع شيئا من الفواحش والسرقة الا ركبه. فذكر للنبي صلى الله عليه وسلم فقال: ان الصلاة ستنهاه۔ فلم يلبث ان تاب وصلحت حاله۔ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الم اقل لكم

(الجامع لاحکام القرآن ۱۳/۳۴۸-۳۴۷)

انصار کا ایک نوجوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ فواحش اور سرقہ کا بھی ارتکاب کرتا تھا۔ اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ نماز عنقریب اس کو ان چیزوں سے روک دے گی۔ آخر کار اس نے توبہ کرلی اور اس کا حال درست ہوگیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔

نماز اگر واقعی شعور کے ساتھ پڑھی جائے تو وہ آدمی کے اندر حساسیت کو جگانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ جب آدمی کے اندر دینی حساسیت جاگ اٹھتی ہے تو اس کے بعد وہ اپنے آپ اصلاح کے راستہ کو اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے بعد نماز اس کے لیے صرف ایک روایتی عمل نہیں رہتی، بلکہ وہ اس کے اوپر نگراں بن جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ان الصلاة تنهىٰ عن الفحشاء والمنكر (نماز آدمی کو فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے)

مذکورہ نوجوان پہلے بے شعوری کی نماز پڑھتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا ذہن بدلا۔ وہ چونکہ عربی جانتا تھا، اس لیے قرآن کی قرأت اور نماز کی دوسری دعائیں اور اذکار اس کے ذہن پر اثر ڈالتے رہے۔ مسجد میں اہلِ ایمان سے ملاقات اور گفتگو اس کو نئی سوچ کی طرف بڑھاتی رہی۔ اس طرح کی مختلف چیزیں مسلسل اس کے اوپر اثر انداز ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ بے روح نمازی سے اوپر اٹھ کر وہ سچا نمازی بن گیا۔

ہر شکل کے ساتھ ایک اسپرٹ ہوتی ہے۔ کوئی آدمی اگر شکل کو پوری طرح اختیار کرلے تو اسپرٹ بھی دھیرے دھیرے اس کے اندر پیدا ہوجائے گی۔

مسجد اور نماز

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری امت پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ مسجدوں پر فخر کریں گے مگر اس کو (ذکر و نماز سے) بہت کم آباد کریں گے (یأتی علی امتی زمان یتباھون بالمساجد ثم لا یعمرونھا الاّ قلیلا) فتح الباری ۱/۶۴۲

حضرت انسؓ سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ لوگ مسجدوں پر فخر کرنے لگیں (لا تقوم الساعة حتی یتباھی الناس فی المساجد) سنن ابی داؤد ۱/۱۲۰

اس طرح کی روایتیں دراصل دورِ زوال کے مظاہر کو بتاتی ہیں۔ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ روح ختم ہو جاتی ہے، اور ظاہری چیزوں کی دھوم بڑھ جاتی ہے۔ ایسے زمانہ میں لوگ مسجدوں کی کثرت کا پُرجوش طور پر چرچا کرتے ہیں۔ وہ مسجد کی شاندار تعمیرات پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اپنی قومی عظمت کو مساجد کے در و دیوار میں نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے زمانہ میں لوگ صرف ظاہر کو جانتے ہیں، اس لیے ان کے پاس عمارتی عظمت کے سوا کوئی اور عظمت نہیں ہوتی جس میں وہ اپنے کو برتر محسوس کر سکیں۔

مگر جب لوگوں میں دین کی روح زندہ ہو تو ان کی نظر میں در و دیوار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ معمولی طور پر بنی ہوئی مسجدوں میں نماز پڑھ کر ان کو اور زیادہ سکون ملتا ہے۔ ان کو ایسی مسجدیں پسند آتی ہیں جہاں روشنیوں کا انتظام نہ ہو، کیوں کہ وہاں توجہ الی اللہ میں ان کے لیے کوئی چیز حارج نہیں ہوتی۔ نرم قالینوں پر سجدہ کرنے کے بجائے انھیں مٹی کے فرش پر اپنی پیشانی رکھنا زیادہ محبوب ہوتا ہے، کیوں کہ یہ ان کے عاجزانہ سجدہ کے زیادہ حسب حال ہوتا ہے۔

در و دیوار کی عظمتیں ان لوگوں کے لیے خلل اندازی کا باعث ہونے لگتی ہیں جو اللہ کی عظمت و کبریائی میں کچھ لمحات گزارنے کے لیے مسجد میں آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے اور ان کے رب کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو، اس لیے وہ سادہ مسجدوں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں نہ کہ چمک دمک والی مسجدوں کو۔

نماز باجماعت

عن عبد اللہ بن عمر اَنَّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: صلاۃ الجماعۃ تفضُلُ صلاۃَ الفذِّ بسبع وعشرین درجۃً

حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جماعت کے ساتھ نماز تنہا نماز کے مقابلہ میں ۲۷ درجہ افضل ہے۔

(موطا الامام مالک ۹۳)

نماز کی مطلوب کیفیات جماعت کی نماز میں بڑھ جاتی ہیں۔ اس لئے اس کا ثواب بھی اللہ کے یہاں تنہا نماز کے مقابلہ میں زیادہ ہو جاتا ہے۔

جماعت کی نماز کے لئے آدمی کو پہلے سے سوچنا پڑتا ہے کہ اب وقت آگیا ہے۔ اب مجھ کو مسجد چلنا چاہئے۔ اس طرح نمازی کا ذہن پیشگی طور پر عبادت کی سوچ میں لگ جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے گھر سے نکل کر مسجد کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ ہر قدم اس کو یاد دلاتا ہے کہ تم خدا کی عبادت کے لئے جارہے ہو۔ اس طرح گویا وہ نماز سے پہلے نماز میں مشغول ہو جاتا ہے۔

مسجد میں اس کو نماز کا پورا ماحول ملتا ہے۔ یہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ میں اکیلا نمازی نہیں ہوں۔ بلکہ میں ایک وسیع نمازی برادری میں شامل ہوں۔ پہلے اس کی حیثیت اگر صرف نماز پڑھنے والے کی تھی تو اب اس کی حیثیت نماز قائم کرنے والے کی بن جاتی ہے۔

پھر جماعت کی نماز خود اپنے اندر عظیم ثواب رکھتی ہے۔ اکیلے کی نماز میں گویا کہ وہ اپنا امام آپ تھا۔ یہاں اس نے دوسرے کی امامت میں نماز ادا کر کے مزید تواضع اور خشوع کا ثبوت دیا۔ اکیلے کی نماز میں اس نے اپنے انفرادی اسلام کا احساس تازہ کیا تھا۔ جماعت کی نماز میں اس نے دوسرے ہم مذہبوں کے ساتھ اجتماعی اسلام کا زندہ تجربہ کیا۔ اکیلے کی نماز میں اس نے ایک فرد کی سطح پر فیضان خداوندی کو پایا تھا، جماعت کی نماز میں وہ پورے مجموعہ پر اترنے والے فیضان خداوندی میں شریک ہو گیا۔

اسی کے ساتھ جماعت کی نماز کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آدمی مسجد کے مقدس ماحول میں اپنے دوسرے بھائیوں سے جڑ جاتا ہے۔ وہ ان سے سیکھتا بھی ہے اور ان کو سکھاتا بھی ہے۔ وہ ان سے پاتا بھی ہے اور انھیں دیتا بھی ہے۔ اکیلے کی نماز میں اس نے اگر صرف نماز ادا کی تھی تو جماعت کی نماز میں وہ پورے اسلام کو ادا کرنے والا بن جاتا ہے۔

برائی کے خلاف روک

قرآن میں ہدایت دی گئی ہے کہ نماز قائم کرو، بے شک نماز فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے (اقم الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر) ابن ابی حاتم نے حضرت عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

من لم تنھہ صلوٰتہ عن الفحشاء والمنکر فلا صلوٰۃ لہٗ — جس کی نماز اس کو فحشاء اور منکر سے نہ روکے تو اس کی نماز نماز نہیں۔

نماز کیا ہے، نماز اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ آدمی ایک ایسے خدا کے سامنے زندگی گزار رہا ہے جس کو آدمی اگرچہ نہیں دیکھتا، مگر خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ جو آدمی مسجد سے یہ سبق لے کر لوٹے، کیا وہ باہر آکر خدا سے غافل زندگی گزار سکے گا۔ نماز میں آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ خدا سب سے بڑا ہے۔ جو آدمی اس اقرار میں سچا ہو کیسے ممکن ہے کہ نماز کے بعد وہ اپنی بڑائی کا جھنڈا اٹھانے میں مصروف ہو جائے۔ نماز میں آدمی جو کچھ پڑھتا ہے وہ خدا کے سامنے اس بات کا عہد ہوتا ہے کہ وہ خدائی احکام کا پابند بن کر زندگی بسر کرے گا۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ باہر نکل کر وہ لوگوں کے درمیان سرکش اور باغی کی طرح رہنے لگے۔ نماز کے افعال اس بات کا اظہار ہیں کہ آدمی کا سینہ خدا کے خوف و محبت سے سرشار ہے۔ پھر کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ آدمی مسجد میں تو خدا کے خوف و محبت سے سرشار ہونے کا دعویٰ کرے اور جب باہر نکلے تو اس طرح رہنے لگے جیسے کہ اس کے سینے میں نہ خدا کا خوف ہے اور نہ خدا کی محبت۔

نماز اگر حقیقی روح کے ساتھ پڑھی جائے تو یقیناً وہ فحشاء اور منکر سے روکنے والی بن جائے گی۔ لیکن اگر نماز حقیقی روح سے خالی ہو تو وہ محض ایک رسم ہوگی جس کا آدمی کی اصل زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ بظاہر نماز ہوگی مگر حقیقۃً وہ نماز نہ ہوگی۔ کیوں کہ وہ آدمی کو فحشاء اور منکر سے روکنے والی نہ بن سکی۔

یہ بات ایسی ہی ہے جیسے کہا جائے کہ ــــــ باپ کو کھڑا دیکھ کر بھی جو بیٹا لیٹا رہے اس کے اندر باپ کا ادب نہیں۔ بہن کو فاقہ میں دیکھ کر جس بھائی کی مٹھی نہ کھلے وہ بھائی بھائی نہیں۔ دوست کی موت کی خبر جس کا قہقہہ بند نہ کرے اس کی دوستی دوستی نہیں۔

سلف کنٹرول کی تربیت

روزہ کے لیے اصل عربی لفظ صوم ہے۔ صوم کے معنی ہیں رکنا (abstinence) روزہ میں چوں کہ آدمی کھانے پینے سے اور دوسری خواہشوں سے رک جاتا ہے، اس لیے اس کو صوم کا نام دیا گیا۔

اسلامی شریعت میں روزہ مسلسل ایک مہینہ تک کے لیے ہے۔ ہر سال قمری کیلنڈر کے اعتبار سے رمضان کے مہینہ میں یہ روزہ رکھا جاتا ہے۔ سال میں ایک مہینہ کا یہ روزہ ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو اس کو رکھنے کی طاقت رکھتا ہو۔

یہ روزہ رمضان کے مہینہ کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور مہینہ کی آخری تاریخ کو ختم ہوتا ہے۔ چونکہ اس کا انحصار چاند دیکھنے پر ہے، اس لیے وہ کبھی ۲۹ دن کا ہوتا ہے اور کبھی ۳۰ دن کا۔

صبح کو روزہ شروع کرنے سے پہلے جو کھانا کھایا جاتا ہے اس کو سحری کہتے ہیں۔ اس سحری کا وقت صبح صادق (morning twilight) کے ظہور تک رہتا ہے۔ روزہ توڑنے کے لیے جو کھانا کھایا جاتا ہے اس کو افطار کہتے ہیں۔ اس کا وقت سورج ڈوبنے کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے۔ روزہ دار پر کھانے پینے وغیرہ کی جو پابندی ہے وہ صرف دن کے لیے ہے۔ رات کے وقت کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔

شام کو روزہ توڑتے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے: خدایا، میں نے تیرے حکم سے روزہ رکھا اور تیری اجازت سے میں نے افطار کیا۔ یہ دعا روزہ کی روح کو بتاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کی مرضی کا پابند بنائے۔ یہ پابندی پوری زندگی میں مطلوب ہے۔ رمضان کے مہینہ کا روزہ اسی پابند زندگی کی ایک سالانہ علامتی مشق ہے۔

اسلام کے مطابق، موجودہ دنیا میں انسان کو امتحان (Test) کے لیے رکھا گیا ہے۔ اس کو جو آزادی ملی ہے وہ اسی لیے ہے کہ وہ اس کو خود اپنی مرضی سے خدا کے حکموں کی پابندی میں استعمال کرے۔ آزادی کے اس پابند استعمال کے لیے آدمی کو اپنی خواہشوں پر روک لگانا پڑتا ہے۔ اس کے لیے سلف کنٹرول کی استعداد درکار ہے۔ روزہ اسی سلف کنٹرول کی سالانہ تربیت ہے۔

سلف کنٹرول والی زندگی کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔ روزہ یہی صبر کی صفت آدمی کے اندر پیدا کرتا ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں روزہ کو صبر کا مہینہ (شھر الصبر) کہا گیا ہے۔ دنیا میں اسلامی طرز کی زندگی گزارنے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی اہمیت ہے وہ صبر ہے۔ اسی لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والوں کو خدا کے یہاں بے حساب اجر دیا جائے گا (39.10)

بے حساب اجر کی یہی خوش خبری حدیث میں روزہ کے لیے بھی بتائی گئی ہے۔ ابوھریرہؓ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے نیک اعمال کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دیا جاتا ہے۔ مگر روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا (بے حساب) بدلہ دوں گا (بخاری ومسلم)

بے حساب بدلہ کا استحقاق اصلاً صبر کے لیے ہے۔ صبر اسلام میں سب سے بڑی نیکی اور سب سے زیادہ قابل قدر صفت ہے۔ روزہ آدمی کو اسی صابرانہ زندگی کے لیے تیار کرتا ہے، اسی لیے روزہ پر بھی بے حساب انعام رکھ دیا گیا۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی شخص کے روزہ کا دن ہو تو وہ نہ کسی کو گالی دے اور نہ کسی سے جھگڑا کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرے تو وہ اس سے کہہ دے کہ "میں ایک روزہ دار آدمی ہوں"۔

یہی وہ چیز ہے جس کو صبر یا پابندی کہا گیا ہے۔ یعنی اشتعال کا موقع پیش آئے تو اس پر مشتعل نہ ہونا۔ دوسروں کے منفی رویہ کے باوجود اپنے آپ کو مثبت رویہ پر قائم رکھنا۔ کوئی شخص زیادتی کرے تب بھی یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو جوابی زیادتی سے بچانا۔

روزہ ایک سالانہ تربیتی کورس ہے جو آدمی کو اسی ضبط نفس کے قابل بناتا ہے۔ جس آدمی کے اندر ضبط نفس آجائے اس کے اندر وہ طاقت آگئی جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو تھامے، جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو شریعت کی مقرر کی ہوئی اخلاقی حد پر باقی رکھے، اور صحیح اور مطلوب زندگی گزارے۔

روزہ میں کھانا اور پانی چھوڑنا علامتی طور پر غیر مطلوب چیزوں کو چھوڑنے کا سبق ہے۔ اسی لیے پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ جو آدمی جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور اپنا پینا چھوڑ دے۔

روزہ کی حقیقت

مسند احمد اور الترمذی میں یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے یہ پیشکش کی کہ وہ میرے لئے مکہ کی وادی کو سونا بنا دے۔ میں نے کہا کہ نہیں اے میرے رب، بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ پس جب میں بھوکا رہوں تو میں تجھ سے تضرع کروں اور تجھ کو یاد کروں اور جب میں شکم سیر ہوں تو میں تیری حمد کروں اور تیرا شکر کروں (**عرض علی ربی لیجعل لی بطحاء مکة ذهباً، فقلت : لا یا رب! ولکن أشبع یوماً و اجوع یوماً، فاذا جعت تضرعت الیك و ذکرتك، وإذا شبعتُ حمدتك وشکرتك) مشکاة المصابیح ۳/ ۴۳۳**

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ احوال کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہوتیں۔ بھوک آدمی کے اندر عجز کی کیفیت ابھارتی ہے اور اس کو خدا کی یاد کرنے والا بناتی ہے۔ اس کے بعد جب آدمی کو سیری حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کے اندر شکر کے جذبات کو بیدار کرتی ہے اور اس کو حمد خداوندی میں مشغول کر دیتی ہے۔

یہی روزہ کا اصل مقصد ہے۔ روزہ ایک سالانہ تربیتی کورس ہے جس کے ذریعہ آدمی کے اوپر بھوک کے احوال پیدا کئے جاتے ہیں، تا کہ اس کے اندر عجز اور تضرع اور انابت کی کیفیات ابھریں، وہ اللہ کو یاد کرنے والا بن جائے۔

روزہ میں دن کے وقت آدمی کو بھوک کا تجربہ کرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد رات کو اسے اس تجربہ سے گذارا جاتا ہے کہ وہ شکم سیر ہو کر کھائے اور پئے، تا کہ اس کے اندر شکر کے جذبات بیدار ہوں اور اس کا سینہ حمد خداوندی سے معمور ہو جائے۔

تضرع اور شکر دو انتہائی مطلوب دینی کیفیات ہیں۔ رمضان کے روزے کا مقصد یہ ہے کہ دن کی بھوک اور رات کی شکم سیری کے ذریعہ یہ دونوں مطلوب کیفیات آدمی کے اندر پیدا کی جائیں۔

روزہ کا فائدہ

جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو شیاطین کو باندھ دیا جاتا ہے اور خدا کی رحمت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں (سُلسِلَتِ الشیاطین و فُتحت ابوابُ الرحمة)
شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب امتوں میں سے کوئی امت روزہ کا التزام کرتی ہے تو اس کے شیطانوں کو بیڑیوں میں باندھ دیا جاتا ہے اور اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور آگ کے دروازے اس کے اوپر بند کر دیے جاتے ہیں (واذا التزمته امة من الامم سُلسلت شیاطینها وفتحت ابواب جنانها وغلقت ابواب النیران عنها) حجة اللہ البالغہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان انسانوں میں بھی ہوتے ہیں اور جنات میں بھی (الانعام ۱۱۲) حدیث کے مطابق، روزہ ان دونوں ہی قسم کے شیطانوں سے نجات دینے والا ہے۔ جو قوم حقیقی طور پر روزہ کے اوپر قائم ہو جائے وہ ان دونوں ہی قسم کے شیطانوں سے محفوظ ہو جائے گی۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قسم کے شیاطین کے لیے انسان کے اوپر قابو پانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ خود انسان کا اپنا نفس ہے، شیاطینِ جن لوگوں کے نفس کو خواہشوں کے فریب میں مبتلا کر کے ان کے اوپر قابو پاتے ہیں اور پھر جدھر چاہتے ہیں ان کو ادھر لے جاتے ہیں۔

شیاطینِ انس کے لیے بھی انسان کے اوپر قابو پانے کا راستہ یہی ہے، وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن سے انسان کا نفس بھڑک اٹھے۔ اور جب انسان کا نفس بھڑک اٹھتا ہے تو وہ اپنی عقل کھو دیتا ہے۔ اور پھر شیاطینِ انس کو موقع مل جاتا ہے کہ جس طرح چاہیں اس کو استعمال کریں۔

روزہ آدمی کے نفس کو زیر کرتا ہے۔ وہ آدمی کے حیوانی جذبات کو گھٹاتا ہے اور اس کے ملکوتی جذبات کو ابھارتا ہے۔ اس طرح آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ نفسیاتی خواہشوں کا شکار نہ ہو۔ وہ اشتعال انگیز باتوں پر بھڑک کر قابو سے باہر نہ ہو جائے۔ اس طرح روزہ شیاطینِ جن اور شیاطینِ انس دونوں کو گویا اس طرح زنجیروں میں باندھ دیتا ہے کہ وہ انسان کے اوپر اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

دو فرحتیں

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: للصائم فرحتان۔ یفرحھما۔ اذا افطر فرح واذا لقی ربہ فرح بصومہ۔ یعنی روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں جن سے وہ خوش ہوگا۔ جب وہ افطار کرتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور جب وہ اپنے رب سے ملے گا تو اپنے روزہ کے انعام پر خوش ہوگا (فتح الباری ۴/۱۴۱، صحیح مسلم بشرح النووی ۸/۳۱)

روزہ دار دن بھر بھوکا پیاسا رہتا ہے۔ اس کے بعد شام کو جب وہ افطار کرتا ہے اور کھانا اور پانی اس کے جسم میں داخل ہوتا ہے تو قدرتی طور پر اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ پھر موت کے بعد آخرت میں جب یہ روزہ دار اللہ سے ملے گا اور اللہ اس کی روزہ داری کے بدلے میں اس کو جنت میں داخل کرے گا تو اس وقت مزید اضافہ کے ساتھ اس کو کامل خوشی حاصل ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ روزہ دنیا کی زندگی کی علامت ہے اور افطار آخرت کی زندگی کی علامت۔ دنیا میں مومن کو ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا ہے اور قربانیوں کو برداشت کرنا ہے۔ لذتوں سے محروم ہو کر اس کو خدا کی اطاعت کرنا ہے۔ مگر آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا۔ وہاں اس کے لئے خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور وہاں اس کے لئے آرام ہی آرام۔ اس طرح روزہ علامتی طور پر مومن کی دنیا کا تعارف ہے، اور افطار علامتی طور پر مومن کی آخرت کا تعارف۔

دنیا کی زندگی، مومن کے لئے فاقہ کی زندگی ہے، اور آخرت کی زندگی، مومن کے لئے اکل و شرب کی زندگی۔ دنیا میں مومن کے لئے ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں، اور آخرت میں مومن کے لئے انعام ہی انعام۔

روزہ آدمی کو احساس دلاتا ہے کہ دنیا میں اسے قربانیوں کی حد تک جاکر اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اور افطار کی صورت میں اس کو یہ تجربہ کرایا جاتا ہے کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جبکہ اس کا خدا اس طرح کی قدردانی کرے گا کہ اس کو ابدی جنتوں میں داخل کر دے گا جہاں ہر قسم کی لامحدود خوشیاں اور لذتیں بھی ہوں گی، اور اسی کے ساتھ ان سے بہرہ اندوز ہونے کی مکمل آزادی بھی۔

ہمدردی کا مہینہ

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان کا مہینہ شہر المواساۃ ہے۔(مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۳) یعنی لوگوں کی مدد کرنے اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا مہینہ۔ یہ روزہ کا وہ پہلو ہے جس کو انسانی پہلو کہا جا سکتا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کے مہینہ میں بہت زیادہ صدقہ کرتے تھے۔ اس مہینہ میں کوئی بھی سوال کرنے والا آپ کے یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ روزہ کے مہینہ میں جو شخص کسی کو کھلائے تو وہ اس کے لئے مغفرت کا ذریعہ ہوگا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی روزہ دار کو کھلائے گا تو وہ بھی اس روزہ کے ثواب میں شریک ہو جائے گا (۶۲۱)

روزہ کے مہینہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آدمی بھوک پیاس کا ذاتی تجربہ کرتا ہے۔ یہ تجربہ امیر اور غریب دونوں کو یکساں طور پر ہوتا ہے۔ یہ تجربہ صرف ایک بار وقتی طور پر نہیں ہوتا بلکہ مسلسل ایک مہینہ تک ہر روز اس کو اس خصوصی کورس سے گزارا جاتا ہے۔

اس طرح روزہ ہر آدمی کو یہ تجربہ کراتا ہے کہ انسانی ضرورتیں کیا ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ پیاس کیا ہے اور بھوک کیا چیز ہے۔ جو لوگ عام حالات میں بھوک پیاس کو محسوس نہیں کر پاتے وہ بھی رمضان کے مہینہ میں ذاتی طور پر اس کا تجربہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح روزہ ہر آدمی کو ایک سطح پر پہنچا دیتا ہے۔ امیر آدمی بھی کچھ دیر کے لئے اسی حالت پر پہنچ جاتا ہے جس حالت پر ایک غریب آدمی جی رہا تھا۔

اس طرح ہر آدمی کی انسانیت جاگ اٹھتی ہے۔ ہر آدمی دوسروں کے احساس میں شریک ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کے اندر یہ جذبہ ابھرآتا ہے کہ وہ دوسروں کی ضرورت میں ان کے کام آئے۔ وہ بقدر استطاعت دوسروں کی مدد کرے۔ اس طرح روزہ ایک دوسرے کی ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کا ایک عام جذبہ پیدا کر دیتا ہے جو رمضان کے بعد بھی مہینوں تک باقی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سال بھر پورا ہو کر پھر دوسرا رمضان آجاتا ہے جو دوبارہ آدمی کے اندر وہی انسانی جذبات ابھار دے۔

اللہ کی پکار

الترمذی اور ابن ماجہ کی ایک روایت روزہ کے بارہ میں ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کی خبر دی ان میں سے ایک یہ ہے کہ رمضان کا مہینہ جب آتا ہے تو اللہ کی طرف سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے کہ اے خیر کے طالب آگے بڑھ اور اے شر کے طالب رک جا (ینادی منادٍ، یاباغیَ الخیر اقبل ویاباغی الشر اقصر) (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۱)

ان الفاظ میں ایک نفسیاتی حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ رمضان کے مہینہ میں جب ایک آدمی روزہ رکھتا ہے تو اس کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ اس کی مادی قوتوں میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے، اور اس کی روحانی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اس طرح فطری طور پر اس کے اندر ایک طلب ابھرتی ہے ــــ نیکی کی طرف بڑھنے کی اور برائیوں سے دور بھاگنے کی۔

روزہ آدمی کی شخصیت کے حیوانی پہلو کو دباتا ہے۔ وہ اس کے اندر چھپے ہوئے لطیف احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ اس طرح آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ انسانی اقدار کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر طے کر سکے۔

روزہ ایک شدید تجربہ ہے۔ وہ آدمی کے معمولات کو توڑ دیتا ہے۔ آدمی کے صبح و شام غیر معمولی حالات میں بسر ہونے لگتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں کمزوری آتی ہے۔ جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ بے آرامی اور بے سکونی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

روزہ کا یہ پہلو آدمی کو موت اور آخرت کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ موت کے بعد آدمی کے اوپر محرومی اور بے بسی کی جو کلی حالت پیش آنے والی ہے، روزہ گویا جزئی طور پر اسی محرومی اور بے بسی کی پیشگی یاددہانی ہے۔ روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ آنے والے دن کو اس سے پہلے محسوس کرے جب کہ وہ بالکل سامنے آچکا ہو۔ وہ موت سے پہلے موت کے بعد کی تیاری کرنے میں لگ جائے۔

اخلاقی پرہیزگاری

حدیث میں رمضان کو شہر الصبر کہا گیا ہے (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۳) یعنی صبر و برداشت کا مہینہ۔ اس مہینہ میں آدمی کو اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے منفی جذبات پر قابو رکھتے ہوئے فتنوں کی اس دنیا میں کامیاب زندگی گزار سکے۔ آدمی کے منفی جذبات ہی اس کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اور روزہ اسی سب سے بڑے انسانی مسئلہ کے حل کی ایک مقدس تدبیر ہے۔

اس بات کو حدیث میں اس طرح کہا گیا ہے کہ ہر چیز کی ایک زکاۃ ہوتی ہے، اور جسم کی زکاۃ روزہ ہے (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۳۹) یہاں زکوٰۃ سے مراد پاکی ہے۔ یعنی ہر چیز کو پاک کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اور جسم کو پاک کرنے کے لئے روزہ کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ روزہ کی حیثیت جسم انسانی کے لئے غسل جیسی ہے۔ پانی کا غسل جسم کے ظاہری حصہ کو پاک کرتا ہے، اور روزہ جسم کے باطنی حصہ کو پاک کرنے والا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کسی کو کھانے کے لئے بلایا جائے اور وہ روزہ دار ہو تو اس کو یہ کہہ دینا چاہئے کہ میں روزہ دار ہوں (إذا دعی أحدکم الی طعام وھو صائم فلیقل إنی صائم) مشکاۃ المصابیح ۱/۶۴۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا روزہ کا دن ہو تو وہ نہ بری بات بولے اور نہ شور کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرنے پر آمادہ ہو تو اس کو یہ کہہ دینا چاہئے کہ میں روزہ دار ہوں۔ (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۱)

روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی عملی پرہیز کی حالت اپنے آپ پر طاری کرے۔ اس طرح اس کے اندر ایک قسم کی پرہیزی فکر ابھرتی ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ دنیا میں مجھے پرہیز والی زندگی گزارنا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی اسے کھانے کی کوئی چیز پیش کرے تو وہ فوراً کہہ دیگا کہ میں روزہ دار ہوں۔ کوئی اس کو برا کہے یا اس کے ساتھ اشتعال انگیزی کرے تو اس کے جواب میں وہ مشتعل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس کا دل اس کے اندر سے کہہ رہا ہوگا کہ تم نے تو روزہ رکھ کر پرہیزگار بننے

کا عہد کر رکھا ہے۔ تم کیسے برائی کے فعل میں کسی کے ساتھ شریک ہوسکتے ہو۔

اس طرح روزہ آدمی کے اندر یہ مزاج بناتا ہے کہ وہ غیر انسانی باتوں سے پرہیز کرے۔ وہ غیر شریفانہ قسم کے قول وفعل سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ وہ اخلاقی پرہیز کے ساتھ دنیا میں زندگی گزارنے لگے۔

یہ پرہیز گاری ہی موجودہ دنیا میں ہر قسم کی دینی اور دنیوی ترقی کی واحد ضمانت ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو امتحان کے لئے بسایا گیا ہے۔ اس لئے یہاں طرح طرح کی آزمائشی ترغیبات بھی رکھ دی گئی ہیں تاکہ اس کے ذریعہ آدمی کو جانچا جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ کون آزمائش میں پورا اترا، اور کون آزمائش میں ناکام ہو گیا۔

سب سے پہلے آدمی کا اپنا نفس ہے۔ آدمی کے نفس کے اندر بہت سے ناپسندیدہ جذبات پیدائشی طور پر موجود ہیں۔ مثلاً حسد، غصہ، نفرت، بغض، خود غرضی، مفاد پرستی، خود بینی، مصلحت پرستی اور انانیت وغیرہ۔ جب کوئی موقع آتا ہے تو یہ جذبات ابھرتے ہیں اور آدمی کو اپنی طرف کھینچ لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ آزمائش کی گھڑی ہوتی ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی اسی پرہیز گاری کے اصول پر عمل کرے جس کی تربیت ایک اضافی کورس کے ذریعہ رمضان کے مہینہ میں اس کو دی گئی ہے۔

اسی طرح شیطان بار بار آدمی کو بہکاتا ہے۔ انسانی پروپگنڈے اس کو غلط سمت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ عمومی رواج آدمی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ان تمام مواقع پر آدمی گمراہی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت جو آدمی پرہیز گاری کا اصول اختیار کر کے اپنے کو انحراف سے بچالے وہ کامیاب ہے، اور جو شخص ایسا نہ کر سکے وہ دنیا میں بھی ناکام ہے اور آخرت کی طویل تر زندگی میں بھی ناکام۔

"پرہیز" ایک مستقل اصول ہے۔ اور روزہ اسی پرہیز کے اصول کا ایک سبق ہے۔ روزہ دار وہی ہے جس کا روزہ اس کو پرہیز گارانہ زندگی گزارنے کے قابل بنا دے۔

عالی شان مسجدیں

سنن ابی داؤد (کتاب الصلوٰۃ، با ب فی بناء المساجد) میں عبداللہ بن عباس کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے: ''قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما امرت بتشئید المساجد'' قال ابن عباس لتزخرفنھا کما زخرفت الیھود والنصاریٰ ۔رسول اللہ نے فرمایا کہ مجھے بلند و بالا مسجدیں بنانے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ (یہ حدیث بیان کرنے کے بعد) عبداللہ ابن عباس نے کہا کہ تم لوگ ضرور مسجدوں کو مزین کروگے جس طرح یہود اور نصاریٰ نے اپنی عبادت گاہوں کو مزین کیا۔ایک اور روایت میں ایک صحابی کہتے ہیں کہ ہم کو بلند و بالا مسجدیں بنانے سے منع کیا گیا ہے۔(نھینا عن تشئید المساجد)

یہ پیشین گوئی موجودہ زمانہ میں ایک واقعہ بن چکی ہے۔ اور ہر ملک میں اس کے مناظر دیکھے جاسکتے ہیں۔ جہاں بھی کچھ مسلمان آباد ہیں وہاں عالی شان مسجدیں بنائی جارہی ہیں۔کہیں قصر نما، کہیں قلعہ نما، اور کہیں تاج محل نما۔ شاندار مساجد تعمیر کرنے کا یہ کام امریکا اور یورپ میں مزید اضافہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ کیوں کہ اس سلسلہ میں وہاں زیادہ بہتر ٹکنیکی سہولتیں حاصل ہیں۔ یہاں یہ سوال ہے کہ عالیشان مسجدیں بنانے کو اسلام میں کیوں ناپسند کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسجدوں کی عالیشان تعمیرات امت کے روحانی زوال کی علامت ہیں۔ کیوں کہ جب روح (اسپرٹ) ختم ہوتی ہے تو اس کی تلافی کے لیے مظاہر میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

عالیشان مسجدوں کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ وہ نمود و نمائش والی دینداری کی علامت ہیں۔شاندار عمارتوں میں نمود و نمائش کے جذبہ کو بے حد تسکین ملتی ہے۔ وہ شکست خوردہ نفسیات کے لئے عظمت و فخر کی تسکین کا سامان ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی عام نفسیات یہ ہے کہ انھوں نے پولٹیکل گلوری کو کھودیا ہے۔ ایسی حالت میں در و دیوار کی عظمت انہیں یہ فرضی تسکین دیتی ہے کہ اب بھی انھوں نے زمین پر اپنی عظمت کا نشان قائم کر رکھا ہے۔

تقویٰ کا مرکز

بدر الدین محمد بن بہادر الزرکشی (م ۷۹۴ ھ) قاہرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ انھوں نے اپنی کتاب إعلام المساجد میں مسجد سے متعلق بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

قال ابو الدرداء لابنه - یا بنی ، لیکن المسجد بیتك - فانی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: المساجد بیوت المتقین - فمن یکن المسجد بیته یضمن الله له الروح والرحمة والجواز علی الصراط الی الجنة۔

ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اے میرے بیٹے مسجد کو اپنا گھر بناؤ۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مسجدیں متقیوں کا گھر ہیں۔ پس مسجد جس کے لئے گھر ہوجائے اللہ اس کو رحمت اور مہربانی کی ضمانت دیدیتا ہے اور اس کو جنت کے راستہ کا پروانہ عطا فرماتا ہے۔

اس حدیث میں بیت کا لفظ سادہ طور پر گھر کے معنی میں نہیں ہے۔ یہ دراصل اس معنی میں ہے کہ جس معنی میں آجکل مرکز کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد تقویٰ کی تربیت کا مرکز ہے۔ مسجد کسی بستی کا وہ مقام ہے جہاں اجتماعی طور پر لوگوں کو متقیانہ زندگی کا سبق دیا جاتا ہے۔

ایک مومن کو اس دنیا میں جو دین دارانہ زندگی گزارنا ہے، اس کا مکمل نمونہ نماز میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی لئے حضرت عمر فاروق نے فرمایا کہ نماز دین کا کھمبا ہے۔ جس نے اس کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا، اور جس نے اس کو ڈھا دیا اس نے دین کو ڈھا دیا (الصلاۃ عماد الدین، فمن اقامها اقام الدین ومن هدمها هدم الدین)

مسجد سے روزانہ اللہ اکبر کی آواز سنائی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی یاددہانی ہے کہ انسان چھوٹا ہے اور خدا بڑا۔ مسجد میں داخل ہوکر آدمی وضو کرتا ہے، یہ اس بات کا سبق ہے کہ آدمی کو ہمیشہ پاک صاف رہنا چاہئے۔ مسجد میں آدمی رکوع اور سجدہ کرتا ہے، یہ اس بات کی تعلیم ہے کہ دنیا میں تواضع کے ساتھ رہو۔ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جاتی ہے، یہ اس بات کی تربیت ہے کہ اجتماعیت کے ساتھ زندگی گزارو۔

سجدۂ قربت

قرآن کی سورہ نمبر ۹۶ میں ارشاد ہوا ہے: **واسجد واقترب** (العلق ۱۹) یعنی تم سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ۔ اس آیت کی وضاحت ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أقرب مایکون العبد من ربه و أحبه اليه ما كانت جبهته في الأرض ساجدا لله (مسلم كتاب الصلاة، النسائي كتاب المواقيت، الترمذي كتاب الدعوات، مسند احمد)** یعنی بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اور سب سے زیادہ محبوب اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کی پیشانی زمین پر ہو، اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہوئے۔

سجدہ کیا ہے۔ سجدہ آدمی کی داخلی حالت کا ایک خارجی اظہار ہے۔ سجدہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اپنے رب کی عظمت کا شدید احساس طاری ہوا۔ وہ اللہ کے کمال قدرت کے مقابلہ میں اپنے کمال عجز کو سوچ کر تڑپ اٹھا۔ اس کی یہ داخلی کیفیت جسمانی اعتبار سے اس حالت میں ڈھل گئی کہ وہ سجدہ کرتے ہوئے زمین پر گر پڑا جو کہ سرفگندی کی آخری اور انتہائی صورت ہے۔

سجدہ عجز انسانی کی تصویر ہے۔ سجدہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو آخری حد تک اللہ کے آگے ڈال دیا۔ اس نے اپنے پورے وجود کو اللہ کے حوالہ کر دیا۔ اس نے اپنے عجز اور اللہ کی قدرت کا آخری حد تک اعتراف کر لیا۔ جب کوئی انسان اپنے آپ کو ابدیت کے اس درجہ تک پہنچا دے تو اس کے بعد بندہ اور خدا کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا۔ اس کے بعد اللہ اس کا ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کا۔

سجدہ کا یہ فائدہ اس کے ظاہر کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ساجد کی داخلی کیفیت کی بنا پر ہے۔ سجدہ کی ظاہری صورت کی حیثیت علامت کی ہے۔ سجدہ ایک بامعنٰی ربانی عمل ہے۔ حقیقی سجدہ وہ ہے جب کہ آدمی کے جسم کے ساتھ اس کا دل، اس کی روح اور اس کا دماغ بھی اللہ کے آگے گر پڑا ہو۔ سر کو جھکانے کے ساتھ اس نے اپنے پورے وجود کو اللہ کے آگے جھکا دیا ہو۔

صدقہ کلچر

ایمان آدمی کے اندر جونفسیات پیدا کرتا ہے اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ایسے آدمی کے اندر دینے کا جذبہ بے پناہ حد تک پیدا ہو جاتا ہے وہ ہر لمحہ دوسروں کو دینے کے لئے آمادہ رہتا ہے، خواہ اس کو دوسروں سے مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث وہ ہے جو الترمذی اور ابو داؤد نے نقل کی ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ مدینہ کی مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باجماعت نماز ادا کی۔ نماز سے فراغت کے بعد ابھی لوگ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص وہاں آیا۔ چونکہ جماعت ختم ہو چکی تھی، وہ الگ کھڑا ہو کر اپنی نماز پڑھنے لگا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص ہے جو اس آدمی کے اوپر صدقہ کرے اور وہ اس کے ساتھ نماز پڑھے (ألا رجل يتصدق على هذا فيصلى معه) پھر ایک صاحب (ابوبکر صدیق) اٹھے اور انہوں نے اس آدمی کے ساتھ نماز ادا کی (مشكاة المصابيح ۱/۳۶۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کا مقتدی بن کر اس کے ساتھ نماز پڑھنے کو اس کے لئے صدقہ کیوں فرمایا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ آدمی جماعت سے محروم رہ گیا تھا اور اب وہ جماعت کے بغیر اپنی نماز ادا کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص اس کے ساتھ بطور مقتدی شریکِ نماز ہو جائے تو اس کی نماز ایک باجماعت نماز بن جائے گی۔ اس طرح یہ شریک ہونے والا آدمی مذکورہ نمازی کو باجماعت نماز کا ثواب دینے کا ذریعہ بن جائے گا۔

اسلام اپنی انسانی تعلیمات کے اعتبار سے گویا ایک قسم کا صدقہ کلچر ہے۔ اسلام آدمی کے اندر دوسروں کے لئے دینے کا جذبہ (spirit of giving) پیدا کرتا ہے۔ اسی جذبہ کی ایک بڑھی ہوئی صورت وہ ہے جس کی مثال مذکورہ حدیث میں نظر آتی ہے۔ ایمان آدمی کو دینے والا انسان بناتا ہے۔ دوسرے لوگ اگر خود سے نہ مانگیں تب بھی وہ ہر وقت دوسروں کو دینے کے لئے تیار رہتا ہے، خواہ اس کو ایسا کرنے کے لئے دوسرے کا مقتدی بننا پڑے۔

اسلام کی تعلیمات کے دو پہلو ہیں۔ ایک خدا کی نسبت سے اور دوسرا بندوں کی نسبت سے۔ خدا کی نسبت سے اسلام کی جو تعلیمات ہیں ان کا عنوان عبادت ہے اور انسان کی نسبت سے اسلام کی جو تعلیمات ہیں ان کا عنوان صدقہ ہے۔ یہی دو چیزیں اسلام کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہیں۔

خدا کی نسبت سے انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے تمام احساسات اور خوف و محبت کے تمام جذبات کو خدا کے لیے خاص کر دے اس اعتبار سے وہ کسی اور کو خدا کے ساتھ شریک نہ کرے خدا کو وہ اپنا سب کچھ سمجھنے لگے۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے، اس کی نسبت سے مومن کو یہ کرنا ہے کہ وہ تمام انسانوں کا خیر خواہ بن جائے۔ وہ دوست اور دشمن، اپنے اور غیر، کی تفریق کے بغیر ہر ایک کی بھلائی چاہنے لگے۔

اخلاق

ماں باپ کے ساتھ سلوک

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: سألتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای العمل احب الی اللہ قال الصلاۃ علی وقتہا۔ قلت ثم ای، قال بر الوالدین۔ قلت ثم ای، قال الجہاد فی سبیل اللہ

(رواہ البخاری ومسلم)

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص ان رجلاً جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: جئت ابایعک علی الہجرۃ وترکت ابوی یبکیان۔ قال ارجع الیہما فاضحکہما کما ابکیتہما

(رواہ ابوداؤد)

عن انس رضی اللہ عنہ قال: اتی رجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی اشتہی الجہاد ولا اقدر علیہ۔ قال ہل بقی من والدیک احد۔ قال امی۔ قال قابل اللہ فی برہا فاذا فعلت فانت حاج ومعتمر ومجاہد (رواہ ابویعلی والطبرانی)

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ من احق بحسن صحابتی قال امک۔ قال ثم من قال امک۔ قال ثم من قال امک قال ثم من قال ابوک (رواہ البخاری ومسلم)

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رضا اللہ فی رضا الوالد وسخط اللہ فی سخط الوالد (رواہ الترمذی)

الجنۃُ تحتَ اقدامِ الامہات (الجامع الصغیر للسیوطی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کون سا ہے۔ فرمایا وقت پر نماز پڑھنا۔ پوچھا اس کے بعد۔ فرمایا ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک۔ پوچھا اس کے بعد۔ فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ ہجرت پر بیعت کروں اور میں نے اپنے ماں باپ کو روتے ہوئے چھوڑا ہے۔ آپ نے فرمایا اپنے ماں باپ کی طرف واپس جاؤ اور ان کو ہنساؤ جس طرح تم نے ان کو رلایا ہے۔

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں جہاد کی خواہش رکھتا ہوں مگر مجھے اس پر قدرت نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تمھارے والدین میں سے کوئی ہے۔ اس نے کہا میری ماں ہے۔ آپ نے فرمایا ماں کے ساتھ حسن سلوک میں خدا کو پانے کی کوشش کرو۔ جب تم ایسا کروگے تو تم حاجی ہو، تم عمرہ کرنے والے ہو، تم مجاہد ہو۔

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھا کہ میری حسن صحبت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے۔ آپ نے فرمایا تمھاری ماں۔ پوچھا پھر کون آپ نے فرمایا تمھاری ماں۔ پوچھا پھر کون۔ فرمایا تمھاری ماں۔ پوچھا پھر کون آپ نے فرمایا تمھارا باپ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی رضامندی باپ کی رضامندی میں ہے اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

کعبہ سے زیادہ قابل احترام

یا یھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یأکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ واتقوا اللہ ان اللہ تواب رحیم (حجرات ۱۲)

اے ایمان والو، بہت سے گمانوں سے بچو۔ کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برا نہ کہو۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اس کو تم خود ناگوار سمجھتے ہو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا، مہربان ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : لمّا عُرِجَ بی مَرَرْتُ بقومٍ لھم اظفارٌ من نحاسٍ یخمشون وجوھھم وصدورھم فقلتُ مَن ھٰؤلاء یا جبریل قال ھٰؤلاء الذین یأکلون لحومَ الناسِ ویقعون فی اعراضھم (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معراج کے سفر میں میرا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے وہ اس سے اپنے منھ اور سینے کھرچ رہے تھے۔ میں نے کہا اے جبریل، یہ کون لوگ ہیں۔ انھوں نے کہا یہ وہ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزتوں پر گرتے تھے۔

المومن اکرمُ حرمةً من الکعبة (ابن ماجہ)

مومن کعبہ سے زیادہ قابل احترام ہے

من ردّ عن عِرض اخیہ ردّ اللہ عن وجھہ النار یومَ القیامة (ترمذی)

جس نے اپنے بھائی کی عزت کو بچایا تو اللہ قیامت کے دن اس کے منھ کو آگ سے بچائے گا۔

اذا حسدتَ فاستغفر اللہ واذا ظننتَ فلا تحقق (طبرانی)

جب تمھارے اندر حسد پیدا ہو تو اللہ سے معافی مانگو اور جب تم کو کسی کے بارے میں گمان گزرے تو اس کی تحقیق نہ کرو۔

یا معشر مَن آمن بلسانہ لا تغتابوا المسلمین ولا تتبعوا عوراتھم فانہ من یتبع عورة اخیہ یتبع اللہ عورتہ ومن یتبع اللہ عورتہ یفضحہ فی جوف بیتہ (ابوداؤد)

اے ایمان لانے والو مسلمانوں کی برائی بیان نہ کرو۔ اور ان کی پوشیدہ باتوں کے پیچھے نہ پڑو کیونکہ جو اپنے بھائی کی پوشیدہ باتوں کے درپے ہوتا ہے تو خدا اس کی پوشیدہ باتوں کے درپے ہو جاتا ہے اور خدا جس کی پوشیدہ باتوں کے درپے ہو جائے تو وہ ضرور اس کو رسوا کر دیتا ہے خواہ وہ اپنے گھر کے اندر ہو۔

انّ من اربی الربا الاستطالة فی عرض المسلم بغیر حق (ابوداؤد) بدترین زیادتی یہ ہے کہ کسی مسلمان کی عزت پر ناحق حملہ کیا جائے

روایات میں آتا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک روز کعبہ کی طرف دیکھا اور پھر کہا : تو کیسا عظمت والا ہے اور تیری حرمت کتنی زیادہ ہے ۔ مگر مومن کی حرمت اللہ کے نزدیک تجھ سے بھی زیادہ ہے (ما اعظمک و اعظم حرمتک وللمومن اعظم حرمۃ عند اللہ منک، مختصر تفسیر ابن کثیر، جلد ثالث، صفحہ ۳۶۶) یہ بات جو حضرت عبداللہ بن عمر نے کہی یہ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے جس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے ۔ اسی کو صحابی رسول نے اپنی زبان میں دہرایا۔

کعبہ ایک خاموش یادگار ہے۔ اس سے کسی آدمی کے وہ معاملات نہیں پڑتے جو زندہ انسانوں سے پڑتے ہیں ۔ اس لئے کعبہ کا احترام کرنے کے لئے آدمی آسانی سے راضی ہو جاتا ہے ۔ اور انسان کا احترام کرنے پر راضی نہیں ہوتا ۔ مگر انسان کے تقویٰ کا اصل امتحان کعبہ کی سطح پر نہیں بلکہ انسان کی سطح پر ہو رہا ہے ۔ جب ایک شخص کے دل میں اپنے بھائی کے خلاف ایک برا گمان گزرتا ہے مگر وہ محض گمان کی بنیاد پر اس کے بارے میں نہیں بولتا۔ حتیٰ کہ وسعت ظرف سے کام لیتے ہوئے وہ اس کی تحقیق سے بھی بچتا ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی کی جو بات اللہ نے چھپا رکھی ہے وہ اس کو چھپا ہی رہنے دے تو وہ ایک ایسے عمل کا ثبوت دیتا ہے جو کسی مقدس دیوار کا احترام کرنے سے بھی زیادہ بڑا عمل ہے ۔ جب اس کو کسی کے اوپر غصہ آتا ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو اس سے روکتا ہے کہ وہ اُس کی عزت پر حملہ کرنے لگے، وہ اس کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرے تو وہ ایک ایسا عمل کرتا ہے جو مقدس یادگاروں کا ادب کرنے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے ۔ جب ایک آدمی دیکھتا ہے کہ اس کا بھائی کسی پہلو سے ترقی کر گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس سے حسد نہیں کرتا ، وہ اس کا برا نہیں چاہتا تو یہ خدا کے نزدیک اتنا بڑا عمل ہوتا ہے جو اس کے لئے کعبہ کے احترام سے بھی زیادہ بڑے اجر کا باعث بن جاتا ہے ۔

دنیا میں ہر آدمی ایک درمیانی مقام پر کھڑا ہوا ہے ۔ ایک طرف اس کا خدا ہے جس سے وہ آخرت میں ملنے والا ہے ۔ دوسری طرف وہ انسان ہیں جن کے درمیان وہ آج اپنے آپ کو پاتا ہے ۔ آدمی کو دوسرے انسانوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا ہے جو وہ خدا سے اپنے بارے میں چاہتا ہے ۔ اگر آدمی چاہتا ہے کہ خدا اس کے بھیدوں کو کھول کر قیامت میں اس کو رسوا نہ کرے تو اس کو دنیا میں یہ کرنا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے بھید کے پیچھے نہ پڑے ۔ وہ اگر خدا کے بندوں کے بھید کو چھپائے گا تو خدا بھی اس کے بھید کو چھپائے گا ۔ اور اگر اس نے دوسروں کو رسوا کیا تو خدا اس کو یہ سزا دے گا کہ قیامت کے دن اس کو رسوا کر کے اپنی رحمتوں سے اسے دور کر دے ۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کی عزت بچانا اپنی عزت بچانا ہے ، دوسرے کے اوپر وار کرنا خود اپنے اوپر وار کرنا ہے ۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہوں اور اس سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو اس پر عمل کرنے کے لئے راضی کر سکیں ۔

سب سے بڑا عمل وہ ہے جس کے لئے آدمی کو اپنے نفس سے لڑنا پڑے ، جس کے لئے مصلحتوں کے نقصان کو برداشت کرنا ہو ، جس کی قیمت یہ دینی پڑے کہ آدمی کی عزت و مقبولیت خطرہ میں پڑ جائے ۔

بے حسی کا مرض

انسانی بیماریوں میں ایک ڈراؤنی قسم کی بیماری وہ ہے جس کو جذام (leprosy) کہا جاتا ہے۔ یہ مہلک بیماری ایک مخصوص جراثیم کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ جراثیم جسم کے محیطی اعصاب کو برباد کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر حساسیت کا مادہ ختم ہو جاتا ہے:

It is caused by Hansen's bacillus. Destruction of the peripheral nerves by the bacillus leads to a loss of sensation. (VI/159)

مثلاً جذام کے مریض کا ہاتھ اگر آگ پر پڑ جائے تو ہاتھ جلتا رہے گا مگر وہ اپنے ہاتھ کو آگ سے ہٹانے کے لیے حرکت میں نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہی حساسیت کا خاتمہ ہے۔ آدمی کے جسم میں باریک قسم کے نازک اعصاب ہوتے ہیں۔ یہ اعصاب بے حد حساس ہوتے ہیں۔ جسم کے کسی حصہ میں کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ اسی وقت اس کی خبر دماغ کو پہونچاتے ہیں۔ دماغ فوراً اس حصۂ جسم کو مقام حادثہ سے ہٹانے کا حکم دیتا ہے۔ اور ایک لمحہ میں جسم کا وہ حصہ وہاں سے ہٹا لیا جاتا ہے۔ جذام کے مریض کے اندر یہ مخصوص اعصاب مردہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر اس کا ہاتھ آگ پر پڑ جائے تو دماغ تک اس کی خبر نہیں پہونچ سکے گی، اس لیے دماغ کا حکم بھی جاری نہیں ہوگا۔ اور وہ ہاتھ جلتے رہنے کے باوجود وہیں پڑا رہے گا۔

یہ جسمانی بیماری ایک خدائی نشانی ہے جو ہم کو ایک روحانی بیماری کی پہچان کراتی ہے۔ یہ روحانی بیماری وہی ہے جس کو قرآن میں قساوت (الحدید ۱۶) کہا گیا ہے۔ یہ اخلاقی اور روحانی موت کی ایک حالت ہے جب کہ برائی اور اچھائی کے بارہ میں آدمی کی حساسیت مردہ ہو جاتی ہے۔ وہ اس قلبی تڑپ سے محروم ہو جاتا ہے جو آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ جب وہ بھلائی کو دیکھے تو اس کی طرف دوڑے اور برائی کو دیکھے تو اس سے بھاگ کر اپنے آپ کو اس سے بچائے۔

ایمانی حساسیت سے اس محرومی کی مثالیں قرآن و حدیث میں کثرت سے بتائی گئی ہے۔ مثلاً غزوہ بنی المصطلق (۶ھ) کے بعد ایک سادہ واقعہ کو شوشہ بنا کر مدینہ کے کچھ لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

کے خلاف ایک جھوٹا قصہ گھڑا۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بلاتحقیق اس کو ایک دوسرے سے بیان کرنے لگے۔ اس پر قرآن میں کہا گیا کہ جب تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل کر رہے تھے، اور اپنے منھ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کا تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ اور تم اس کو ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے (النور ۱۵)

کسی شخص کے بارہ میں ایک بری خبر سُن کر اس کو بلاتحقیق پھیلانے لگنا، حسّاس دل کے لیے نہایت سنگین بات ہے۔ مگر جن لوگوں کی روحانی موت ہوچکی ہو، وہ اس کو بے تکلف چھاپنا اور نقل کرنا شروع کر دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ، جذام کے مریض کی طرح، ان کی وہ حساسیت ختم ہوچکی ہوتی ہے جو اس طرح کے معاملہ میں انھیں چونکائے اور ان کو یہ کہنے پر مجبور کر دے کہ ما یکون لنا ان نتکلم بھذا (ہم کو حق نہیں کہ ہم ایسی بات زبان پر لائیں) النور ۱۶۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اللہ کی ناراضگی کی ایک بات کہتا ہے، وہ اس کی کچھ پروا نہیں کرتا، حالاں کہ اس کی وجہ سے وہ جہنم میں جاگرتا ہے (اِنّ العَبدَ لَیَتکلّمُ بالکلِمةِ مِن سَخَطِ اللّٰہِ تعالیٰ لایُلقی لھا بالاً یَھوی بھا فی جھنّم)

ایک بات جس سے کسی کی آبروریزی ہوتی ہو، کسی کے اوپر جھوٹا الزام عائد ہوتا ہو۔ اس سے کسی کی کردارکشی ہورہی ہو، اس قسم کی بات اپنی زبان سے نکالنا ایسے آدمی کے لیے ہمالیہ پہاڑ سر پر اٹھانے کے برابر ہے جس کا دل خوفِ خدا سے کانپ رہا ہو۔ مگر جس آدمی کے اندر احتسابِ خداوندی کا احساس مردہ ہوجائے وہ ایسی باتوں کو اس طرح دہرائے گا جیسے وہ کوئی پُرلطف قصہ بیان کر رہا ہے۔

جذام کی بیماری جسمانی حسّاسیت کھونے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح غیر ذمّہ دارانہ بات کرنا اور بلاتحقیق الزامات کو پھیلانا بھی ایک روحانی بیماری ہے۔ یہ بیماری اس آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے جس کی حساسیت آخرت کی پکڑ کے بارہ میں مردہ ہوجائے۔

درجات کی بلندی

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو آزادی ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ قیامت آنے سے پہلے یہ آزادی ختم ہونے والی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دنیا میں جس طرح حق اور انصاف کے نمونے ہیں، اسی طرح یہاں ظلم اور زیادتی کے واقعات بھی ہوتے رہتے ہیں۔

یہ ایک ابدی مسئلہ ہے۔ یہ انسانِ اوّل (آدم) کے زمانہ میں ہابیل اور قابیل کی نزاع کی صورت میں شروع ہوا اور قیامت کے ظہور تک جاری رہے گا۔ ایسی حالت میں ظلم و زیادتی کے مسائل کا حل کیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے جس طرح زندگی کے دوسرے معاملات میں رہنمائی دی ہے، اسی طرح آپ نے زندگی کے اس نازک معاملہ میں بھی رہنمائی دی ہے۔ وہ رہنمائی یہ ہے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، الا اخبرکم بعملٍ یرفعُ اللّٰہ بہ الدرجات۔ قالوا بلیٰ یارسولَ اللّٰہ۔ قال: تَحلُم علیٰ من یجھل علیك، وتعفو عمّن ظلمك وتُعطِی من حرمك وتصل من قطعك۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میں تم کو ایسا عمل نہ بتاؤں جس کے ذریعہ اللہ درجات کو بلند کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا۔ جو شخص تم سے جہالت کرے تم اس سے درگزر کرو۔ جو شخص تمہارے ساتھ ظلم کرے تم اس کو معاف کردو۔ جو شخص تم کو نہ دے تم اسے دو۔ جو شخص تم سے کٹے تم اس سے جڑو۔

اس حدیث کے الفاظ پر غور کیجیے۔ اس کے مطابق، درجات کی بلندی کا راز یہ ہے کہ آدمی جوابی اخلاق سے مکمل پرہیز کرے۔ وہ اشتعال انگیزی کے باوجود درگذر کا طریقہ اختیار کرے۔ لوگ ظلم کریں تب بھی وہ انھیں معاف کردے۔ لوگ محروم کرنے کی سازشیں کریں پھر بھی وہ ان کو دینے کا سلسلہ بند نہ کرے۔ لوگ دوری اختیار کریں تب بھی وہ ان سے قریب ہونے کی کوشش جاری رکھے۔

یہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ جو لوگ اس طریقہ پر چلیں وہ آپ کے مومن ہیں۔ جو لوگ اس طریقہ کو چھوڑ دیں، حتیٰ کہ اپنے زبان و قلم سے اس کی تردید کریں، وہ بلاشبہ آپ کے منکر ہیں، خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو مومن کامل سمجھتے ہوں۔

نقصان نہیں

اسلام کا ایک مستقل اصول یہ ہے کہ ۔۔۔لاضرر ولا ضرار فی الاسلام (ابن ماجہ، کتاب الاحکام) یعنی اسلام میں نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا ہے۔ اس اصول کا تعلق انفرادی زندگی سے بھی ہے اور اجتماعی زندگی سے بھی۔

مومن اللہ سے ڈرنے والا انسان ہوتا ہے۔ وہ کسی حال میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ مومن وہ ہے جو دوسرے کے درد کی چوٹ اپنے سینہ میں محسوس کرے۔ پھر ایسا انسان کیسے اس کا تحمل کر سکتا ہے کہ وہ کسی کو تکلیف پہنچائے۔ یا کسی کو اپنی طاقت کا نشانہ بنائے۔ مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کو کسی کے اوپر قدرت حاصل ہو جائے تب بھی وہ اس کو تکلیف پہنچا کر اپنی انانیت کی تسکین حاصل نہ کرے۔

مگر اسی کے ساتھ مومن اس کو بھی جانتا ہے کہ موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو خدا کی طرف سے پوری آزادی ملی ہوئی ہے۔ اسی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ سرکش بن جاتے ہیں بہت سے لوگ دوسروں کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس دنیا میں جائز زندگی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ایسے انسانوں کی طرف سے ہوشیار رہے جو اپنی آزادی کا غلط استعمال کر کے دوسروں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ وہ دوسروں کو سینگ مار کر اپنی انا کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

اس قسم کے نقصان سے بچنے کے لئے مومن کو ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ لوگوں سے معاملہ کرنے میں، لوگوں سے لین دین کرنے میں، لوگوں کے درمیان رہنے میں وہ ہمیشہ چوکنا رہتا ہے تاکہ وہ دوسروں کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔

اس مقصد کیلئے مومن کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے گرد قوت کا محسوس ہالہ بنائے رہے۔ تاکہ لوگ اس کی طرف سے ہیبت زدہ رہیں اور اس کے خلاف انھیں کسی شرارت کی ہمت نہ پڑے۔

برداشت کا فائدہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے غصہ کو ضبط کرے جب کہ وہ اس کے نفاذ پر قادر ہو تو اللہ اس کے دل کو ایمان اور سلامتی سے بھر دیتا ہے (من کظم غضبا وهو يقدر على انفاذه ملأ الله قلبه امنا و ايمانا)۔

یہ پیغمبرانہ تعلیم انسانیت کی تعمیر کے لئے شاہ کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن افراد کے اندر یہ صفت ہو وہ اعلیٰ روحانی ترقی حاصل کریں گے اور جس سماج کے بیشتر لوگ اس صفت کے حامل ہوں وہ سماج امن و سکون کا گہوارہ بن جائے گا۔

جب ایک آدمی کے اندر کسی کے خلاف غصہ آجائے اور وہ اس غصہ کے اظہار پر قادر ہو اس کے باوجود وہ غصہ کو اپنے اندر ہی اندر ضبط کر لے تو یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی اپنے اس عمل کے ذریعہ اپنے اندر ایک نئی اخلاقی طاقت کو جنم دیتا ہے۔ وہ ترقی کر کے نیا انسان بن جاتا ہے۔

وہ اپنے اندر نفرت کے بجائے محبت کی پرورش کرتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو انتقام کے بجائے معافی کے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ وہ اپنے اندر منفی نفسیات کو دباتا ہے اور اس کی جگہ مثبت نفسیات کو فروغ دیتا ہے۔ اس طرح غصہ کو ضبط کرنا اس کے لئے اپنی شخصیت کی تعمیر کے ہم معنے بن جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں مثبت شخصیت کی تعمیر کا سب سے بڑا کورس یہی ہے۔ اسی کورس سے گذر کر وہ آدمی بنتا ہے جو اعلیٰ انسانی صفات کا حامل ہو۔ جو لوگ غصہ کو ضبط کرنے کی اس تعلیم کو اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوں ان کی شخصیت کی اعلیٰ تعمیر بھی واقعہ بننے والی نہیں۔

غصہ کا اظہار شخصیت کو برہم کرتا ہے اور غصہ کو ضبط کرنا شخصیت کو سکون عطا کرتا ہے۔ غصہ اگر پیچھے کی طرف سفر ہے تو غصہ کو ضبط کرنا آگے کی طرف سفر۔ غصہ یہ ہے کہ آدمی حالات کے درمیان گھر کر رہ جائے اور غصہ کو ضبط کرنا یہ ہے کہ آدمی حالات سے اٹھ کر اپنے جینے کے لئے ایک بلند تر سطح حاصل کر لے۔ غصہ برداشت کرنے میں صرف فائدہ ہے، اور غصہ برداشت نہ کرنے میں صرف نقصان۔

اعلیٰ کردار

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ تم اس سے جڑو جو تم سے کٹے اور تم اس کو دو جو تم کو محروم کرے۔ اور تم اس کو معاف کر دو جو تم پر ظلم کرے (**تصل من قطعك وتعطى من حرمك وتعفو عمن ظلمك**)۔

اس حدیث میں کردار کا وہ طریقہ بتایا گیا ہے جو کسی انسان کو اعلیٰ انسان بناتا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی رد عمل کی نفسیات سے پاک ہو۔ اس کا اخلاق جوابی اخلاق نہ ہو بلکہ وہ اعلیٰ انسانی اصولوں کے تحت متعین ہوا ہو۔ وہ ہر ایک سے یکساں طور پر حسن اخلاق کا رویہ اختیار کرے، خواہ اس سے اچھا تجربہ ہوا ہو یا برا تجربہ۔

سماجی زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو آپ سے شکایت ہوتی ہے اور وہ آپ سے قطع تعلق کر لیتا ہے یا سلام و کلام بند کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو بھی وہی نہیں کرنا ہے جو اس نے آپ کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے برعکس آپ کو یک طرفہ طور پر اس سے ملنا ہے۔ آپ کو یک طرفہ طور پر اس سے سلام و کلام جاری رکھنا ہے۔ یہ سب کچھ محض ظاہری طور پر نہیں بلکہ دل کی پوری آمادگی کے ساتھ ہونا چاہئے۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص آپ سے غصہ ہو جاتا ہے اور جو کچھ وہ آپ کو دے رہا تھا اس کو دینا بند کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو یہ نہیں کرنا چاہئے کہ آپ بھی اس کو جو کچھ دے سکتے ہیں وہ اسے نہ دیں۔ اس کے برعکس آپ کو اپنے عطیات کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے۔ آپ جو کچھ اسے دے سکتے ہیں، وہ ضرور اسے دیں۔ اور دینے کے بعد کسی واپسی کی امید نہ رکھیں۔

اسی طرح اجتماعی زندگی میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے جو آپ کی نظر میں ظلم ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کے دل میں غصہ بھڑک اٹھتا ہے۔ مگر اعلیٰ انسانیت یہ ہے کہ آپ غصہ کو ختم کر دیں۔ ظلم کرنے والے کو معاف کر کے دوبارہ اس کے ساتھ اپنے تعلقات کو معتدل بنا لیں۔

بد گمانی

صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں یہ روایت آئی ہے کہ پیغمبر اسلام نے لوگوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہا کہ تم لوگ گمان سے بہت زیادہ بچو، کیوں کہ گمان سب سے بڑا جھوٹ ہے (ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث) متفق علیہ۔

گمان یہ ہے کہ آدمی پوری معلومات کے بغیر کسی کے بارے میں ایک رائے قائم کرلے۔ ہر آدمی کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ ہر آدمی کا عمل بہت سے اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کامل تحقیق کے بغیر کسی کے عمل کی حقیقت کو جاننا ممکن نہیں۔ کوئی شخص کسی کا صرف ایک عمل دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرلے تو یہ گمان ہوگا۔ اور گمان کسی کے لئے بھی جائز نہیں۔

آدمی کے ہر عمل کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں، اس لئے اس کی توجیہات بھی متنوع اور مختلف ہوتی ہیں۔ دوسروں کے بارے میں آدمی کا مشاہدہ یا تجربہ ہمیشہ جزئی مشاہدہ اور تجربہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی کی ایک روش کو دیکھ کر اس کے خلاف برا گمان کرنا گویا جزئی علم کو کلی علم سمجھ لینا ہے۔ ناقص معلومات پر کامل واقفیت کا دعوی کرنا ہے۔ اس لئے کسی کے خلاف بدگمانی عین اسی قسم کی ایک چیز بن جاتی ہے جیسا کہ جھوٹ۔

جھوٹ اخلاقی حیثیت سے انتہائی معیوب کلام ہے۔ وہ خدائی شریعت کے اعتبار سے سراسر ناجائز ہے۔ ایسی حالت میں جو آدمی کسی کے خلاف بدگمانی کرتا ہے تو وہ ایک بے حد سنگین جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ ایسا کر کے وہ خدا کی نظر میں اپنے آپ کو ایک غیر مطلوب بندہ بنالیتا ہے۔ اور انسانوں کی نظر میں وہ ایک ایسا شخص بن جاتا ہے جس سے تمام لوگ نفرت کریں۔ جس کو سماج میں باعزت درجہ نہ ملے۔

گمان کی بنیاد پر کسی کے خلاف رائے قائم کرنے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی کوئی رائے ہی قائم نہ کرے۔ آدمی رائے قائم نہ کرنے کے لئے آزاد ہے۔ مگر رائے قائم کرتے ہی وہ قابل مؤاخذہ ہوجاتا ہے۔

اچھا گمان کرنا جائز ہے۔ اور برا گمان کرنا بلاشبہ ناجائز۔

پڑوسی کا حق

قرآن و حدیث میں پڑوسی کا بہت حق بتایا گیا ہے۔ امام بخاری نے ابو رافع رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پڑوسی قریب ہونے کی وجہ سے شفع کا زیادہ حق دار ہے (الجارُ احقُّ بسقَبِہ) مشکاۃ المصابیح ۸۹۳/۲

حضرت ابو رافع کے واقعات کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ مدینہ میں ان کے دو مکانات تھے۔ ان میں سے ایک مکان وہ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ ایک شخص نے اس مکان کو پانچ سو دینار نقد دے کر خریدنا چاہا مگر ساتھ ہی اس مکان کے ایک اور خواہش مند تھے اور وہ حضرت سعد بن وقاص تھے جو حضرت ابو رافع کے پڑوسی تھے۔ انھوں نے اپنے مکان کو حضرت سعد کے ہاتھ فروخت کر دیا اگرچہ اپنی پیش کش کے مطابق، انھوں نے صرف چار سو دینار ادا کیے اور وہ بھی قسطوں میں۔ اس موقع پر حضرت ابو رافع نے کہا کہ پڑوسی ہونے کے اعتبار سے سعد بن وقاص اس مکان کے زیادہ حق دار ہیں۔

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک ایک بہت بڑا دینی عمل ہے۔ آدمی کو اس عمل کا بہترین بدلہ آخرت میں ملے گا۔ تاہم دنیا کے اعتبار سے بھی اس اسلامی تعلیم کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس میں دنیوی حکمت کے بے شمار پہلو چھپے ہوئے ہیں۔

ایک شخص جو آپ کے پڑوس میں ہے وہ آپ کا صبح و شام کا ساتھی ہے۔ اس سے بار بار سابقہ پیش آتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کا پڑوسی اگر آپ سے ناراض ہو تو وہ بے شمار طریقوں سے آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ حتی کہ اگر وہ آپ کے معاملات میں غیر جانب دار ہو جائے تب بھی اس کی غیر جانبداری آپ کے لیے سخت مضر ثابت ہوگی۔

آپ کے حسنِ سلوک نے اگر آپ کے پڑوسی کو آپ کا دوست بنا رکھا ہو۔ آپ کے احسانات کی بنا پر اس کی فطرت، یہ کہہ رہی ہو کہ مجھے بھی احسان کا بدلہ احسان سے دینا چاہیے، تو ایسا پڑوسی آپ کے لیے تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ اس کو جتنا فائدہ پہنچائیں گے اس سے کہیں زیادہ فائدہ آپ کو اس کی طرف سے ملے گا۔

تفقہ فی الدین

اسلام میں تفقہ فی الدین کی بے حد اہمیت ہے۔قرآن میں اس کا ذکر فرض کفایہ کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ارشاد ہوا ہے کہ اگر امت کے تمام لوگ نہیں تو کچھ لوگوں کو ایسا کرنا چاہئے کہ وہ اپنے اندر اعلیٰ درجہ میں تفقہ فی الدین کی صلاحیت پیدا کریں (التوبہ ۱۲۲)

حدیث سے بھی اس کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔حضرت معاویہ بن سفیان کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: **من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین** (فتح الباری ۱۳/۳۰۶) یعنی اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اس کو وہ تفقہ فی الدین عطا کردیتا ہے۔

تفقہ کے معنی فہم وبصیرت کے ہیں۔یہاں تفقہ کا لفظ معروف فقہی معنی میں نہیں ہے۔موجودہ زمانہ میں فقہ کا لفظ بولا جائے تو اس کا مطلب ان احکام ومسائل کو جاننا ہوتا ہے جن کو فقہاء اسلام نے بعد کے زمانہ میں مرتب کیا۔مگر مذکورہ آیت یا حدیث میں تفقہ کا لفظ اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے۔بلکہ وہ اصولی اور اساسی دین میں گہری فہم وبصیرت کے لئے آیا ہے۔

اس اعتبار سے، تفقہ کا مطلب معروف نوعیت کا مقلدانہ علم نہیں ہے۔ بلکہ وہ سراسر ایک مجتہدانہ علم ہے۔تفقہ فی الدین کا مطلب سطور سے گذر کر بین السطور کو پڑھ لینا ہے۔الفاظ سے نکلنے والے سادہ مفہوم سے گذر کر اس کی چھپی ہوئی معنویت کو دریافت کرنا ہے۔فنی اور ظاہری تفصیلات سے آگے بڑھ کر معنویت کے سمندر میں داخل ہوجانا ہے۔

تفقہ فی الدین بلاشبہہ ایک مومن کے لئے خیر اعلیٰ کا درجہ رکھتا ہے۔جس آدمی کے اندر تفقہ کی صلاحیت پیدا ہوجائے اس کا ایمان اس کے اندر ربانی شخصیت کی تشکیل کرنے لگتا ہے۔وہ حقیقتوں کو براہ راست دیکھنے کے قابل ہوجاتا ہے۔وہ واقعات ومعاملات کو ان کی صحیح روشنی میں دیکھنے لگتا ہے۔ خواہ اپنی ذات کا معاملہ ہو یا دوسروں کا معاملہ، وہ صحیح ترین رائے تک پہنچنے کے قابل ہوجاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **خصلتان لاتجتمعان**

فی منافق حسن سمت ولا فقه فی الدین (الترمذی بحواله مشکاة المصابیح ۱/ ۷۶)
دو صفتیں ایسی ہیں جو کسی منافق میں جمع نہیں ہوتیں—— خوش خلقی اور تفقہ فی الدین۔

منافقت کے ساتھ تفقہ فی الدین کیوں جمع نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ منافق ایک غیر سنجیدہ انسان ہوتا ہے، اور غیر سنجیدہ ذہن اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ وہ گہری حقیقتوں کو سمجھے یا ان کا ادراک کر سکے۔ گہری بصیرت کے لئے سنجیدگی (sincerity) ایک لازمی شرط ہے۔ منافقت کے ساتھ سنجیدگی کبھی جمع نہیں ہوتی۔ اس لئے منافق انسان کبھی تفقہ فی الدین کی لذت سے آشنا بھی نہیں ہوتا۔

تفقہ فی الدین کا درجہ اس کے حصہ میں آتا ہے جو اپنے ذہن کو دوسری غیر متعلق چیزوں سے ہٹا کر صرف دین کو اپنے غور وفکر کا موضوع بنائے۔ یہ ذہنی یکسوئی (concentration) ہی تفقہ فی الدین کا دروازہ ہے۔ جو لوگ ذہنی یکسوئی کی یہ قیمت ادا نہ کریں وہ کبھی اس خیر کو نہیں پا سکتے جس کو قرآن و حدیث میں تفقہ فی الدین کہا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **فقیہ واحد اشد علی شیطان من الف عابد** (الترمذی، ابن ماجہ، بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۱/ ۷۳) یعنی ایک فقیہ شیطان کے اوپر ہزار عابد سے زیادہ سخت ہے۔

غیر فقیہ صرف چیزوں کے ظاہر کو دیکھتا ہے۔ اس کے برعکس فقیہ کی نظر چیزوں کی اصل حقیقت تک پہنچ جاتی ہے۔ غیر فقیہ چیزوں کے فرق کو نہیں سمجھتا جب کہ فقیہ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جان لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر فقیہ نہایت آسانی سے شیطان کی تزئین کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب کہ فقیہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ شیطانی تزئین کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو اس کے برہنہ روپ میں دیکھ سکے۔ اور اس طرح اس کی گمراہی سے بچ جائے۔

غلو نہیں

قرآن (النساء ۱۷۱) میں اہل کتاب کے تذکرہ کے ذیل میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنے دین میں غلو نہ کرو (لاتغلو ا فی دینکم) یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ تم لوگ دین میں غلو سے بچو کیوں کہ پچھلی امتیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔ (ایاکم والغلو فی الدین فانما هلك من كان قبلكم بالغلو فی الدین) مسند احمد بن حنبل ۱/ ۲۱۵

غلو کا مطلب ہے زیادہ ہونا، حد سے تجاوز کرنا ۔ حدیث کے مطابق، ہر قسم کے معاملات میں توسط اور اعتدال کی راہ ہی درست راہ ہے۔ اعتدال یا میانہ روی کا طریقہ ہمیشہ کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور غلو کا طریقہ ہمیشہ نقصان اور ناکامی کی طرف ۔ یہ خود فطرت کا قانون ہے۔ اسی لئے عالمی سطح پر اس کا اعتراف کیا گیا ہے۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ زیادتی ہر چیز میں بری ہے:

an excess of everything is bad

غلو کا تعلق ہر معاملہ سے ہے۔ مثلاً عقیدہ میں پختہ ہونا بہت اچھی بات ہے مگر عقیدہ کے کھلے اظہار میں اگر جان کا خطرہ ہو تو ایسی حالت میں اپنی جان بچانے کے لئے اخفا کا حکم دیا گیا۔ نماز اور روزہ، ذکر اور تلاوتِ قرآن، سب مطلوب اعمال ہیں مگر ان کی غیر معتدل کثرت مطلوب نہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بلاشبہ ضروری اعمال میں سے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اس کو تشدد کی حد تک لے جائے تو وہ درست نہ ہو گا۔

یہی معاملہ اخلاقی اصولوں کا بھی ہے۔ مثلاً خود اعتمادی ایک اعلیٰ اخلاقی صفت ہے۔

لیکن خود اعتمادی اگر کسی کو غیر حکیمانہ اقدام تک لے جائے تو وہ پسندیدہ نہ ہوگا۔ عزتِ نفس اور خودداری بلاشبہ پسندیدہ اعمال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر عزتِ نفس کسی کو اس حد تک لے جائے کہ وہ اس کے لئے اپنی غلطی کے اعتراف میں رکاوٹ بن جائے تو وہ بھلائی نہیں رہے گی بلکہ ایک برائی بن جائے گی۔

اسی طرح یہ ایک اچھی صفت ہے کہ آدمی کسی کی مدد نہ لے، وہ کسی کا احسان لینا گوارہ نہ کرے۔ وہ اپنی کفالت آپ کرنا چاہے۔ لیکن کسی کا یہ مزاج اگر اس کے اندر فخر اور بڑائی کا جذبہ پیدا کرنے کا سبب بن جائے تو یہ اس کے حق میں ایک بری عادت ہوگی نہ کہ کوئی اچھی عادت۔

آدمی کی یہ کمزوری ہے کہ کسی چیز میں کوئی امتیازی پہلو دیکھتا ہے تو اس کے بارے میں مبالغہ آمیز تصور قائم کرلیتا ہے۔ وہ اس کا مقام متعین کرنے میں حد سے آگے نکل جاتا ہے اسی کا نام غلو ہے۔ شرک اور شخصیت پرستی کی تمام قسمیں اصلاً اسی غلو کی پیداوار ہیں۔

دین میں غلو یہ ہے کہ دین میں کسی چیز کا جو درجہ ہے، اس کو اس کے واقعی درجہ پر نہ رکھا جائے۔ بلکہ اس کو بڑھا کر زیادہ بڑا درجہ دینے کی کوشش کی جائے۔۔۔ اللہ اپنے ایک بندے کو باپ کے بغیر پیدا کرے تو کہہ دیا جائے کہ یہ خدا کا بیٹا ہے۔ اللہ کسی کو کوئی بڑا مرتبہ دیدے تو سمجھ لیا جائے کہ وہ کوئی مافوق شخصیت ہے اور بشری غلطیوں سے پاک ہے۔ دنیا کی چمک دمک سے بچنے کی تاکید کی جائے تو اس کو بڑھا چڑھا کر ترک دنیا تک پہنچا دیا جائے زندگی کے کسی پہلو کے بارے میں کچھ احکام دیئے جائیں تو اس میں مبالغہ کر کے اسی کی بنیاد پر ایک پورا دینی فلسفہ بنادیا جائے۔

اس قسم کی تمام صورتیں جن میں کسی دینی تعلیم کو اس کے واقعی مقام سے بڑھا کر مبالغہ آمیز درجہ دیا جائے تو وہ غلو کی فہرست میں شامل ہوگا۔

مصیبت بھی رحمت ہے

ایک روایت صحیح البخاری (کتاب الجہاد) سنن ابی داؤد (کتاب الجہاد) اور مسند امام احمد میں آئی ہے۔ البخاری کے الفاظ یہ ہیں: عجب اللہ من قوم یدخلون الجنة فی السلاسل (فتح الباری ۶/۱۶۸) یعنی اللہ ان پر متعجب ہوتا ہے جو جنت میں زنجیروں میں (بندھے ہوئے) داخل ہوں گے۔ بعض اور روایتوں میں یقادون اور یساقون کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی وہ کھینچتے ہوئے اور ہانکتے ہوئے لے جائے جائیں گے۔

اس حدیث میں کچھ اہل ایمان کے ساتھ جس معاملہ کا ذکر ہے وہ آخرت میں پیش آنے والا معاملہ نہیں ہے بلکہ آخرت سے پہلے اسی دنیا میں پیش آنے والا معاملہ ہے۔ یہاں زنجیر کا لفظ دراصل مجبور کن حالات (compulsive situation) کی تعبیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے ساتھ ایسے مجبورانہ حالات پیش آئیں گے کہ اُن کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا کہ وہ خدا پرستی اور آخرت پسندی کی زندگی اختیار کریں اور اس طرح گویا بندھے بندھے جنت میں پہنچ جائیں۔

یہ خوش قسمتی اُن افراد کے حصہ میں آئے گی جن کے دل میں اخلاص اور حسن نیت کی چنگاری موجود ہو۔ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کے دل میں اس قسم کی استعداد دیکھے گا اُن کی قدر افزائی اس طرح کرے گا کہ اُن کے لیے ایسے حالات پیدا کردے گا جو اُنہیں طوعاً وکرہاً خدا پرستانہ اعمال کی طرف لے جانے والے ہوں۔ مصیبت کا جنتی زنجیر بن جانا اُس شخص کے حصہ میں آتا ہے جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ مصیبت کے وقت اللہ کی طرف رجوع کرے۔ مصیبت جس کے دل کو اس طرح نرم کرے کہ وہ اللہ کی یاد کرنے والا بن جائے۔

مصیبت اگر لوگوں کے اندر فریاد اور شکایت کا ذہن بنائے تو مصیبت صرف تباہی ہے۔ اور اگر مصیبت لوگوں کے اندر محاسبۂ خویش کا ذہن پیدا کرے تو وہ اُن کے لیے رحمت کا سبب بن جائے گی۔

حکمت معاملہ

ایک تعلیم یافتہ مسلمان ایک سرکاری محکمہ میں اچھی سروس میں ہیں۔ ان کے افسر اعلیٰ سے ان کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ گھر لوٹے تو ان کے دماغ میں سخت ٹنشن تھا۔ ان کو ڈر تھا کہ مذکورہ افسران کی سروس بک خراب کر دے گا اور اس کے نتیجہ میں ان کا پروموشن رک جائے گا۔ اس ٹنشن کی وجہ سے ان کے سر میں اتنا سخت درد ہوا کہ وہ گھر آکر بستر پر لیٹ گئے اور اس کے بعد کوئی کام نہ کر سکے۔

ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ نے جو کیا وہ درست نہ تھا۔ میں نے ان کو ایک حدیث سنائی۔ ایک قبیلہ کا سردار مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جاؤ اس کا استقبال کرو۔ اس موقع پر آپ نے ایک اصولی بات یہ فرمائی کہ: انزلوا الناس منازلھم۔ یعنی لوگوں کے ساتھ ان کے رتبہ کے مطابق معاملہ کرو (حیاۃ الصحابہ ۲/۲۰۹)

شریعت کے احکام سب کے سب فطرت پر مبنی ہیں۔ یہ خود فطرت کا تقاضا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا لحاظ کریں۔ کوئی شخص جب دوسرے شخص سے معاملہ کرے تو وہ اس طرح معاملہ کرے کہ دوسرا شخص اس کو اپنی تحقیر محسوس نہ کرے۔ ہر شخص یہ سمجھے کہ اس کو اس کے مقام کے مطابق مناسب عزت (due respect) دی جا رہی ہے۔ جس سماج میں یہ روایات ہوں اس سماج میں باہمی محبت بڑھتی ہے اور سماجی انتشار کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

یہ فطرت کا ایک اصول ہے اور قدیم زمانہ سے مختلف شکلوں میں اس کو دہرایا جاتا رہا ہے۔ اسی کو ایک انگریزی مثل میں اس طرح کہا گیا ہے کہ افسر ہمیشہ حق پر ہوتا ہے:

Boss is always right.

یہ گویا معاملاتی حکمت یا معاملاتی شریعت ہے۔ اس کا لحاظ کرنا ہر ایک کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ جس سماج میں اس کی رعایت نہ کی جائے وہ سماج کبھی اچھا سماج نہیں بن سکتا۔

جنت والے

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کیا چیز ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ جنت میں لے جائے گی۔ آپ نے جواب دیا کہ اللہ کا تقوی اختیار کرنا اور بہتر اخلاق (سئل رسول الله ﷺ عن اکثر ما یدخل الناس الجنة– قال تقوی الله وحسن الخلق) الترمذی۔

کسی آدمی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ دنیا میں ایسی زندگی گذارے کہ جب وہ مر کر اگلی دنیا میں پہنچے تو وہاں اس کو جنت میں رہنا نصیب ہو، وہ وہاں ابدی خوشیوں کی زندگی پا سکے۔ اسی کامیاب زندگی کا راز اس حدیث میں بتایا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز تقوی کی روش ہے۔ یعنی خدا کو بڑا مان کر اس سے ڈرتے رہنا۔ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھنا۔ یہ یقین کرنا کہ میں کسی بھی حال میں خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ میرے کھلے اور چھپے تمام احوال خدا کے علم میں ہیں۔ میری کوئی بھی تدبیر مجھ کو خدا سے بچانے والی نہیں۔

یہ یقین جس آدمی کے دل میں آجائے اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ آزاد زندگی کو چھوڑ کر پابند زندگی اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنے آپ کو غیر ذمہ دارانہ روش سے بچاتا ہے۔ اور ذمہ دارانہ روش کو اختیار کرتا ہے۔ یہ عقیدہ اس سے گھمنڈ اور انانیت جیسے جذبات کو چھین لیتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا کا فرماں بردار بندہ بن جاتا ہے۔

جنتی انسان کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کا کردار جنتی کردار بن جاتا ہے۔ لوگوں کے درمیان وہ اسی دنیا میں اس طرح رہنے لگتا ہے جس طرح آخرت میں جنت کے باشندے آپس میں رہیں گے۔ اس کے دل میں لوگوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی زبان میٹھے بول سے تر رہتی ہے۔ وہ لوگوں سے اس طرح ملتا ہے جیسے ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی سے ملے۔ دوسروں سے معاملہ کرنے میں وہ ہمیشہ انصاف پر قائم رہتا ہے۔ جب بھی وہ لوگوں سے کوئی معاملہ کرتا ہے تو اس وقت اخلاقی اور انسانی اصول اس کے رہنما ہوتے ہیں نہ کہ محض ذاتی مفادات۔

خطرناک کھیل

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **لا یرمی رجل رجلا بالفسق ولا یرمیه بالکفر الا ارتدت علیه ان لم یکن صاحبه کذلك (مسند الامام احمد بن حنبل، الجزء الخامس، صفحه ۱۸۱)** جب بھی ایک آدمی دوسرے آدمی پر کافر یا فاسق ہونے کا الزام لگاتا ہے تو ضرور یہ الزام خود قائل کی طرف لوٹ آتا ہے اگر دوسرا آدمی ویسا نہ ہو۔

ایک واعظ اگر نام کے تعین کے بغیر نصیحت کرے اور یہ کہے کہ لوگوں کا کیا حال ہو گیا ہے کہ وہ کفر اور فسق جیسے اعمال میں مبتلا ہو رہے ہیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی عمومی نصیحت کی مثال خود رسول اللہ ﷺ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ لیکن نام کے تعین کے ساتھ اگر کسی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ کافر ہے یا فاسق ہے یا مرتد ہے یا بت پرست ہے، تو یہ ایک بے حد خطرناک کھیل ہوگا۔ ایسا قول اگر اللہ کے علم کے مطابق شخص مذکور کے لئے درست نہ قرار پاتا ہو تو وہ فضا میں تحلیل نہیں ہو گا بلکہ وہ لوٹ کر خود قائل کی طرف آجائے گا۔ یعنی قائل نے دوسرے شخص پر جو الزام لگایا ہے وہی الزام خدا کے رجسٹر میں خود قائل کے خانہ میں لکھ دیا جائے گا۔ اور آخرت میں اس کا انجام برعکس طور پر وہی ہو گا جس کا مستحق اس نے دوسرے کو ٹھہرانے کی کوشش کی تھی۔

یہ بلاشبہ ایک بے حد سنگین بات ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کسی کے بارے میں اس طرح کے سخت الزامی الفاظ بولنے سے آخری حد تک پرہیز کرے۔ اس طرح کے معاملات میں بولنے سے زیادہ بہتر ہے چپ رہنا اور اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے لئے بولنا ضروری ہو گیا ہے تو اس پر فرض کے درجہ میں لازم ہو گا کہ وہ کسی کے بارے میں ایسا سخت حکم لگانے سے پہلے اس کے بارے میں ہزار بار سوچے۔ وہ آخری ممکن حد تک اس کی تحقیق کرے اسی کے ساتھ وہ اس کے بارے میں اہل علم اور اہل تقوی سے مشورہ کرے۔ ان سارے تحقیقی

اور احتیاطی مراحل سے گزرنے کے بعد بھی اگر اس کا ضمیر مطمئن ہو کہ اس معاملہ میں اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بولے اور اپنے اس قول کی بنا پر وہ اللہ کے یہاں پکڑا نہیں جائے گا تو اس کے بعد وہ بول سکتا ہے۔ اگر چہ پھر بھی مذکورہ اندیشہ بدستور باقی رہے گا۔ کیونکہ موجودہ دنیا میں مومن کی ذمہ داری نصیحت اور تبلیغ ہے نہ کہ دوسروں کے بارے میں کافر اور فاسق اور مرتد اور بت پرست ہونے کا اعلان کرنا۔

آسٹریلیا کا ایک قدیم ہتھیار ہے جو بومرینگ (boomerang) کہا جاتا ہے۔ اس کی صفت یہ ہے کہ پھینکنے کے بعد اگر وہ نشانہ پر نہ لگے تو وہ خود پھینکنے والے کی طرف لوٹ آئے گا۔ اسی سے بومرینگ افکٹ کی اصطلاح بنی ہے۔ اس سے مراد ایک ایسا عمل ہے جو خود عامل کے اوپر الٹا پڑے۔

اس اصطلاح کو اگر استعمال کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ کسی شخص کو کافر یا فاسق یا مرتد یا بت پرست کہنا ایک بومرینگ کھیل ہے۔ یہ ایک ایسا خطرناک پتھر ہے جو اگر نشانہ پر نہ لگے تو وہ خود پھینکنے والے پر آکر گرے گا۔

عباسی خلافت کے دور میں عقلی بحثوں کا ہنگامہ شروع ہوا۔ اشاعرہ اور معتزلہ اور متکلمین کے درمیان غلو کی حد تک شدید بحثیں جاری ہو گئیں۔ ہر ایک دوسرے کے خلاف سخت ترین الفاظ بولنے لگا۔ مثلاً اہل نقل نے اہل عقل کے خلاف فتوی دیا کہ **من تمنطق فقد تزندق** (جس نے علم منطق سیکھا وہ زندیق ہو گیا) دوسری طرف اہل عقل (معتزلہ) نے یہ کہنا شروع کیا کہ جو شخص قرآن کو قدیم مانے وہ کافر ہے۔

تکفیر و تفسیق کا یہ ہنگامہ کئی سو سال تک جاری رہا یہاں تک کہ علماء کے درمیان عقائد کا یہ مسئلہ مسلمہ طور پر مان لیا گیا کہ: **لا نکفر احداً من اهل القبلة** (اہل قبلہ میں سے کسی کو ہم کافر نہیں کہتے) یعنی جو شخص قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا ہو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا

ہے کسی بھی حال میں اس کی تکفیر نہ کرو کیونکہ ایسا کوئی مسلمان نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہو سکتا جو کعبہ کے بجائے کاشی یا ویٹکن کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کو کافر یا مرتد یا بت پرست کہنا سرے سے کوئی دینی کام ہی نہیں۔ اسلام میں عمل کی بنیاد نیت پر رکھی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر یا مرتد یا بت پرست وہ آدمی ہے جو اپنی نیت کے اعتبار سے اس قسم کا برا فعل کرے، اور نیت کا علم چونکہ صرف خدا کو ہے اس لئے کسی اور کا یہ کام ہی نہیں کہ وہ دوسروں پر اس قسم کا الزامی ٹھپہ لگانا شروع کر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسا الزامی ٹھپہ لگانا سادہ طور پر صرف ایک گناہ نہیں ہے، بلکہ وہ بدترین قسم کی سرکشی ہے۔ وہ خدا کے قلم کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش ہے۔ جو آدمی ایسی کوشش کرے وہ خدا کے قلم کو حاصل کرنے میں تو کامیاب نہیں ہوگا، البتہ وہ خدا کے یہاں سرکشی کا مجرم قرار پائے گا اور جو سزا وہ دوسرے شخص کو دینا چاہتا تھا، اس کو وہ خود زیادہ بری شکل میں بھگتنے پر مجبور ہو جائے گا۔

مومن کا کام تکفیر نہیں ہے بلکہ تبلیغ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو نظر آئے کہ فلاں شخص کے اندر ایک برائی پیدا ہو گئی ہے تو آپ اس سے ملیں اور خیر خواہی اور نصیحت کے انداز میں اس کو سمجھائیں۔ اس کی اصلاح کے لئے خدا سے دعا کریں۔ حتی کہ اگر وہ آپ کے کہنے پر اصلاح قبول نہ کرے تب بھی آپ کے لئے جائز نہیں کہ آپ اس کے خلاف تکفیر کا فتویٰ جاری کریں۔ مومن کا کام صرف نصیحت کرنا ہے۔ اس کے بعد بقیہ معاملات کا تعلق خدا سے ہے وہی جس کو چاہے گا سزا دے گا اور جس کو چاہے گا بخشش سے سرفراز کرے گا۔

تکفیر و تفسیق کا ہنگامہ صرف وہی شخص جاری کر سکتا ہے جس کا سینہ خدا کے خوف سے خالی ہو۔ جو آدمی خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو اس کا طریقہ ہمیشہ احتساب خویش کا ہوتا ہے نہ کہ احتساب غیر کا۔

جہادِ اکبر

حدیث میں آیا ہے کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس کے خلاف جہاد کرے (احمد، الترمذی)۔ اپنے آپ کو برے جذبات سے اور برے اعمال سے روکنا بے حد مشکل کام ہے۔ اس کے لئے اپنی خواہشات سے لڑنا پڑتا ہے۔ اس لئے اس کام کو اسلام میں جہاد اکبر کہا گیا ہے۔

صوفیوں کی زندگی اسی جہاد اکبر کا نمونہ ہے۔ اس جہاد میں خود اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ نفرت، حسد، گھمنڈ، بدخواہی، غصہ اور منفی سوچ جیسی برائیوں کو اپنے اندر سے نکالنے کے لئے خود اپنے آپ سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس جہاد کے نتیجہ میں وہ انسان بنتا ہے جس کو قرآن میں ربانی انسان کہا گیا ہے۔ سماج میں امن اور محبت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ خیر خواہی اور انسانی احترام کا ماحول قائم ہوتا ہے۔ ہر قسم کی مثبت قدریں فروغ پاتی ہیں۔ انسانی تعمیر کا کام موافق ماحول میں ہونے لگتا ہے۔

اس کے برعکس سیاسی لیڈر جس جہاد کی نمائندگی کرتے ہیں وہ دراصل جہاد کے نام پر فساد ہے۔ اس خود ساختہ سیاسی جہاد میں دوسروں کے خلاف لڑائی چھیڑی جاتی ہے۔ اس میں نفرت اور تشدد پھیلتا ہے۔ امن وسکون ختم ہو جاتا ہے۔ قیمتی جانیں ہلاک ہوتی ہیں۔ انسانوں کو بےعزت کیا جاتا ہے۔ تعمیر وترقی کے تمام کام ٹھپ ہو جاتے ہیں۔ اس کے ذریعہ کوئی نئی چیز حاصل نہیں ہوتی اور جو کچھ حاصل تھا وہ بھی کھو دیا جاتا ہے۔

سیاسی لیڈروں کا یہ نام نہاد جہاد قرآن کی اس آیت کا مصداق ہے: ''اور جب وہ پھرتا ہے تو زمین میں سرگرم ہوتا ہے تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلائے اور کھیتوں اور جانوں کو ہلاک کرے۔ حالاں کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا'' (البقرہ ۲۰۵) معلوم ہوا کہ جو سرگرمی اپنے نتیجہ کے اعتبار سے فساد اور خوں ریزی کا سبب بنے وہ اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح سچے اسلامی جہاد کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسانی سماج کے لئے رحمت اور برکت کا ذریعہ ثابت ہو۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ سے واپس ہر کر مدینہ آئے تو آپ نے فرمایا کہ: رجعنا من الجهادِ الاصغر الی الجهاد الاکبر (ہم چھوٹے جہاد سے لوٹ کر بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں)۔ یعنی پہلے اگر ہمارا مقابلہ خارجی دشمن سے تھا تو اب ہمارا مقابلہ داخلی نفس سے ہے۔ اور پہلے کے مقابلہ میں یہ دوسرا مقابلہ بلاشبہہ زیادہ سخت ہے۔

اگر آپ قوم کے دشمن سے لڑیں تو آپ پوری قوم کے نمائندے اور ہیرو بن جاتے ہیں۔ پوری قوم میں آپ کو عزت کا درجہ مل جاتا ہے۔ لیکن دل کے اندر پیدا ہونے والی نفسیاتی برائیوں کو کچلنا ایک ایسا جہاد ہے جس کو خدا کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ داخلی جہاد زیادہ بڑا ہے اور اس کا انعام بھی بہت زیادہ ہے۔

کبر کی علامت

ایک شخص اگر کسی آدمی پر بے بنیاد الزام لگائے، اس کو غلط طور پر بدنام کرے۔ اس کو لوگوں کے سامنے ذلیل کرے، تو یہ بلاشبہہ ایک بدترین گناہ ہے۔ اب ایک شخص وہ ہے جس کو غلطی کرنے کے بعد اس کو اپنی غلطی کا احساس ہی نہ ہو۔ ایسا آدمی اللہ کی نظر میں مبغوض ترین انسان ہے۔ اس کو کبھی اللہ کا قرب حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شخص وہ ہے جسے بعد کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے خواہ یہ احساس اپنے ضمیر کی بنیاد پر ہوا ہو یا فریق ثانی کی وضاحت اور دلائل کی بنیاد پر۔ اب یہ شخص اگر ایسا کرے کہ اپنے ظاہری رویہ کو بدل لے اور فریق ثانی سے دوبارہ اپنے تعلق کو بحال (patch up) کرلے تو اس کا ایسا کرنا صرف ایک سماجی فعل ہوگا۔ دینی معنوں میں وہ کوئی عبادتی فعل نہ ہوگا۔

جب کوئی شخص مذکورہ قسم کا مجرمانہ فعل کرتا ہے تو یہ دراصل کبر کی نفسیات کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہ اظہارِ کبر کا ایک معاملہ ہوتا ہے نہ کہ سادہ طور پر محض سماجی آداب کی خلاف ورزی کا معاملہ۔ ایسی حالت میں اگر وہ شخص صرف یہ کرے کہ عملی طور پر فریق ثانی سے اپنے تعلق کو بحال کرلے تو اس کے ایسا کرنے سے برائی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اصل برائی جس کا اس نے ارتکاب کیا وہ تو تکبر تھا۔ پھر سماجی آداب کی سطح پر ازالہ کرنے سے اصل جرم کا ازالہ کیسے ہو سکتا ہے۔

جب ایک شخص مذکورہ قسم کا جرم کرنے کے بعد صرف یہ کرے کہ وہ ظاہری طور پر فریق ثانی سے تعلق کو بحال کرلے مگر اپنی زبان سے غلطی کا کھلا اعتراف نہ کرے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا اصل جرم (تکبر) بدستور اس کے سینہ کے اندر موجود ہے۔ کیوں کہ اگر اس کا دل تکبر سے خالی ہوتا تو اس کو اس وقت تک تسکین نہ ملتی جب تک وہ اپنی زبان سے اس کا اقرار نہ کرلیتا۔

قولی اعتراف آدمی کے متواضع ہونے کا ثبوت ہے اور قولی اعتراف نہ کرکے ظاہری تعلق کو بحال کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی متکبرانہ نفسیات میں جی رہا ہے۔ وہ اپنے کبر کے

بت کو توڑنے کے لئے تیار نہیں۔

اس معاملہ کی ایک مثال قرآن کی سورۃ نمبر ۱۲ میں ملتی ہے۔ امرأۃ عزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام پر ایک بے بنیاد الزام لگایا۔ بعد کو حقیقت ظاہر ہوئی تو اس نے کھلے طور پر کہا کہ ''اب حق واضح ہو گیا۔ اس معاملہ میں غلطی میری ہی تھی اور یوسف بلاشبہہ سچے ہیں'' (یوسف ۵۱)

حق کی وضاحت کے بعد اگر امرأۃ عزیز صرف یہ کرتی کہ ظاہری طور پر اپنی روش کو درست کر لیتی اور زبان سے اس کا اعلان نہ کرتی تو اس کا جرم کبھی ختم نہ ہوتا۔ مگر جب اس نے اپنی زبان سے کہا کہ ساری غلطی میری ہے اور یوسف بلاشبہہ بری الذمہ ہیں تو اس کا جرم معاف ہو گیا اور اس کا درجہ بلند ہو گیا۔

اسلامی شریعت کے مطابق، کبر ایک ایسی روش ہے جو اللہ کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر**۔ (مشکاۃ المصابیح ۳/ ۱۴۱۳) یعنی وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل کے اندر ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہو۔ کبر کی پہچان کیا ہے۔ حدیث کے مطابق، کبر کی پہچان یہ ہے کہ آدمی کے سامنے ایک حق بات پیش کی جائے مگر وہ اس کو صرف اس اندیشہ کی بنا پر نظر انداز کر دے کہ اس کو قبول کرنے کی صورت میں اس کی حیثیت عوام کی نظر میں گھٹ جائے گی۔ وہ کسی ایسے حق کو ماننے کے لئے تیار نہ ہو جو بظاہر اس سے کمتر کسی آدمی کی طرف سے پیش کیا گیا ہو۔

اس دنیا میں ہر قسم کی بڑائی صرف ایک اللہ کو حاصل ہے، اس کے سوا کسی کو کسی بھی قسم کی کوئی بڑائی حاصل نہیں۔ اگر بظاہر کوئی بڑا دکھائی دیتا ہے تو وہ صرف اس کے امتحان کا ایک پرچہ ہے نہ کہ اس کی واقعی حیثیت کا اظہار۔ ایسی حالت میں جو شخص بڑائی پا کر جھک جائے وہ امتحان میں پورا اترا۔ اور جو شخص بڑائی پا کر متکبر بن جائے وہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ اللہ کے یہاں اس کے لئے ذلت کی سزا کے سوا اور کچھ نہیں۔

قاتل انسانیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ایاکم والحسد، فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔** (ابوداؤد، کتاب الأدب، باب الحسد، ابن ماجہ، کتاب الزہد) یعنی تم حسد سے بچو، کیوں کہ حسد اسی طرح نیکیوں کو کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: **لا یجتمعان فی قلب عبدِ الایمان والحسد** (انسائی، کتاب الجہاد) یعنی کسی بندے کے دل میں ایمان اور حسد جمع نہیں ہو سکتے۔

حسد قاتلِ ایمان اور قاتل انسانیت ہے۔ حسد کا نقصان یہ ہے کہ وہ آدمی سے اعلیٰ ایمانی کیفیات کو چھین لیتا ہے۔ حسد اس میں رکاوٹ بن جاتا ہے کہ آدمی کے سینہ میں وہ دینی جذبات پرورش پائیں جو اس کو اللہ کے قریب کرنے والے ہیں اور جس کا انعام اس کو جنت کی صورت میں ملے گا۔

موجودہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ کبھی ایک شخص بظاہر بڑا ہو جاتا ہے اور دوسرا شخص بظاہر چھوٹا۔ یہ امتحان کے لئے ہوتا ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ اس فرق کو خدائی فیصلہ سمجھ کر اسے قبول کر لیا جائے مگر جب آدمی بڑے کی بڑائی کا اعتراف نہ کرے اور اس کو چھوٹا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جائے تو گویا کہ وہ خدا کے فیصلہ کو بدلنا چاہتا ہے۔ ایسا آدمی خدا کی قربت کی لذتوں سے محروم رہے گا۔

حقوق العباد کے سلسلہ میں سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی کے دل میں دوسرے انسانوں کے لئے شفقت اور ہمدردی کا جذبہ ہو مگر حسد آدمی کے اندر سے انسانی ہمدردی کا جذبہ ختم کر دیتا ہے۔ اس کا نقصان اس کو اس بدترین صورت میں ملتا ہے کہ وہ اس حدیث کا مصداق بن جاتا ہے: **لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس** (البخاری، کتاب التوحید) یعنی اللہ اس آدمی پر رحم نہیں کرے گا جو انسانوں پر رحم نہ کرے۔

قرآن میں تقویٰ کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ کسی سے دشمنی ہو تب بھی آدمی اس کے بارے

میں عدل وانصاف کی بات کہے (المائدہ ۸) مگر جس آدمی کے دل میں کسی کے خلاف حسد اور جلن ہو اس کے بارے میں انصاف کی بات کہنا اس کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ حسد کا جذبہ اس کو مجبور کرے گا کہ وہ اپنے محسود کے بارے میں وہ بات کہے جس میں اس کے دل کو تسکین ملتی ہو نہ کہ وہ بات جو بطور واقعہ درست ہو۔ اس طرح حسد آدمی کو خدا کی نظر میں ظلم اور بے انصافی کا مجرم بنا دے گا۔

انسانیت کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر موضوعیت (objectivity) ہو۔ وہ لوگوں کے بارے میں غیر جانبدارنہ رائے قائم کرے۔ وہ معاملات کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھ سکے۔ اس قسم کی حقیقت پسندی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ مگر حسد آدمی کے لئے اس میں مانع بن جاتا ہے کہ وہ بے آمیز رائے قائم کر سکے۔ حسد آدمی کے اندر متاثر ذہن پیدا کر دیتا ہے، اور متاثر ذہن کے ساتھ آدمی کبھی کوئی بڑی ترقی نہیں کر سکتا۔ حسد بلاشبہہ خود حاسد کے لئے سب سے بڑی محرومی ہے۔

قرآن وحدیث کے مطابق صدقہ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ اس صدقہ کا تعلق صرف مال سے نہیں ہے بلکہ دل اور زبان سے بھی ہے۔ یہ بھی ایک عظیم صدقہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے انسان کے بارے میں اچھی رائے رکھے۔ وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ وہ اچھے الفاظ میں اس کا تذکرہ کرے۔ وہ اس کہ حق میں نیک دعائیں کرے۔ مگر جب ایک آدمی کے دل میں دوسرے انسان کے لئے حسد کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ اس عظیم نیکی سے محروم ہو جائے گا۔ اس کی زبان دوسرے انسان کے لئے کھلے گی تو اس کی برائی کے لئے کھلے گی نہ کہ اس کی بھلائی کے لئے۔ اس کا سینہ ایسے انسان کے خلاف نفرت سے بھر جائے گا۔ اس طرح حسد ایک آدمی کو اس آخری نیکی سے بھی محروم کر دیتا ہے کہ وہ کسی کے حق میں کلمۂ خیر بول سکے۔ یہ ایک ایسی محرومی ہے جس سے بڑی محرومی شاید کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

ذکر و دعا

اللہ کا ذکر

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کون لوگ ہیں جن کا درجہ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے افضل ہوگا۔ فرمایا کہ اللہ کا بہت زیادہ ذکر کرنے والے (ان رسول الله ﷺ سئل ای العباد افضل درجة عند الله یوم القیامة قال الذاکرین الله کثیراً) الترمذی، کتاب الدعوات۔

ذکر کا مطلب کسی قسم کا لفظی ورد نہیں ہے۔ اس کا مطلب اللہ کی یاد ہے۔ اللہ کی یاد پورے دین کا خلاصہ ہے۔ بندہ جب اپنے رب کو اس کی عظمت وجلال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو یہ دریافت اس کی پوری شخصیت کے اندر ایک ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے دل میں خدا کی یاد کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ اندرونی کیفیت بار بار تکبیر وتحمید کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

اسی بے تابانہ یاد کا نام ذکر ہے۔ اس ذکر کا کوئی وقت متعین نہیں، وہ ہر حال میں آدمی کی زبان پر جاری رہتا ہے، خواہ گھر کے اندر ہو یا مسجد میں ہو یا میدان جہاد میں۔ یہ ذکر بلاشبہہ تمام اعمال میں سب سے افضل عمل ہے۔ الترمذی کی ایک اور روایت میں ہے کہ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو وہاں خوب چرلو۔ پوچھا گیا کہ جنت کے باغ کیا ہیں۔ فرمایا کہ ذکر کے حلقے (اذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا۔ قالوا وما ریاض الجنة۔ قال حلق الذکر)

الطبرانی نے یہ روایت کسی قدر لفظی فرق کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ اس میں ہے کہ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو خوب چرلو۔ پوچھا گیا کہ جنت کے باغ کیا ہیں۔ فرمایا کہ علم کی مجلسیں (اذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا۔ قالوا وما ریاض الجنة۔ قال مجالس العلم)

مجلس ذکر اور مجلس علم دونوں ایک ہیں۔ انفرادی ذکر جب اجتماعی ذکر کی صورت میں ہو تو اسی کا نام مجلس ذکر یا مجلس علم ہے۔

ایک دعا

حدیث کی کتابوں میں پیغمبر اسلام کی بہت سی دعائیں نقل کی گئی ہیں۔ یہ دعائیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اندرونی شخصیت کو بتاتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے سینہ میں کس قسم کے احساسات کا طوفان برپا رہتا تھا۔ ان کے اندر کی دنیا کس قسم کے جذبات وخیالات سے ہمیشہ آباد رہتی تھی۔ ان میں سے ایک دعا وہ تھی جو ان الفاظ میں آپ کی زبان سے نکلتی تھی: **اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه وارنا الاشياء كما هي** (اے اللہ ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس کی پیروی کی توفیق دے اور اے اللہ ہمیں باطل کو باطل کے روپ میں دکھا اور ہمیں اس سے بچنے کی توفیق دے۔ اور اے اللہ ہمیں چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں۔

موجودہ دنیا میں حقیقتوں کے اوپر اشتباہ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جو شخص صرف چیزوں کے ظاہر کو جانے وہ ان کو ان کی حقیقت کے اعتبار سے سمجھ نہیں سکتا۔ پیغمبر کو یہ احساس تڑپاتا ہے۔ وہ بیتابانہ اللہ کو پکار کر یہ کہنے لگتا ہے کہ اے اللہ مجھ کو حقیقت بینی کی نعمت عطا فرما تا کہ میں چیزوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھوں، میں ہر چیز کے بارے میں وہی درست رائے قائم کروں جو حقیقت واقعہ کے اعتبار سے ہونا چاہئے۔ صحیح فکر کے بغیر سچی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح صحیح فکر کے بغیر صحیح عمل کا ظہور بھی ممکن نہیں۔ یہی احساس تھا جو شدت اختیار کر کے مذکورہ قسم کی دعا میں ڈھل گیا تھا۔ یہ دعا ایک مومنانہ قلب کی تصویر ہے جو پیغمبر کے سینہ میں اعلیٰ ترین درجہ میں موجود ہوتا ہے۔

اس دنیا کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ آدمی کو حق باطل کے روپ میں دکھائی دے اور باطل اس کو حق کے روپ میں دکھائی دینے لگے۔ اس سے بچنا اسی آدمی کے لئے ممکن ہے جو اللہ کی توفیق سے اتنا باشعور ہو جائے کہ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو وہ گہرائی کے ساتھ دیکھنے لگے۔

خبر کی تحقیق

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ کوئی فاسق اگر تمہارے پاس کوئی سنگین خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کرلو (الحجرات ۶) صحیح مسلم کی ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع (مشکاۃ المصابیح ۱/۵۵)** یعنی کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے (اور پڑھے) اس کو وہ بلا تحقیق بیان کرنے لگے۔ اس معاملہ کی ایک مثال یہاں درج کی جاتی ہے۔

عربی زبان کا ایک لغت ''المنجد'' کے نام سے ہے۔ اس کو ایک مسیحی پادری لوئیس معلوف نے تیار کیا ہے۔ وہ لبنان میں ۱۸۶۷ میں پیدا ہوا اور ۱۹۴۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ ہمارے سامنے اس کتاب المنجد کا ۲۶ واں ایڈیشن ہے جو بیروت سے ۱۹۷۳ میں چھپا ہے۔

عربی زبان کی اس مشہور اور متداول لغت میں الطلقاء کا مفہوم ان الفاظ میں دیا گیا ہے: **الذین ادخلوا فی الاسلام کرھا** (صفحہ ۴۷۰) یعنی طلقاء سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اسلام میں جبراً داخل کیا گیا۔

اگر کوئی شخص مذکورہ کتاب کے اس بیان کو لے اور مزید تحقیق کے بغیر اس کو پھیلانے اور نقل کرنے لگے تو قرآن کی مذکورہ تعلیم کے مطابق، یہ سخت گناہ کی بات ہوگی کیوں کہ کسی بات کا ایک کتاب میں چھپ جانا اس کا ثبوت نہیں کہ وہ کوئی درست بات ہے۔ عین ممکن ہے کہ چھپنے کے باوجود وہ ایک بے بنیاد بات ہو۔ اخبار یا میگزین میں چھپنا تو درکنار، حوالہ کی کتاب (ریفرنس بک) میں شاندار طور پر چھپنا بھی اس کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں۔

اب اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک سراسر لغو اور بے بنیاد بات ہے۔ **طلقاء** عربی لفظ طلیق کی جمع ہے۔ اس کے معنی آزاد کے ہوتے ہیں۔ طلقاء کے معنی ہیں آزاد لوگ۔ **طلقاء** کا یہ لفظی مفہوم مذکورہ بیان کی کھلی تردید ہے۔ کیوں کہ جن لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا گیا ہو ان کا نام طلقاء

(آزاد) رکھنا سراسر نا قابل فہم بات ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حقیقی واقعات مذکورہ بیان کی قطعی تردید کرتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں الطلقاء کن لوگوں کو کہا گیا تھا، یہ ایک معلوم اور مشہور واقعہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ نبوت کے بیس سال بعد مکہ فتح ہوا۔ اس وقت یہاں کے تمام سردار آپ کے پاس لائے گئے۔ یہ لوگ مسلمہ طور پر جنگی مجرم کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے ان کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی۔ اور نہ ان کے ساتھ تشدد کا کوئی معاملہ کیا۔ اس کے بجائے آپ نے ان لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: **اذهبوا فأنتم الطلقاء** (**البداية والنهاية لإبن كثير، الجزء الرابع** صفحہ ۳۰۱) یعنی جاؤ، پس تم لوگ آزاد ہو۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ المنجد میں چھپی ہوئی بات اصل واقعہ کے سراسر خلاف ہے۔ مگر اس کا غلط اور بے بنیاد ہونا صرف اس وقت معلوم ہوگا جب کہ علمی اصول کے مطابق اس کی تحقیق کی جائے۔ اس بیان کا غلط ہونا المنجد کے صفحات میں نہیں ملے گا بلکہ اس خارجی مواد میں ملے گا جو اس بیان سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، الطلقاء کی لغوی اور تاریخی تحقیق سے نہ کہ صرف المنجد کے مذکورہ صفحہ کے پڑھنے سے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کوئی آدمی ایک سنگین بات کو سنے یا پڑھے تو اس کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اس کو سن کر یا پڑھ کر مان لے اور اس کو لوگوں کے درمیان پھیلانے لگے۔ اگر آدمی کے اندر اللہ کا ڈر ہے تو اس کو اللہ کی پکڑ کے اندیشے سے ایسے فعل سے بچنا چاہئے۔

قرآن وحدیث کے مطابق یہ ایک مجرمانہ فعل ہے۔ کوئی آدمی اگر سنی یا پڑھی ہوئی خبر کی تحقیق نہ کرنا چاہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ چپ رہے نہ کہ وہ بلا تحقیق بولنے لگے۔ ایسی حالت میں چپ رہنا تو آدمی کے لئے قابل معافی ہوسکتا ہے مگر بولنا ہرگز اس کے لئے قابل معافی نہیں۔

بری خبر کی تحقیق کرنا فرض ہے، اور بری خبر کو تحقیق کے بغیر بیان کرنا حرام ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو شریعت اسلامی کے اس اہم مسئلہ کو جانتے ہوں۔

حمد اور تضرع

عن ابی اُمامة ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ۔ عَرَضَ عَلَیَّ رَبِّی لِیجعل لی بَطحاءَ مکةَ ذَھَباً ، فقلتُ : لا یا رَبِّ ، و لٰکِن اَشبعُ یوماً و اَجُوعُ یَوماً ۔ فاذا اجعتُ تَضَرَّعتُ الیك و ذکرتُك ، و اذا شبعتُ حمدتُك وشکرتُك

(رواہ احمد و الترمذی)

حضرت ابو امامہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے رب نے میرے سامنے یہ پیش کش کی کہ مکہ کی وادی کو تمہارے لئے سونا بنا دیا جائے ۔ میں نے کہا کہ اے میرے رب ، نہیں ۔ بلکہ مجھے یہ پسند ہے کہ میں ایک دن کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں ۔ پس جب مجھے بھوک لگے تو میں تیری طرف عاجزی کروں اور تجھ کو یاد کروں ۔ اور جب مجھے سیری حاصل ہو تو میں تیری تعریف کروں اور تیرا شکر ادا کروں ۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے دو چیزیں مطلوب ہیں ۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی قدرت کا اعتراف کرکے اس کے آگے اپنے عجز کا اظہار کریں ۔ دوسرے یہ کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو محسوس کرکے اس پر شکر کرنے والے بن جائیں ۔ یہ دونوں باتیں نہایت وضاحت کے ساتھ قرآن وحدیث میں بتائی گئی ہیں ۔ مگر اس کا سب سے بڑا عملی تجربہ وہ ہے جو بھوک اور سیری کی صورت میں انسان کے ساتھ پیش آتا ہے ۔ جب آدمی کو بھوک لگتی ہے ، جب اس کو پیاس ستاتی ہے ، اس وقت اس کو آخری حد تک اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ کس قدر کمزور اور محتاج ہے ۔ اسی طرح جب بھوک پیاس کی شدت میں مبتلا ہونے کے بعد اس کو کھانا اور پانی ملتا ہے تو اس وقت اس کو آخری طور پر محسوس ہوتا ہے کہ کھانا اور پانی کتنی زیادہ قیمتی چیزیں ہیں ۔

اس دنیا میں آدمی کو بھوک کا تجربہ بھی ہونا چاہئے اور سیری کا بھی ۔ اس پر یہ کیفیت بھی گزرنی چاہئے کہ اس کا حلق پیاس کی وجہ سے سوکھ گیا ہو ، اور اسی کے ساتھ یہ کیفیت بھی کہ اس نے ٹھنڈا پانی پیا اور اس کے بعد اس کا وہ حال ہو گیا جس کو حدیث میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے :
ذھب الظمأ وابتلت العروق (پیاس چلی گئی اور رگیں تر ہو گئیں)

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہوتیں۔ روزہ اسی قسم کے حالات پیدا کرنے کی ایک سالانہ تدبیر ہے۔ روزہ کے ذریعہ آدمی کو بھوک اور سیری دونوں کا تجربہ کرایا جاتا ہے، تاکہ وہ خدا کے آگے عاجزی کرنے والا بھی بنے اور اسی کے ساتھ اس کا شکر کرنے والا بھی۔

قرآن میں روزہ کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے اگلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم پرہیزگار بنو .... رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا .... پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے، وہ اس کے روزے رکھے .... اور اللہ کی بڑائی کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی، اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو (البقرہ ۸۵-۱۸۳)

ان آیات میں روزہ کے دو خاص فائدے بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ روزہ آدمی کے اندر تقویٰ پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر کرنے والا بنے۔

قرآن میں جس دینی کیفیت کے لئے تقویٰ اور شکر کا لفظ استعمال ہوا ہے، اسی کو حدیث میں تضرع اور شکر کہا گیا ہے۔ یہی دونوں کیفیتیں عبدیت کی اصل ہیں۔ اللہ کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس آدمی کے اندر تضرع اور تقویٰ کے احساسات ابھارتا ہے۔ اور اللہ کے عطیات کا احساس اس کے اندر حمد اور شکر کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

اگر آدمی کا شعور بیدار ہو تو یہ دونوں کیفیتیں ہر روز ہر تجربہ سے آدمی کے اندر پیدا ہوتی رہیں گی۔ وہ ہر واقعہ سے یہ دونوں ربانی غذائیں حاصل کرتا رہے گا۔ پھر انھیں دونوں کیفیات کو مزید شدت اور عمومیت کے ساتھ حاصل کرنے کے لئے رمضان کے مہینہ کا روزہ مقرر کیا گیا ہے۔ رمضان کا روزہ گویا عمومی تربیت کا خصوصی کورس ہے۔

جذبۂ شکر کی حفاظت

رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ البخاری (کتاب الرقاق)، مسلم (کتاب الزہد)، الترمذی (کتاب اللباس)، ابن ماجہ (کتاب الزہد)، مسند احمد، وغیرہ۔ مسند احمد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **انظروا الی من هو أسفل منكم ولا تنظروا الی من هو فوقكم فانه أجدر أن لا تزدروا نعمة الله عليكم** (تم اس کو دیکھو جو تم سے نیچے ہے اور تم اس کو نہ دیکھو جو تم سے اوپر ہے، کیوں کہ اس طرح تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو کم نہیں سمجھو گے)

اس حدیث کی مزید تشریح ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔۔ ایک مرفوع روایت کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **خصلتان من كانتا فيه كتبه الله شاكراً صابراً، من نظر في دنياه الى من هو دونه فحمد الله على ما فضله به عليه، ومن نظر في دينه إلى من هو فوقه فاقتدىٰ به۔ وأما من نظر في دنياه إلى من هو فوقه فأسف على ما فاته فإنه لا يكتب شاكراً ولا صابراً** (فتح الباری ۱۱/۳۳۰)۔ یعنی دو صفتیں ہیں جو کسی کے اندر ہوں تو اللہ اس کو شاکر اور صابر لکھ دیتا ہے۔ جو دنیا کے معاملہ میں اس کو دیکھے جو اس سے کم ہے پھر وہ اللہ کا شکر کرے اس نعمت پر جو اللہ نے اسے دی ہے۔ اور جو اپنے دین کے معاملہ میں اس کو دیکھے جو اس کے اوپر ہے پھر وہ اس کی پیروی کرے۔ مگر جو اپنی دنیا کے معاملہ میں اس کو دیکھے جو اس کے اوپر ہے پھر وہ اس پر افسوس کرے جو اس سے کھویا گیا تو وہ نہ شاکر لکھا جائے گا اور نہ صابر لکھا جائے گا۔

شکر سب سے بڑی عبادت ہے۔ کسی بندے سے جو چیز سب سے زیادہ مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کو ایک عظیم منعم کے طور پر دریافت کرے۔ اللہ کی نعمتوں کے احساس سے اس کا سینہ بھرا ہوا ہو۔ اس کی روح میں شکر کا ابدی چشمہ جاری ہو جائے۔ وہ اللہ کو ایک ایسی ہستی کے طور پر پائے جو اس پر بے پایاں نعمتوں کی بارش کر رہا ہے۔ یہ شعور اتنا زیادہ قوی ہو کہ کسی بھی حال میں اس کا سینہ شکر خداوندی کے احساس سے خالی نہ ہو۔

مگر یہ کوئی آسان بات نہیں۔ اپنے آپ کو شکر کے جذبہ سے سرشار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی کا شعور اس معاملہ میں پوری طرح زندہ ہو۔ وہ اس کا مسلسل اہتمام کرے۔ وہ کسی ایسے خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دے جو اس کے جذبہ شکر کو مجروح کرنے والا ہو۔ وہ سب کچھ برداشت کرلے مگر وہ اپنے جذبہ شکر کا کٹاؤ (erosion) کبھی برداشت نہ کرے۔

موجودہ دنیا میں فطری طور پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان نابرابری قائم رہتی ہے۔ اس بنا پر ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ مادی اعتبار سے کوئی اس سے کم ہے اور کوئی اس سے زیادہ۔ اب اگر آدمی اپنا مقابلہ اس شخص سے کرے جو بظاہر اس سے زیادہ ہے تو اس کے اندر کمتری کا احساس پیدا ہوگا اور اس کا جذبہ شکر دب کر رہ جائے گا۔ اس لیے آدمی کو ایسا کبھی نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اپنا موازنہ اس سے کرے جو مادی اعتبار سے بظاہر اس سے زیادہ ہے۔ اس کے بجائے آدمی کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنا موازنہ ان لوگوں سے کرے جو مادی اعتبار سے اس سے کم ہیں۔ اس طرح اس کا جذبہ شکر زندہ رہے گا۔ اس کا دل کبھی نعمت کے احساس سے خالی نہ ہو سکے گا۔

موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ تمام لوگ مادی اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے۔ کوئی زیادہ ہوتا ہے اور کوئی کم، کوئی پیچھے ہوتا ہے اور کوئی آگے، کوئی طاقت ور ہوتا ہے اور کوئی کمزور۔ اس قسم کے تمام فرق امتحان کی مصلحت کی بنا پر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ آدمی مختلف قسم کے حالات سے گزرے، مگر وہ حالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنے ایمانی شعور کو زندہ رکھے۔

وہ ناشکری والے حالات سے دوچار ہو، پھر بھی اس کے شکر کے جذبہ میں کوئی کمی نہ آئے۔ وہ بے اعترافی کی صورت حال سے گذرے، مگر وہ اپنے اعتراف کی صفت کو نہ کھوئے۔ وہ منفی جذبات پیدا کرنے والے حالات سے دوچار ہو، اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مثبت طرز فکر پر قائم رکھے۔ شکر وہ سب سے قیمتی متاع ہے جس کو انسان اپنے رب کے سامنے پیش کرسکتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل مند انسان وہ ہے جو اپنے سینہ کو شکر کے احساس سے خالی نہ ہونے دے، حتی کہ انتہائی غیر موافق صورت حال میں بھی۔

محبت صرف اللہ کے لئے

محبت کا جذبہ انسان کے اندر سب سے زیادہ اعلیٰ جذبہ ہے۔ایک شخص کسی دوسرے کو جو سب سے زیادہ قیمتی تحفہ دے سکتا ہے وہ یہی محبت کا تحفہ ہے۔موجودہ دنیا میں کسی انسان کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے محبت کے جذبہ کو کسی اور طرف بھٹکنے نہ دے۔وہ صرف اللہ کو اپنے جذبات محبت کا مرکز بنائے۔کسی اور چیز کو اپنے حب شدید کا مرکز بنانا،قرآن کی زبان میں،اس کو اللہ کے برابر ٹھہرانا ہے۔اللہ کی اس دنیا میں جو آدمی کسی اور چیز کو اللہ کے برابر ٹھہرائے وہ اللہ کے نزدیک سراسر بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہئے۔اور جو ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔اور اگر یہ ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ زور سارا کا سارا اللہ کا ہے اور اللہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔(البقرہ ۱۶۵)

دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر انسان کے اندر ان کے لئے محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔مگر یہ چیزیں اس لئے نہیں ہیں کہ آدمی ان کے ساتھ حقیقی محبت کا تعلق قائم کرے۔یہ چیزیں صرف برائے آزمائش ہیں۔اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسانوں میں سے کون ہے جو ان چیزوں کو اپنا محبوب بناتا ہے اور وہ کون ہے جو ان سے اوپر اٹھ جاتا ہے،اس کے لئے کوئی چیز اللہ کے ساتھ حب شدید میں رکاوٹ نہیں بنتی۔اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

لوگوں کے لئے خوش نما کر دی گئی ہے محبت خواہشوں کی ــــــ عورتیں،بیٹے،سونے چاندی کے ڈھیر،نشان لگے ہوئے گھوڑے،مویشی اور کھیتی،یہ دنیوی زندگی کے سامان ہیں۔اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے،کہو،کیا میں تم کو بتاؤں اس سے بہتر چیز،ان لوگوں کے لئے جو ڈرتے ہیں۔ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں ہوں گی۔وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔اور پاکیزہ بیویاں

ہوں گی اور اللہ کی رضامندی ہوگی اور اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے بندے۔(آل عمران ۱۴۔۱۵)

موجودہ دنیا میں ایک اندیشہ یہ ہے کہ آدمی سے اس کی کوئی محبوب چیز کھو جائے، اور پھر اس کی یاد میں وہ اپنے آپ کو اتنا زیادہ ہلکان کر لے کہ اس کے دل میں اللہ کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے۔ اس لئے اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر چیز کو اللہ کی ملک سمجھو اور اس کے کھوئے جانے پر یہ سوچ کر صبر کر لو کہ جب تک اللہ نے چاہا وہ چیز میرے پاس رہی اور جب اللہ نے چاہا وہ چیز مجھ سے جدا ہوگئی۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کے ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔(البقرہ ۱۵۵۔۱۵۶)

محبت کے جذبہ کو گہرائی کے ساتھ اللہ سے وابستہ رکھنے کے لئے ایک اور خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ انسان کو پیشگی طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ آخری انجام کے اعتبار سے یہ چیزیں سراسر بے حقیقت ہیں۔ آج کی زندگی میں جو چیز آدمی کو بہت خوشنما نظر آتی ہے اور وہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے، موت کے بعد والی ابدی زندگی میں ان کے اندر اس کے لئے کشش نہ ہوگی۔ حقیقت کھلنے کے بعد آدمی ان چیزوں سے اس طرح بھاگے گا جیسے کہ وہ اس کے لئے بہت بڑی مصیبت ہوں۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

پس جب وہ کانوں کو بہرہ کر دینے والا شور برپا ہوگا۔ جس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے، اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ ان میں سے ہر شخص کو اس دن ایسا فکر لگا ہوگا جو اس کو کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے، خوشی کرتے ہوئے اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اڑ رہی ہوگی، ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی لوگ منکر ہیں، ڈھیٹ ہیں۔(العبس ۳۳۔۴۲)

دنیا کی جو چیزیں اپنی ظاہری خوش نمائی کی بنا پر انسان کو فریب میں مبتلا کرتی ہیں، ان کے

بارے میں قرآن وحدیث میں کثرت سے ایسے حوالے ہیں جو ان چیزوں کی اصل حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مال کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تم ساری زندگی اس کوشش میں لگے رہتے ہو کہ تمہارے پاس مال کا انبار اکٹھا ہو جائے۔ حالانکہ تم بہت جلد اس طرح مر جاتے ہو کہ مال کا کوئی حصہ تمہارے ساتھ نہیں جاتا۔ چنانچہ فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص نے تم کو غفلت میں رکھا، یہاں تک کہ تم مر کر قبروں میں پہنچ گئے۔ (التکاثر ۱۔۲)

اسی طرح عورت ہر زمانہ میں اس کا سبب بنی رہی ہے کہ وہ انسان کی توجہ کو حق سے ہٹا دے۔ انسان عورت کی محبت میں اتنا زیادہ گم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: مار أیت من ناقصات عقل و دین اغلب للب الرجل الحازم من احداکن (مسلم، کتاب الایمان) یعنی میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو ناقص عقل اور ناقص دین کے باوجود ایک دانش مند آدمی کی عقل پر اتنی زیادہ غالب آجائے۔

انسان کے پاس اپنے رب کے سامنے پیش کرنے کے لئے جو سب سے قیمتی اثاثہ ہے، وہ یہی محبت کا اثاثہ ہے۔ آخرت میں وہی شخص کامیاب ہوگا جس کے بارے میں زمین و آسمان یہ گواہی دیں کہ اس نے اپنا یہ سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ غیر مشترک طور پر اپنے رب کے لئے پیش کر دیا تھا۔

اللہ جب تک غیب میں ہے انسان اس کو بھلا کر دوسری بے حقیقت چیزوں کو اپنا مرکز محبت بنا لیتا ہے، مگر قیامت میں جب اللہ اپنے عظمت و جلال کے ساتھ ظاہر ہوگا تو تمام دوسری چیزیں بالکل بے رونق دکھائی دینے لگیں گی، ہر چیز اپنی کشش کھو دے گی۔ اس وقت انسان حسرت و افسوس کے ساتھ سوچے گا کہ اصل قابل توجہ ہستی تو صرف اللہ کی تھی۔ مگر میں اپنے اندھے پن کی بنا پر دوسری بے حقیقت چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنائے رہا۔ اس وقت انسان اپنے تباہ کن غلطی پر پشیمان ہوگا، مگر اس دن کا پشیمان ہونا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ دن اپنے عمل کا انجام پانے کا دن ہوگا، نہ کہ عمل کرنے کا دن۔

بیماری سے تطہیر

حدیث میں آیا ہے کہ مدینہ میں ایک شخص بیمار ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی عیادت کے لیے اُس کے گھر گئے۔ وہاں پہنچ کر آپ نے کہا کہ: لا بأس، طهور إن شاء الله (صحیح البخاری، کتاب المرضٰی، باب ما یقال للمریض) یعنی کوئی حرج نہیں، انشاءاللہ یہ پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو پُر اسرار طور پر اس کے گناہ دھل جاتے ہیں، وہ خود بخود ایک پاکیزہ انسان بن جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک معلوم شعوری واقعہ ہے جو ایک سچے مومن کے ساتھ پیش آتا ہے۔

کوئی آدمی اگر بیمار نہ ہو، اُس کا جسم مکمل طور پر ایک صحت مند جسم ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر فخر وناز کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُس کے سینہ میں دردمندانہ احساسات کی پرورش نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ وہ ایک بے حس انسان بن کر رہ جاتا ہے۔

لیکن جب ایک مومن بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ اپنے عجز کو دریافت کرتا ہے۔ اُس کے اندر دردمندی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے بندہ ہونے کی حقیقت کا تجربہ کرتا ہے۔

اس طرح بیماری اُس کو دوسری چیزوں سے دور کر کے اللہ سے قریب کر دیتی ہے۔ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ کو یاد کرنے لگتا ہے۔ اُس کے دل سے دعائیں اور التجائیں نکلنے لگتی ہیں۔ بیماری اُس کے لیے اللہ سے قربت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

بیماری بظاہر ایک غیر مطلوب چیز ہے۔ لیکن اگر صحیح اسلامی ذہن ہو تو جسمانی بیماری آدمی کے لیے روحانی صحت کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس دنیا میں اصل اہمیت ذہنی بیداری کی ہے۔ بیدار ذہن ہی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ واقعات سے سبق لے۔ اور ذہن کو بیدار کرنے والی سب سے بڑی چیز اس دنیا میں صرف ایک ہے، اور وہ مشکل حالات ہیں۔

اس معاملہ کا تعلق صرف بیماری سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق ہر اس تجربہ سے ہے جو آدمی کو بیماری جیسا تجربہ کرائے۔ انسان کی زندگی میں جس طرح کامیابی کی اہمیت ہے اسی طرح ناکامی کی بھی اہمیت ہے۔ جس طرح آدمی کے لیے خوشی ایک اچھی چیز ہے اسی طرح اس کے لیے غم بھی ایک اچھی چیز ہے۔ شرط یہ ہے کہ آدمی کا ذہن بیدار ہو چکا ہو اور تجربات سے سبق لینے کی صلاحیت اس کے اندر پیدا ہو چکی ہو۔

غم کا تجربہ آدمی کے ذہن کو کھولتا ہے۔ وہ اس کے اندر چھپے ہوئے گہرے احساسات کو جگاتا ہے۔ وہ اس کی حساسیت کو بڑھا کر اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ چیزوں سے سبق لے سکے۔ غم کسی آدمی کے لیے ذہنی ترقی کا ذریعہ ہے۔ غم آدمی کو اعلیٰ حقیقتوں سے جوڑنے کا سبب ہے۔

آخرت

موت کی یاد

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اکثروا ذکر ھادم اللذات الموت (مشکاۃ المصابیح ۱/ ۵۰۴) یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو کہ لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ موت کی یاد بھی ایک "ذکر" ہے۔ وہ ایک عبادتی عمل ہے۔ موت کی یاد ایک ثواب ہے جو انسان کے اعمال نامہ میں درج کیا جاتا ہے۔

ایک فارسی شاعر بوڑھا ہو گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔ اس وقت اس نے یہ شعر کہا کہ موت کے ہاتھ نے روانگی کا نقارہ بجا دیا ہے۔ اے میری دونوں آنکھیں اب تم سر کو الوداع کہو:

کوسِ رحلت بکوفت دست اجل　　　اے دو چشمم وداعِ سر بکنید

"موت آ کر رہے گی" یہ بات ان لوگوں سے کہنے کی ہے جو ابھی جوانی کی عمر میں ہوں لیکن جو لوگ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے ان کے لئے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان سے یہ کہا جائے کہ "موت آنا شروع ہو گئی"۔ جوان آدمی کے لئے موت بظاہر مستقبل کی ایک خبر ہے لیکن بوڑھے آدمی کے لئے موت حال میں پیش آنے والا ایک واقعہ۔

حقیقت یہ ہے کہ جوان آدمی اگر موت کو یاد نہ کرے تو یہ اس کے لئے غفلت کی بات ہوگی۔ لیکن جو لوگ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر بھی موت کو بھولے ہوئے ہوں ان کی یہ حالت بے حد سنگین ہے۔ یہ گویا کہ سرکشی ہے اور اللہ کے نزدیک سرکشی سے زیادہ سنگین جرم اور کوئی نہیں۔ موت کو یاد رکھنے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ ایک واقعہ کی صورت میں روز ہر آدمی کے آس پاس پیش آتی ہے۔ ہر دن یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ کوئی بچپن میں مر گیا اور کوئی جوانی میں اور کوئی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر مرا۔ اس طرح ہر عمر کے لوگ اپنے جیسی عمر کے مرد و عورت کو ہر روز مرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے اس کی مثال دنیا میں موجود ہے۔ ایسی حالت میں ہر عقل مند آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو موت کے کنارے محسوس کرے۔ کسی بھی عمر کا آدمی اپنے آپ کو موت سے محفوظ نہ سمجھے۔

کراہیت موت

سنن ابی داؤد (کتاب الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام) میں ثوبان رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ وقت آنے والا ہے جب قومیں تمہارے خلاف پکاریں جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالہ کی طرف پکارتے ہیں۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ کیا اس دن ہم کم ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ اس وقت تم بہت زیادہ ہوگے۔ مگر تم لوگ جھاگ ہوگے، سیلاب کے جھاگ کی طرح۔ اور اللہ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہارا خوف نکال دے گا۔ اور اللہ تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ اے خدا کے رسول، وہ کمزوری کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت کو ناپسند کرنا۔

اس حدیث میں امت کے دور زوال کی پیشگی خبر دی گئی ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگی۔ مگر وہ ایک کمزوری کا شکار ہونے کی بنا پر بے وزن ہو جائیں گے۔ وہ کمزوری یہ ہے کہ دنیا کا مفاد ان کی نظر میں بے حد عزیز ہو جائے گا۔ حتی کہ مفاد کے خلاف جانا انھیں ایسا لگے گا جیسے کہ وہ اپنی موت کی طرف جا رہے ہوں۔

عوام کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت ان کے مادی مفاد کی ہو جائے گی، کیوں کہ حق کے تقاضوں پر چلنے میں وہ اپنی معاشی بربادی محسوس کریں گے۔ قائدین اپنی قوم کی غلطیوں کے خلاف بولنا چھوڑ دیں گے، کیوں کہ انھیں دکھائی دے گا کہ ایسا کرنا اپنے آپ کو قیادتی ہلاکت کے خطرہ میں مبتلا کرنا ہے۔ لوگ قربانی کے بجائے رخصت کے طریقے پر چل پڑیں گے، کیوں کہ قربانی کے طریقہ میں انھیں اپنی دنیوی موت نظر آئے گی۔ لوگ اصول پسندی کے بجائے مصلحت پرستی کو اپنا شیوہ بنالیں گے، کیوں کہ ان کا یہ احساس ہوگا کہ مصلحت پرستی میں ان کی ترقی ہے اور اصول پسندی میں ان کی موت۔

یہ صفات آدمی کو خود پسند بناتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو صرف اپنے ذاتی مفاد کی خبر ہوتی ہے انھیں پوری قوم کے مفاد کی خبر نہیں ہوتی۔ ان کے اندر یہ استعداد ختم ہو جاتی ہے کہ وہ دوسروں سے جڑ کر متحدہ طاقت بن سکیں۔ مجموعی طور پر کثیر تعداد ہونے کے باوجود اس کا ہر فرد اکیلا اکیلا ہو کر رہ جاتا ہے۔

استحقاق جنت

ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ پھر ہر اس بندے کو بخش دیا جاتا ہے جو اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرتا۔ سوائے اس شخص کے جس کے اور اس کے بھائی کے درمیان کینہ ہو۔ پس کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کے معاملے کو مؤخر کرو یہاں تک کہ وہ دونوں اپنے باہمی معاملہ کو درست کرلیں۔ (ارکوا ھذین حتیٰ یصطلحا) کتاب البر والصلۃ والآداب، صحیح مسلم بشرح النووی ۱۶/ ۱۲۲۔

اس حدیث میں جس بات کی نشاندہی کی گئی ہے اس سے مراد وقت نہیں ہے بلکہ نفسیات ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ فلاں وقت تک آدمی کے بارے میں جنت کا فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ اور اس کے بعد جب فلاں وقت آجاتا ہے تو اس کے لیے جنت کا فیصلہ کردیا جاتا ہے بلکہ اس سے مراد خود اس کی داخلی نفسیات ہے۔ جو دراصل اس کے لیے جنت کا استحقاق پیدا کرتی ہے۔

ایک آدمی کا حال اگر یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کی طرف سے پیش آنے والے کسی ناپسندیدہ تجربے کے بعد اس سے متنفر ہوگیا۔ اور اس کے خلاف کینہ اور نفرت کے جذبات اس کے دل میں بھڑک اٹھے تو یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ ایسی نفسیات کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کی روحانیت جاتی رہے گی۔ اس کا دماغ منفی خیالات کا کارخانہ بن جائے گا۔ وہ اپنی منفی سوچ کی بنا پر اس قابل نہ رہے گا کہ خدا کا فیض اس کے اوپر اترے اور اس کی زبان سے وہ پاکیزہ دعائیں نکلیں جو کسی آدمی کو جنت کا مستحق بناتی ہیں۔

اس کے برعکس جب ایسا ہو کہ ایک آدمی کا وقتی طور کسی سے بگاڑ ہو جائے مگر جلد ہی وہ اس سے توبہ کرے۔ وہ نفرت کے جذبات کو اپنے اندر سے نکالے اور اس کے بجائے محبت کے جذبہ سے دوبارہ مذکورہ شخص سے اپنے تعلقات کو درست کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کو فرشتوں کی ہمنشینی حاصل ہو جائے گی۔ خدا کی یاد کا نورانی چشمہ اس کے سینے میں جاری ہو جائے گا۔ اس کی زبان سے دعا کے وہ ربانی کلمات نکلنےلگیں گے جو سیدھے خدا تک پہنچتے ہیں اور آدمی کو جنت کا مستحق بنادیتے ہیں۔

حساب سے پہلے حساب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا میں اپنا حساب کر لو، اس سے پہلے کہ آخرت میں تمھارا حساب کیا جائے (حاسِبوا انفسکم قبلَ ان تُحاسَبوا) مرنے کے بعد تمام لوگ آخرت میں خدا کی عدالت میں کھڑے کئے جانے والے ہیں، خدا کی عدالت عالم الغیب کی عدالت ہے۔ وہاں کوئی شخص اپنی کسی بات کو چھپا نہ سکے گا۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ خدا کے یہاں جس کی جانچ ہوگئی وہ ہلاک ہونے سے بچ نہیں سکتا (من نوقش فقد ھلک) عقل مند وہ ہے جو آخرت میں خدا کی عدالت میں کھڑا ہونے سے پہلے دنیا میں اپنے کو اپنی ضمیر کی عدالت کے سامنے کھڑا کرلے اور حساب کتاب پیش آنے سے پہلے اپنے کو درست کرلے جو شخص اپنا حساب کیے بغیر مر جائے گا، اس کا حساب خدا کرے گا۔ اور جس کا حساب خدا کرے اس کو کون بچا سکتا ہے۔

آدمی کو پیدائشی طور پر ضمیر دیا گیا ہے جو اس کو ہر بری بات پر ٹوکتا ہے۔ آدمی کے پاس خدا و رسول کی باتیں پہنچتی ہیں جن سے وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکتا ہے۔ اسی ضمیر اور اسی علم کی روشنی میں اپنے کو جانچنے کا نام اپنا حساب آپ کرنا ہے۔

آپ کے ساتھ کوئی شخص غلط سلوک کرے، کسی سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو فوراً آپ کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ آپ اس کو ذلیل اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ آپ کی نظر میں اس سے زیادہ برا اور کوئی شخص نہیں ہوتا۔

مومن وہ ہے جس کے اندر یہی شدت احساس خود اپنی غلطیوں کے بارہ میں پیدا ہو جائے۔ اس سے کوئی غلطی ہو تو فوراً وہ جان لے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اپنی غلطیوں کو جاننے کے لئے وہ اتنا ہی حساس ہو جائے جتنا کوئی شخص دوسرے کی غلطیوں کو جاننے کے لئے ہوتا ہے۔ غلطی سرزد ہوتے ہی وہ تڑپ اٹھے کہ مجھ سے ایسا فعل ہوگیا جو مجھ کو خدا سے دور کر دینے والا ہے۔ جو مجھ کو آخرت میں بے قیمت بنا دینے والا ہے۔ اس کا یہ احساس اتنا شدید ہو کہ اپنا وجود اس کو اپنی نظر میں حقیر معلوم ہونے لگے۔ اپنے احتساب کے لئے وہ اس سے زیادہ بے رحم ہو جائے جتنا کوئی شخص اپنے دشمن کے احتساب کے لئے ہوتا ہے۔

ایسے ہی لوگ اللہ والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اللہ کے ہاتھ بیچ دیا تاکہ ان کے لئے اللہ کے یہاں جنت ہو۔ جو لوگ دنیا میں اس قسم کی متقیانہ زندگی کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی دنیا میں جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ ان کا رب ان سے ملاقات کے عظیم دن کہے گا کہ آج تمھارے اوپر کوئی الزام نہیں۔ ان کے لئے جنت کے تمام دروازے کھول دیئے جائیں گے اور خدا کی طرف سے پکارنے والا پکارے گا: ابدی باغوں میں بنے ہوئے یہ جنتی مکانات آج تمھاری وراثت میں دے دیئے گئے۔ جس دروازہ سے چاہو اس میں داخل ہو جاؤ۔ آج کے بعد نہ تمھارے لئے کوئی غم ہے اور نہ تکلیف۔

اگر آدمی سنجیدہ ہو

حدیث میں آیا ہے کہ اپنے چہرہ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔ اور جس شخص کے پاس وہ بھی نہ ہو تو وہ ایک اچھے بول کے ذریعہ اپنے کو جہنم سے بچائے۔ کیوں کہ اچھے بول کا بدلہ بھی دس گنا سے سات سو گنا تک ملتا ہے (من استطاع ان یقی وجهه من النار ولو بشق من تمرة فلیفعل ومن لم یجد فبکلمة طیبة فان بها تجزی الحسنة عشر امثالها الی سبعمائة ضعف)

دوسری طرف حدیث میں یہ بھی ہے کہ جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی (من سکت نجا) اس سے معلوم ہوا کہ کبھی نیکی یہ ہوتی ہے کہ آدمی بولے اور کبھی سب سے بڑی نیکی یہ ہوتی ہے کہ آدمی چپ رہے۔ کبھی چلنا مطلوب ہوتا ہے اور کبھی بیٹھ رہنا۔ کبھی خدا کو پسند ہوتا ہے کہ اس کا بندہ آنکھ کھول کر دیکھے اور کبھی خدا کی سب سے بڑی پسند یہ ہوتی ہے کہ بندہ اپنی آنکھوں کو بند کر لے۔

کب ایک عمل مطلوب ہے اور کب دوسرا عمل، اس کی کوئی متعین فہرست نہیں بنائی جا سکتی۔ لیکن اگر آدمی خدا سے ڈرتا ہو، اگر اس کو آخرت کی پکڑ کا اندیشہ لگا ہوا ہو تو وہ خود جان لے گا کہ کس موقع پر اسے کیا کرنا چاہئے۔

اگر آدمی کا ذاتی معاملہ ہو اگر اس کے اوپر زد پڑے تو اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ کس موقع پر اسے کیا کرنا چاہئے۔ مگر جب معاملہ دوسرے کی ذات کا ہو تو وہ اس کو سمجھ نہیں پاتا۔ اگر آدمی صرف اتنا کرے کہ جو چیز وہ اپنے لئے چاہتا ہے وہی دوسرے کو بھی دے اور جس چیز سے خود بچنا چاہتا ہے اس سے دوسروں کو بھی بچالے تو یہی اس کی اصلاح کے لئے کافی ہے۔

اپنی ذات کے بارے میں آدمی کا عمل بتا رہا ہے کہ اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ مگر اس علم کو آدمی صرف اپنے لئے استعمال کرتا ہے اور جب معاملہ دوسرے کا ہو تو وہ اس سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

مشاہدۂ خداوندی

قال رسول اللہ ﷺ : اھل الجنۃ فی نعیمھم اذسطع علیھم نور فرفعوا رؤسھم فاذا الرب تبارک وتعالی قد اشرف علیھم من فوقھم. فقال السلام علیکم یا اھل الجنۃ۔ وذالک قولہ تعالی (سلام قولا من رب الرحیم) قال فینظر الیھم وینظرون الیہ ۔ فلا یلتفتون الی شئ من النعیم ما داموا ینظرون الیہ حتی یحجب عنھم (ابن ماجہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اہل جنت اپنی نعمتوں میں ہوں گے کہ ان کے اوپر ایک روشنی نمودار ہوگی۔ وہ اپنا سر اٹھائیں گے۔ اچانک وہ دیکھیں گے کہ ان کا رب ان کے اوپر جلوہ گر ہے۔ وہ کہے گا کہ اے اہل جنت، تم پر سلامتی ہو۔ یہ وہی قول خداوندی ہے جس کا ذکر قرآن (یٰس ۵۸) میں ہے۔ پھر اللہ انھیں دیکھے گا اور وہ اللہ کو دیکھیں گے، وہ کسی دوسری نعمت کی طرف متوجہ نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ اللہ ان سے حجاب میں چلا جائے۔

یہ سب سے زیادہ عجیب تجربہ ہے جو اہل جنت کو ہوگا۔ یہ اتنا زیادہ پرکشش ہوگا کہ اس وقت جنت کے لوگ دوسری تمام اعلیٰ ترین نعمتوں کو بھول جائیں گے۔ وہ خدا جو خود اپنی ذات پر قائم ہے۔ جس نے تمام چیزوں کو عدم سے وجود بخشا۔ جو پوری کائنات کو اپنے کنٹرول میں لئے ہوئے ہے۔ جس کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے۔ جس کی قدرت سب سے بالا اور سب سے برتر ہے۔ جو ہر قسم کے حسن اور کمال اور معنویت کا ابدی سرچشمہ ہے۔ جو انسان کی ہر سوچ سے بلند اور اس کے ہر تصور سے ماورا ہے۔ ایسے جلال وکمال والے خدا کا مشاہدہ بلاشبہہ ایک ایسا بے مثال تجربہ ہوگا جس کو بیان کرنے کے لئے کوئی لفظ انسانی زبان میں نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی روح اسی رب العالمین کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہے۔ موجودہ آنکھ سے انسان اس ہستی کو نہیں دیکھ سکتا۔ مگر آخرت میں انسان کو وہ آنکھ حاصل ہو جائے گی جس سے وہ اس برتر ہستی کو دیکھے اور اپنی روح کو ابدی تسکین دے سکے۔

امت کا بگاڑ

حضرت علیؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت مختلف الفاظ میں نقل ہوئی ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانہ میں جب امتِ مسلمہ کے اندر بگاڑ آئے گا تو اس کے افراد میں دس قسم کی خصلتیں پیدا ہو جائیں گی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کی بات مانے گا اور اپنی ماں کی نافرمانی کرے گا۔ وہ اپنے دوست سے قریب ہوگا اور باپ سے دور ہو جائے گا (اطاع الرجل امرأته وعق امه وادنی صدیقه واقصیٰ اباه، الترمذی)

بیوی کسی آدمی کے لیے دل چسپیوں کا مرکز ہوتی ہے جب کہ ماں کا وجود ذمہ داریوں کی علامت ہے۔ اسی طرح باپ کے ساتھ فرماں برداری کا تصور وابستہ ہوتا ہے اور دوست کے ساتھ تفریح کا۔ آدمی کا ماں باپ کو چھوڑ دینا اور اپنی بیوی اور اپنے دوستوں سے قریب ہونا دراصل بڑھی ہوئی دنیا پرستی کا نتیجہ ہے۔ اپنے بیوی بچوں سے دل چسپی یا اپنے دوستوں سے رغبت بجائے خود فطری چیزیں ہیں۔ مگر جب آدمی کا مزاج آخرت پسندانہ ہو تو ان چیزوں کو وہ ضرورت کے دائرہ میں محدود رکھتا ہے، وہ اپنے جی کے میلان پر پابندی قائم رکھتے ہوئے والدین کے بارہ میں اپنی شرعی ذمہ داریوں کو ادا کرتا رہتا ہے۔ مگر جب آخرت کے عقیدہ پر دنیا پرستی کا رجحان غالب آجاتا ہے تو صورت حال بدل جاتی ہے۔ اب آدمی ہمہ تن اپنے دوستوں اور اپنے بیوی بچوں کی طرف جھک جاتا ہے اور ماں باپ سے عملاً بے تعلق ہو جاتا ہے، اور اگر تعلق رکھتا بھی ہے تو محض زبان اور الفاظ کا۔ اس کا بہترین مشغلہ یہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے درمیان خوش وقتی کے لمحات گزارے۔ اس کے لطف ولذت کے اوقات وہ ہوتے ہیں جب کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے درمیان ہو اور ان سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر رہا ہو۔ اس کا وقت، اس کا پیسہ، اس کے جذبات، اس کا پورا وجود اپنے بیوی بچوں کے لیے وقف ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ کے لیے اس کے پاس رسمی باتوں کے سوا کچھ اور نہیں رہتا۔

قوم پر ایسا وقت آنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے افراد پابندی کے بجائے بے فکری کو پسند کرنے لگے ہیں۔ ان کو ذمہ دارانہ زندگی کے مقابلہ میں بے قید زندگی زیادہ محبوب ہو گئی ہے۔ افراد کا یہی مزاج قوم کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہے۔

تین قسم

عن بُریدۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم القضاۃ ثلاثۃ۔ واحد فی الجنۃ واثنان فی النار۔ فاما الذی فی الجنۃ فرجل عرف الحق فقضیٰ بہ ورجل عرف الحق فجار فی الحکم فھو فی النار ورجل قضی للناس علی جھل فھو فی النار۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ فیصلہ کرنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک جنّت میں جائے گا اور دو آگ میں جائیں گے۔ پس جنت والا وہ شخص ہے جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جس نے حق کو پہچانا پھر اس کے خلاف فیصلہ دیا تو وہ آگ میں جائے گا۔ تیسرا شخص وہ ہے جو جہالت کی بنیاد پر لوگوں کے لیے فیصلہ کرے تو وہ بھی آگ میں جانے والا ہے۔

حق کو جاننے کے لیے باطل کے پردوں کو پھاڑنا پڑتا ہے۔ پھر حق کو جاننے کے بعد اس کو ماننا اور اس کی بنیاد پر فیصلہ کرنا بھی قربانی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اس معرفت اور اس قربانی کا ثبوت دیں وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرتے ہیں کہ انھیں جنت میں داخل کیا جائے اور بلاشبہ یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کیے جائیں گے۔

بقیہ دو قسم کے لوگ جنت میں جگہ پانے کے قابل نہیں۔ جو شخص حق کو جاننے کے بعد اس سے انحراف کرے وہ خدا کے مقابلہ میں سرکشی کرتا ہے۔ ایسے شخص کو جہنم کے سوا اور کہاں جگہ مل سکتی ہے۔ اسی طرح تیسرا شخص بھی خدا کی سزا کا مستحق ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے معاملہ میں سنجیدہ ثابت نہ ہو سکا۔ کوشش کے باوجود اجتہادی خطا کرنا قابل معافی ہے مگر تیاری اور تحقیق کے بغیر شرعی امور میں فیصلے دینا قابل معافی نہیں۔

یہاں جس "فیصلہ" کا ذکر ہے، اس کا تعلق صرف عدالت سے نہیں بلکہ تمام امور سے ہے۔ ہر آدمی ہر آن فیصلے کر رہا ہے، ہر آدمی ہر آن اپنے آپ کو یا جنت کا مستحق بنا رہا ہے یا دوزخ کا۔

دانش مند کون

عن شداد بن اوس قال قال رسول الله ﷺ الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والعا جز من اتبع نفسه هواها وتمنی علی الله (المشکاة المصابیح الجزء الثالث صفحه ١٤٥٤) حضرت شداد ابن اوس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ دانش مند وہ ہے جو نفس پر قابو رکھے اور موت کے بعد والی زندگی کے لئے عمل کرے۔ اور عاجز وہ ہے جو خواہشات کی پیروی کرے۔ اور اللہ پر جھوٹی امیدیں قائم کرے۔

جب آدمی کے اندر ایمان زندہ ہو تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ زیادہ عمل کرنے کے بعد بھی وہ اپنے کو کم سمجھتا ہے۔ اس کا یہ احساس اس کو سر تاپا عمل بنا دیتا ہے۔ نیکی کے ہر موقع پر وہ نیک کرداری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قول و عمل کو خدائی احکام کے تابع نہ کرے۔ اس کا زندہ ایمان اس کے لئے قول طیب اور عمل صالح کی ضمانت بن جاتا ہے۔

مگر جو لوگ ایمانی کمزوری کا شکار ہوں، ان کے اندر اس قسم کا طاقتور جذبہ باقی نہیں رہتا۔ اب خدا کے احکام ان کے رہنما نہیں ہوتے بلکہ ان کی خواہشات ہی ان کے لئے رہنما بن جاتی ہیں۔ اب انہیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ جب بھی وہ بولیں تو سچ بولیں۔ وہ اپنے عمل کو عمل صالح کا مصداق ثابت کریں۔

اس دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آجاتے ہیں۔ ان کو اپنی خواہشات کے سوا کسی اور چیز کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ اپنے تمام اوقات اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے لگا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے

لئے خدا کے یہاں وہ انعام نہیں جو ایک اعلی انسان کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

تاہم مسلم قوموں کی ایک صفت یہ ہے کہ خواہ زوال کے نتیجہ میں ان کے یہاں قول طیب اور عمل صالح باقی نہ رہا ہو۔ تب بھی اسلامی عقائد ان کے یہاں باقی رہتے ہیں مگر یہ سب کچھ رسمی سطح پر ہوتا ہے نہ کہ زندہ یقین کی سطح پر۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی پوری زندگی دو عملی کی روش پر قائم ہو جاتی ہے۔ اپنی حقیقی عملی زندگی میں وہ مکمل طور پر خواہشات اور مادی مفادات کے پیرو بنے رہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ اپنی خیالی دنیا میں جھوٹی امیدوں کا ایک خود ساختہ محل بنا لیتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے دینی عقائد کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔ دنیوی اعتبار سے وہ پوری طرح ایک فعال زندگی گذارتے ہیں، لیکن اخروی اعتبار سے وہ صرف خوش فہمیوں میں جینے والے بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی حقیقی عمل کئے بغیر ہی بڑے بڑے نتیجہ کی امید قائم کر لیتے ہیں۔ ان کا یہ ذہن بن جاتا ہے کہ ہمارے معاملات پیشگی طور پر درست ہو چکے ہیں، دنیا اور آخرت میں ہمارا کوئی معاملہ بگڑنے والا نہیں۔

آدمی بیک وقت دو چیزوں پر یکساں درجہ کی توجہ نہیں دے سکتا۔ جو آدمی آخرت کو اہمیت دے وہ آخرت سے تعلق رکھنے والی باتوں کو بے حد اہمیت دے گا۔ اس کے مقابلہ میں دنیوی چیزیں اس کی نظر میں غیر اہم ہو جائیں گی۔ اور جو آدمی دنیا کو اہمیت دے وہ دنیا کے معاملات کو بے حد سنگین سمجھے گا۔ اس کے مقابلہ میں آخرت سے تعلق رکھنے والی باتیں اس کو زیادہ اہم دکھائی نہ دیں گی۔ یہی فرق بتاتا ہے کہ کون آخرت پسند ہے اور کون دنیا پرست۔

جنت کا انعام

صحیح البخاری ، کتاب مناقب الانصار ، باب تزویج النبی صلی اللہ علیہ وسلم خدیجۃ وفضلھا کے تحت حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے :

اتیٰ جبریل النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فقال : یارسولَ اللّٰہ ، ھٰذہ خدیجۃ قد اتتْ معھا اِناءٌ فیہ اِدامٌ اَوطعامٌ اَو شراب - فاِذا ھِیَ اَتتْکَ فاقرأْ علیھا السلام من ربّھا و مِنّی و بَشِّرھا ببیتٍ فی الجنۃ مِن قَصَب لا صَخَبَ فیہ ولا نَصَبَ -

جبریل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول ، یہ خدیجہ آرہی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک برتن ہے ۔ اس میں کھانے اور پینے کا سامان ہے ۔ جب وہ آپ کے پاس آجائیں تو ان کو ان کے رب کی طرف سے سلام کہہ دیں اور میری طرف سے بھی ۔ اور ان کو خوش خبری دے دیں کہ جنت میں ان کے لیے ایک گھر ہوگا جس میں نہ کوئی شور ہوگا اور نہ کوئی تکلیف ۔

یہ واقعہ کہاں پیش آیا ۔ اس سلسلہ میں ابن حجر العسقلانی نے الطبرانی کی ایک روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ اس وقت ہوا جب کہ آپ مکہ کے قریب غار حراء میں تھے (فی روایۃ سعید بن کثیر عند الطبرانی ، اِن ذلک کان وھو بحراء) فتح الباری ۷/۱۷۲

یہ غالباً مکی دور کے اس زمانہ کی بات ہے جب کہ اہل مکہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو بیت اللہ میں نماز پڑھنے سے روکتے تھے ۔ چنانچہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو اکثر نماز اور عبادت کے لیے مکہ کے باہر پہاڑوں کی طرف جانا پڑتا تھا ۔ غالباً اسی زمانہ میں آپ عبادت کے لیے حراء نامی غار میں بھی گئے جو مکہ سے تقریباً ڈھائی میل کے فاصلہ پہ ہے ۔ اس وقت حضرت خدیجہ نے آپ کے لیے کھانا تیار کرکے اس کو غار حرا میں پہنچایا ۔

مذکورہ واقعہ بعثت نبوی کے ابتدائی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس وقت مکہ میں آپ ایک بے یارومددگار شخص کی حیثیت رکھتے تھے ۔

اس وقت کے حالات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اس طرح مسلّم شخصیت نہ تھی جیسا کہ وہ آج نظر آتی ہے۔ اس وقت سارا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اس وقت آپ کی شخصیت ایک متنازعہ شخصیت تھی۔ لوگ آپ کو شبہ کی نظر سے دیکھتے۔ وہ آپ کے دعوے نبوت پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اس نزاعی صورت حال کا یہ نتیجہ تھا کہ لوگ آپ کا مذاق اڑاتے اور آپ کے اوپر آوازے کستے۔ آپ لوگوں کے طنز کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ لوگوں کی طرف سے مسلسل آپ کو ایذا پہنچانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اس طرح آپ کی زندگی گویا شور وغل اور تکلیف ومصیبت کے درمیان تھی یہ دونوں تلخ تجربے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آرہے تھے اور آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہ کو بھی۔

یہ وہ پس منظر تھا جس میں حضرت جبریلؑ کی طرف سے مذکورہ بشارت نازل کی گئی۔ اور ان کی توجہ کو حال کے بجائے مستقبل کی طرف موڑ دیا گیا۔

مکی دور کے ابتدائی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بیکسی اور عدم قبولیت کا جو ماحول تھا، اس سے حضرت خدیجہ نے کوئی اثر نہیں لیا۔ ان ناموافق حالات سے اوپر اٹھ کر انھوں نے آپ کے پیغمبر ہونے کی حیثیت کو پہچانا۔ اور دل وجان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ وہ صرف آپ کی زندگی کی ساتھی نہیں بنیں بلکہ وہ آپ کے مشن میں بھی آپ کی ساتھی بن گئیں۔

حضرت خدیجہ کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر ان کے لیے جنّت کا وہ محل لکھ دیا گیا جو ہر قسم کے شور سے بھی خالی ہو اور ہر قسم کی تکلیف سے بھی۔ یہ بشارت براہ راست طور پر حضرت خدیجہ کے لیے ہے، اور بالواسطہ پر ہر اس شخص کے لیے جو اس نوعیت کے ایمان کا ثبوت دے جس کا ثبوت حضرت خدیجہ نے اپنے زمانہ میں دیا۔

آخرت کا معاملہ

ستمبر ۱۹۸۶ میں مجھے دہلی کی ایک کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اس کانفرنس کا افتتاح ایک انتہائی اعلیٰ سیاسی شخصیت کے ذریعہ ہونے والا تھا۔ اس بنا پر وہاں حفاظت کا غیر معمولی انتظام تھا۔ اجتماع گاہ میں داخل ہونے والے ہر شخص کی جانچ الکٹرانک آلات کے ذریعہ ہو رہی تھی۔ میں جب اجتماع گاہ کے گیٹ پر پہونچا تو فوراً حفاظتی پولیس کے کئی آدمی میری طرف بڑھے تاکہ میری باقاعدہ جانچ کریں۔ مگر اس وقت میرے ساتھ کانفرنس کی انتظامیہ کمیٹی کے ایک اعلیٰ عہدیدار (مسٹر بجاج) تھے۔ انھوں نے فوراً مداخلت کی اور کہا : انھیں اندر آنے دو، ان کی جانچ نہیں کرنی ہے۔

جب یہ واقعہ ہوا تو اچانک مجھے قیامت کا منظر یاد آگیا۔ میں نے سوچا کہ آخرت میں اسی طرح جب آدمی آگے کی طرف بڑھنا چاہے گا تو خدا کے فرشتے فوراً اس کو جانچ کے لیے روک لیں گے۔ اس وقت وہی شخص بچے گا جس کے متعلق خدا یہ کہہ دے کہ اس کی جانچ مت کرو۔ اس کو اندر آنے دو۔ اس کے برعکس جو شخص جانچ کرنے والے فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا اس کی نجات کی کوئی صورت نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں وہی لوگ نجات پائیں گے جن کا آسان حساب (حساب یسیر) لیا جائے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص جانچا گیا وہ ہلاک ہوا (مَن نوقش فقد هلك) ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت میں کوئی شخص اپنے عمل سے نہیں بچ سکتا، وہاں صرف وہ شخص بچے گا جس کو اللہ اپنی رحمت اور فضل کے سایہ میں ڈھانپ لے۔

آدمی کو اگر قیامت میں پیش آنے والی اس سنگین صورتِ حال کا احساس ہو تو دنیا میں اس کا رویہ بالکل بدل جائے گا۔ کسی بھائی کو وہ سختی میں مبتلا ہوتے ہوئے دیکھے گا تو اس کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ وہ اس کے معاملہ میں غیر جانبدار ہو جائے۔ کیوں کہ وہ ڈرے گا کہ موت کے بعد جب جانچ کے فرشتے اس کی طرف بڑھیں گے اس وقت خدا اگر میرے معاملہ میں غیر جانبدار ہو جائے تو میرا کیا انجام ہوگا۔ اس کے بعد کون سی دنیا ہوگی جہاں مجھے پناہ مل سکے۔

قول پر جنت اور جہنم

صحیح البخاری میں ایک روایت آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ان العبد لیتکلم بالکلمة من رضوان اللہ تعالیٰ ما یلقی لھا بالاً یرفعه اللہ بھا درجاتٍ و إن العبد لیتکلم بالکلمة من سخط اللہ تعالیٰ لا یلقی لھا بالاً یھوی بھا فی جھنم** (بندہ خدا کی خوشنودی کی ایک بات کہتا ہے، وہ اُس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، اللہ اس کی وجہ سے اس کا درجہ بلند کر دیتا ہے۔ اور بندہ خدا کی ناراضگی کی ایک بات کہتا ہے، وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، اُس کی وجہ سے وہ جہنم میں ڈال دیا جاتا ہے)۔

ایک قول اور دوسرے قول میں یہ عظیم فرق محض الفاظ کے فرق کی بنا پر نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ فرق نیت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ قول دراصل آدمی کی داخلی شخصیت کا ایک اظہار ہے۔ جب کوئی آدمی ایک بات بولتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ وہ کن احساسات میں جینے والا انسان ہے۔

دو قسم کے قول میں مذکورہ فرق کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ایک قول خیر خواہی کے جذبہ کے تحت نکلتا ہے اور دوسرا قول بدخواہی کے جذبہ کے تحت۔ ایک قول محتاط اظہار رائے کے ہم معنٰی ہوتا ہے اور دوسرا قول بے احتیاط رائے زنی کے ہم معنٰی۔ ایک قول میں سچائی کا اعتراف ہوتا ہے اور دوسرے قول میں سچائی کا انکار۔ ایک قول یہ سوچ کر زبان سے نکلتا ہے کہ خدا کے یہاں مجھے اس کا جواب دینا ہے اور دوسرا قول غافل قلب کے تحت نکلتا ہے جس کو آخرت کی جوابدہی کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔

قول بظاہر کچھ الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر قول ایک آئینہ ہے جس میں آدمی کی پوری شخصیت جھلکتی ہے۔ قول میں فکر آخرت کی بھی جھلک ہوتی ہے اور آخرت سے بے خوفی کی جھلک بھی۔ ایک قول سنجیدگی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور دوسرا قول غیر سنجیدگی کی مثال ہوتا ہے۔ ایک قول متقیانہ قول ہوتا ہے اور دوسرا قول فاجرانہ قول۔ ایک قول میں جنت کی خوشبو شامل ہوتی ہے اور دوسرا قول وہ ہے جو جہنم کی بدبو لیے ہوئے ہے۔

اعتراف عجز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں ایک شخص پیدا ہوا۔ اس کا نام عبداللہ بن جدعان تھا۔ وہ نہایت شریف اور سخی آدمی تھا۔ کثرت سے لوگوں کو کھلاتا تھا اور لوگوں کی مدد کرتا تھا۔

عبداللہ بن جدعان کے بارہ میں ایک روایت صحیح مسلم میں آئی ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

عن عائشة قالت يا رسول الله ان ابن جدعان كان يطعم الطعام ويقرى الضيف، فهل ينفعه ذالك يوم القيامة۔ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا، انه لم يقل يوماً رب اغفرلى خطيئتى يوم الدين۔

حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ سے کہا کہ اے اللہ کے رسول، عبداللہ بن جدعان لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا اور مہمانوں کی عزت کرتا تھا۔ کیا اس کا یہ عمل قیامت کے دن اس کو فائدہ پہنچائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، کیوں کہ اس نے کسی دن یہ نہ کہا کہ اے میرے رب، جزا کے دن میرے گناہ کو بخش دے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ کیا ہے۔ وہ اعتراف ہے۔ بندہ جب اپنی زندگی اور خدا کی خدائی کی پہچان حاصل کرتا ہے تو اس کے اندر شدید طور پر اپنی عاجزی کا احساس طاری ہوتا ہے۔ خدا کی عظمت اور کمال کے سامنے اس کو اپنا وجود سراپا تقصیر نظر آنے لگتا ہے۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے آگے گر پڑے۔ وہ خدا سے رحمت اور بخشش کی التجا کرنے لگے۔

''خدایا مجھے بخش دے'' عجز کا کلمہ ہے۔ اور عجز کا کلمہ ہی جنت کی آخری قیمت ہے۔ جس آدمی کے پاس نہ عمل ہو اور نہ اعتراف بے عملی تو اس کو جنت آخر کس بنیاد پر دی جائے گی۔

جنگ مطلوب نہیں

انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا کی ایک مستقل سرخی ہے : آج کے لیے ایک خیال (A Thought for Today) ۔ اس سرخی کے تحت اخبار ہر روز کوئی خاص مقولہ نقل کرتا ہے۔ ۱۹ مئی ۱۹۸۷ کی اشاعت میں اخبار نے اس عنوان کے تحت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول نقل کیا جو انگریزی میں اس طرح ہے :

Paradise lies in the shadow of swords.

(جنّت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے) یہ اقتباس پڑھ کر ایک صاحب نے کہا : اب میری سمجھ میں آیا کہ مسلمان کیوں ہر وقت شمشیر بکف رہتے ہیں۔ جب ان کے پیغمبر نے خود یہ کہا ہو کہ " جنت تلواروں کے سایہ میں ہے " تو اس کے بعد تو وہ یہی کریں گے کہ ہر وقت لڑنے مرنے کے لیے تیار رہیں۔ کیونکہ لڑکر مرنا ان کے عقیدہ کے مطابق ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولنے والا ہے۔

مگر یہ غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مذکورہ فقرہ ، اس میں شک نہیں کہ حدیث میں آیا ہے۔ مگر اخبار میں اس کو سیاق سے الگ کرکے نقل کیا گیا ہے ، اس لیے وہ عجیب وغریب مفہوم کا حامل بن گیا ہے۔ اگر اس فقرے کو اس کے پورے مجموعہ کے ساتھ دیکھا جائے تو بالکل دوسرا نقشہ نظر آئے گا۔

یہ فقرہ دراصل ایک لمبی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ حدیث مختلف کتابوں میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ ذیل میں ہم اس کے اصل الفاظ نقل کرتے ہیں :

عن ابی النضر : سالم مولی عمر بن عبید اللہ قال : کتب الیہ عبد اللہ بن ابی اوفیٰ فقرأته حین سار الی الحروریۃ ، یخبرہ : ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی بعض ایامہ التی لقیٔ فیہا العدوّ انتظر حتی اذا مالت الشمس ، قام فیہم فقال : یا ایہا الناس لا تتمنّوا لقاء العدو ، واسألوا اللہ العافیۃ ، فاذا لقیتموہم فاصبروا ، واعلموا انّ الجنۃ تحت ظلال السیوف ، ثم قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : اللّٰہم مُنزلَ الکتاب ومجریَ السحاب وہازمَ الاحزاب ، اہزِمہُم وَانصُرنا علیہم ۔ (اخرجہ البخاری ومسلم وابو داؤد)

حضرت سالم کہتے ہیں کہ عمر بن عبید اللہ کو عبداللہ بن ابی اوفیٰ نے لکھا۔ میں نے اس کو پڑھا جب کہ وہ خارجی فرقہ کی طرف گئے تاکہ اس کو بتائیں۔ اس خط میں لکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعض دنوں میں جب کہ آپ کا مقابلہ دشمن سے ہوا۔ آپ نے انتظار کیا یہاں تک کہ سورج جھک گیا۔ آپ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو، اور اللہ سے عافیت مانگو۔ پھر جب ان سے تمہارا مقابلہ پیش آئے تو ثابت قدم رہو۔ اور جان لو کہ جنّت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ، کتاب کو نازل کرنے والے، اور بادل کو چلانے والے، اور فوجوں کو شکست دینے والے، ان کو شکست دے اور ان کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

اس حدیث کو امام بخاری، امام مسلم اور امام ابو داؤد نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ تینوں کے یہاں وہ کتابُ الجہاد میں ہے۔ مگر وہ اس کو جس "باب" کے تحت لائے ہیں وہ نہایت بامعنی ہے۔ تینوں نے اس کو اس باب کے تحت نقل کیا ہے کہ "دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو"۔ تینوں کے یہاں ترجمۂ باب کے الفاظ یہ ہیں:

بخاری : باب لا تتمنوا لقاء العدو

مسلم : باب کراهية تمني لقاء العدو

ابو داؤد : باب کراهية تمني لقاء العدو

گویا تینوں محدثین کے نزدیک اس حدیث کا اصل مدعا شمشیر زنی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا اصل مدعا یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنی حد تک ہمیشہ امن کو پسند کریں، وہ کسی حال میں خود سے جنگ کا آغاز نہ کریں۔

حدیث میں جس عمل کو جنت میں داخلہ کا ذریعہ بتایا گیا ہے وہ اسلامی دفاع ہے نہ کہ اسلامی جارحیت۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام کے نام پر لوگوں سے لڑا جائے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب اسلام پر کوئی حملہ ہو تو اس کی طرف سے پورا مقابلہ کیا جائے۔ مومن کو خود سے لڑائی نہیں چھیڑنا ہے، مگر جب اسلام کے خلاف جارحیت کی جائے تو اس وقت اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام کے دفاع میں پوری بہادری کے ساتھ حملہ آور سے لڑے۔

روح اسلام

اذان اسپرٹ

روی عن انس بن مالك رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ اذا اُذِّن فی قریۃٍ اٰمَنَھا الله عزّوجل من عذابه ذٰلك الیوم (الترغیب والترتیب، بحوالہ طبرانی)

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی بستی میں اذان دی جائے تو اللہ تعالیٰ اس بستی کو اس کے اس دن کے عذاب سے بچالیتا ہے۔

اس حدیث میں اذان دینے سے مراد صرف اس کی لفظی پکار نہیں ہے، بلکہ وہ پکار ہے جس میں اذان کے الفاظ محض بطور الفاظ نہ پکارے جائیں بلکہ وہ ایک ربانی حقیقت کے اعلان کے طور پر پکارے گئے ہوں۔

اذان کے الفاظ محض الفاظ نہیں ہیں۔ اس کا ہر فقرہ ایک اسپرٹ کو بتا رہا ہے۔ اس کو ایک لفظ میں "اذان اسپرٹ" کہا جاسکتا ہے۔ جس بستی میں اذان پکاری جائے، وہ باعتبار حقیقت، اس بات کا اعلان ہے کہ ـــــــ ہم وہ لوگ ہیں جو اذان کو ماننے والے ہیں، ہم اذان اسپرٹ کے ساتھ اس دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔ اور جو بستی اذان اسپرٹ والی بستی بن جائے، وہ یقیناً دنیا اور آخرت کے عذاب سے محفوظ ہوجائے گی۔

مثلاً اذان میں سب سے زیادہ جو کلمہ دہرایا جاتا ہے وہ اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کا کلمہ ہے۔ اس کلمہ کی اسپرٹ کیا ہے۔ اس کلمہ کی اسپرٹ تواضع ہے۔ اس کلمہ کی اسپرٹ یہ ہے کہ "اللہ بڑا ہے، انسان چھوٹا ہے"۔ جو لوگ اس اذان اسپرٹ کو اپنالیں، حتیٰ کہ وہ اعلان کرکے دوسروں کو بتادیں کہ ہم اذان اسپرٹ کے حامل لوگ ہیں۔ وہ یقینی طور پر اس عذاب سے بھی محفوظ ہوجائیں گے جو انسانوں کی طرف سے آتا ہے اور اس عذاب سے بھی جو فرشتوں کے ذریعہ انسان کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔

جو لوگ اللہ کو بڑا مان کر چھوٹے بن گیے ہوں وہ ایسے لوگ ہوں گے جو ظلم اور سرکشی اور عناد اور بدخواہی اور حق تلفی سے خالی ہوں گے۔ جن لوگوں کے اندر یہ خصوصیات پیدا ہوجائیں وہ لوگوں کے درمیان محبوب بن جائیں گے۔ اس کے بعد کون ہوگا جو انھیں ستائے۔

گناہ کیا ہے

گناہ (sin) کیا ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں کے درمیان مختلف تصورات پائے جاتے ہیں مثلاً ایک نظریہ وہ ہے جو فطرت (nature) پرمبنی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان کی فطرت ہی میں گناہ کے اسباب موجود ہیں۔ اس لئے انسان مجبور ہے کہ وہ گناہ کرے، یہ رائے ان لوگوں کی ہے جن کو جبریہ کہا جاتا ہے۔ دوسرا نظریہ وہ ہے جو تربیت (nurture) پرمبنی ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ پیدائشی طور پر انسان سادہ ورق کی مانند ہوتا ہے۔ گردوپیش کی دنیا یا سماجی حالات مرد یا عورت کو گناہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ گویا گناہ کے فعل کا ذمہ دار خارجی سماج ہے نہ کہ خود انسان۔

گناہ کا تیسرا تصور وہ ہے جو خصوصی طور پر مسیحی چرچ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مطابق پہلے انسان آدم نے جنت میں ایک گناہ کیا جس کو مسیحیت میں معصیت اصلی (original sin) کہا جاتا ہے۔ انسانِ اول کے اس گناہ کے سبب ساری نسل انسانی گناہ گار ہوگئی۔ اب اس کے لئے پاک ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ خدا نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تا کہ وہ مصلوب ہو کر لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔

گناہ کے بارے میں اسلام کا تصور ان سب سے مختلف ہے۔ اسلام کے مطابق انسان موجودہ دنیا میں امتحان (ٹسٹ) کے لئے پیدا کیا گیا ہے (الملک ۲) امتحان کی اسی مصلحت کی بنا پر انسان کو قول وعمل کی آزادی دی گئی ہے۔ انسان کو پورا اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی گزارے اور جس طرح چاہے زندگی نہ گزارے۔ اس اختیار کو قرآن میں الامانۃ کہا گیا ہے (الاحزاب ۷۲)

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو آزادی دینے کے ساتھ یہ بتادیا ہے کہ فکر اور قول اور عمل کا کون سا طریقہ اس کے لئے درست ہے اور قول وعمل کا کون سا طریقہ اس کے لئے درست نہیں (الشمس ۸)

قرآن کے مطابق، انسان کو اس دنیا میں یہ اختیار تو حاصل ہے کہ وہ اپنی آزادی کو جس طرح

چاہے استعمال کرے مگر اس کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ آزادی کے استعمال کے نتائج کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دے۔ مثلاً انسان یہ اختیار رکھتا ہے کہ وہ آگ کے انگارہ کو اپنے ہاتھ میں لے یا نہ لے۔ لیکن آگ کے انگارے کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اس کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس فعل کے انجام سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تصورِ گناہ کیا ہے۔ اسلام کے نزدیک گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی آزادی کو غلط استعمال کرے۔ حدیث کے الفاظ میں، وہ خدا کی ممنوعہ چراگاہ میں داخل ہو جائے۔

گناہ کی پہچان کیا ہے۔ اس کی ایک خارجی پہچان ہے اور ایک داخلی پہچان۔ خارجی پہچان سے مراد خدا کی کتاب ہے۔ خدا کی کتاب (قرآن) میں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو خدا کے نزدیک گناہ ہیں اور جن سے آدمی کو بچنا چاہیے۔ گناہ کی داخلی پہچان انسان کا ضمیر (conscience) ہے۔ قرآن کے مطابق، انسان کے اندر پیدائشی طور پر نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دی گئی ہے۔ (الشمس ۸) اسی طرح پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ: الاثم ما حاک فی صدرک وکرهت أن یطلع علیه الناس (صحیح مسلم، کتاب البر) یعنی گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تم کو یہ ناگوار ہو کہ لوگ اس کو جان لیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان صحیح فطرت پر پیدا کیا گیا ہے (الروم ۳۰) یہی بات حدیث میں بھی بتائی گئی ہے (کل مولود یولد علی الفطرۃ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک گناہ کرنا انسان کا مقدر نہیں بلکہ وہ اس کے لئے choice کا ایک معاملہ ہے۔ انسان کو شیطانی طاقتیں بہکاتی ہیں۔ اسی طرح سماجی اسباب اس کو غلط راستہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان اسباب سے متاثر ہو کر گناہ کرے تو وہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ اس سلسلہ میں اسلام کی دوسری تعلیم یہ ہے کہ گناہ کی تلافی ممکن ہے۔ اگر آدمی گناہ کے بعد توبہ کرے اور آئندہ وہ اس سے باز رہے تو وہ اللہ کے نزدیک قابل معافی ٹھہرے گا۔

اللہ کا بندہ

صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب میں باب فضل الضعفا، والخاملین (کمزور اور گم نام آدمیوں کا باب) کے تحت حسب ذیل روایت نقل کی گئی ہے:

عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: رُبَّ اشعث (اغبر) مدفوعٍ بالابواب لواقسم علی الله لابرّه

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بہت سے پریشان بال، گرد آلود، دروازوں سے دھکیلے ہوئے لوگ ہیں، اگر وہ اللہ کے اوپر قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم کو پورا کرے گا۔

یہاں یہ سوال ہے کہ ایک شخص اللہ کا مقبول بندہ ہوتے ہوئے انسانوں کے نزدیک نامقبول کیوں بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص عوام سے مصالحت نہیں کرتا۔ وہ عوامی ذوق کی باتیں نہیں کرتا۔ وہ عام انسانوں کی پسند اور ناپسند کو معیار بنا کر دنیا میں نہیں رہتا۔ وہ اللہ کی طرف دیکھتا ہے نہ کہ عوام کی طرف۔

ایسے انسان کا انجام ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ وہ عوامی مجالس سے دور رہتا ہے، اس لیے وہ عوام کے درمیان اجنبی بن جاتا ہے۔ وہ بے آمیز حق کی بات کرتا ہے، اس لیے وہ ان لوگوں کے یہاں مقام نہیں پاتا جو ملاوٹی حق کو اختیار کیے ہوئے ہوں۔ وہ بھیڑ کی خواہشوں کا ساتھ نہیں دیتا، اس لیے بھیڑ بھی اس کو اپنے اسٹیج پر نمایاں کرنے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایسا آدمی اپنے رب سے جڑا ہوا ہوتا ہے، مگر عین اسی وقت وہ عوامی بھیڑ سے کٹ جاتا ہے۔

سب سے بڑی قربانی اپنی غیر مقبولیت پر راضی ہونا ہے، اور مذکورہ آدمی یہی قربانی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے یہاں اس کا درجہ اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ اللہ کے اعتماد پر اگر وہ قسم کھالے اور یہ کہہ دے کہ اللہ ضرور ایسا کرے گا تو اللہ کو غیرت آتی ہے کہ وہ اپنے اس بندہ کی اس قسم کو پورا نہ کرے۔

جو آدمی اللہ کی خاطر اس طرح لوگوں کے درمیان غیر مقبول ہو جائے، وہ اللہ کا مقبول بندہ بن جاتا ہے۔ اللہ کو اس سے غیرت آتی ہے کہ وہ ایسے بندہ کی دعا کو پورا نہ کرے۔

نفسیاتی قلعہ

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : اٰمُرُکُم بِذِکْرِ اللّٰہِ کَثِیْرًا وَمَثَلُ ذٰلِکَ کَمَثَلِ رَجُلٍ طَلَبَہُ الْعَدُوُّ سِرَاعًا حَتّٰی اَتٰی حِصْنًا حَصِیْنًا فَاَحْرَزَ نَفْسَہُ فِیْہِ۔ وَکَذٰلِکَ الْعَبْدُ لَا یَنْجُوْا مِنَ الشَّیْطَانِ اِلَّا بِذِکْرِ اللّٰہِ۔

(الترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تم کو زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرنے کی تلقین کرتا ہوں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کا اس کے دشمن نے تیزی سے پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ وہ بھاگ کر ایک مضبوط قلعے میں داخل ہوگیا۔ اس طرح اس نے قلعہ بند ہوکر اپنے آپ کو بچالیا۔ یہی معاملہ بندہ کا ہے۔ وہ صرف اللہ کی یاد ہی کے ذریعہ شیطان سے بچ سکتا ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ گمراہ کرنے والا اس کا دشمن شیطان ہے۔ اس سب سے بڑے دشمن سے بچنے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اللہ کا ذکر کرتا رہے۔

ذکر سے مراد کچھ مقرر کلمات کا ورد نہیں ہے۔ اس قسم کی لسانی ورزش کا مذکورہ ذکر سے کوئی تعلق نہیں۔ معروف قسم کا وِرد یا تکرارِ الفاظ کسی بھی درجہ میں آدمی کو شیطان کے بہکاوے سے بچانے والے نہیں اور نہ وہ کسی کے لئے شیطانی حملوں کے مقابلہ میں حفاظت کا قلعہ بن سکتا ہے۔

ذکر سے مراد دراصل یاد ہے۔ یعنی اللہ کے تصور کا آدمی کے ذہن پر اتنا غلبہ ہوجانا کہ وہی اس کی مستقل سوچ بن جائے۔ آدمی کو ہر وقت خدا کے کمالات اور اس کی عظمتوں کا احساس ہوتا رہے۔ دنیا کے ہر منظر میں اس کو خدا کی جھلک دکھائی دے۔ کائنات کی ہر آواز میں اس کو خدا کا نغمہ سنائی دے۔ وہ ہر واقعہ اور ہر تجربہ سے اپنے لیے ربّانی سبق لیتا رہے۔

آدمی جب اس طرح خدا کو یاد کرنے لگتا ہے تو اس کا ذہن خدائی حقیقتوں کے بارہ میں جاگ اٹھتا ہے۔ اس کے اندر صحیح اور غلط کا شعور پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کے اندر ایک قسم کا ذہنی روک یا نفسیاتی قلعہ بن جاتا ہے جس کے اندر وہ شیطان سے محفوظ ہوکر رہ سکے۔ جو آدمی اس طرح اللہ کی یاد میں جینے لگے اس پر قابو پانا شیطان کے لیے ممکن نہیں۔

اطاعت

غزوۂ موتہ ہجرت کے آٹھویں سال پیش آیا۔ محمد بن جریر الطبری (۲۲۴-۳۱۰ھ) نے اپنی کتاب تاریخ الرسل والملوک میں غزوۂ موتہ کے ذیل میں لکھا ہے:

حدثنا ابوقتادۃ فارس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قال بعث رسول اللہ جیش الامراء فقال: علیکم زید بن حارثۃ فان اصیب فجعفر بن ابی طالب، فان اصیب جعفر فعبد اللہ بن رواحۃ۔ فوثب جعفر فقال یارسول اللہ ما کنت اذھب ان تستعمل زیداً علیّ۔ قال امض، فانک لاتدری ایّ ذالک خیر۔ فانطلقوا۔

حضرت ابوقتادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موتہ کے لئے لشکر بھیجا۔ آپ نے کہا کہ زید بن حارثہ تمہارے سردار ہیں وہ شہید ہوجائیں تو جعفر بن ابی طالب سردار ہوں گے۔ اور اگر جعفر شہید ہوجائیں تو عبداللہ بن رواحہ سردار ہوں گے۔ یہ سُن کر جعفر جھپٹ کر اٹھے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، میں ایسے لشکر میں نہیں جاؤں گا جس میں آپ نے زید کو میرے اوپر سردار بنایا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ، کیوں کہ تم نہیں جانتے کہ اس میں سے کیا زیادہ بہتر ہے۔ پھر لوگ روانہ ہوئے

مومن فرشتہ نہیں ہوتا۔ مومن بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کے باوجود دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ غیر مومن کے دل میں کوئی غلط خیال یا انحراف کی بات آجائے تو اس کے بعد وہ رکنا نہیں جانتا۔ وہ اپنے اسی خیال پر چل پڑتا ہے، خواہ اس کی غلطی اس پر کتنی ہی زیادہ واضح کی جائے۔ وہ دلیل کی پیروی نہیں کرتا، بلکہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔

اس کے برعکس سچے مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اس کو اس کی غلطی پر ٹوکا جاتے اور اس کے انحراف پر اسے متنبہ کیا جائے تو وہ فوراً رک جاتا ہے۔ وہ اپنے خیال کو اپنا عمل نہیں بناتا۔ وہ اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا۔ وہ ہر وقت اپنی اصلاح کے لئے تیار رہتا ہے، خواہ اصلاح کی خاطر اس کو اپنی خواہش کے خلاف چلنا پڑے۔

مومن حق کا پابند ہوتا ہے اور غیر مومن صرف اپنے نفس کا پابند۔

اجنبی دین

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بدأ الاسلامُ غریباً وسیعودُ کما بدأ فطوبیٰ للغرباء (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام اجنبی حالت میں شروع ہوا، اور وہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ شروع ہوا تھا۔ تو ایسے اجنبیوں کو مبارکی ہو۔

وعن عمرو بن عوف قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اِنّ الدین بدأ غریباً وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء۔ وھم الذین یُصلحون ما افسدَ الناسُ من بعدی من سُنّتی (رواہ الترمذی)

حضرت عمرو بن عوف کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دین شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا، اور وہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ شروع میں تھا۔ تو اجنبیوں کو مبارکی ہو۔ یہی لوگ ہیں جو اس بگاڑ کی اصلاح کریں گے جو میرے بعد میری سنت میں لوگ کریں گے۔

آدمی جب کوئی چیز کھاتا ہے تو اس کو اس کے مزہ کا احساس ہوتا ہے ـــــ نمکین، میٹھا کھٹا، کڑوا، وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کی زبان میں مختلف قسم کے ذائقہ خانے (Taste buds) ہیں۔ کھانے کے دوران جب کوئی چیز ان ذائقہ خانوں کو چھوتی ہے تو نازک تاروں کے ذریعہ ان کی خبر دماغ تک پہنچتی ہے۔ اس طرح آدمی جان لیتا ہے کہ وہ جو چیز کھا رہا ہے اس کا ذائقہ کیا ہے۔ زبان کے یہ ذائقہ خانے اگر اپنی فطری حالت میں ہوں تو ایسے آدمی کو چیزوں کا صحیح ذائقہ (True taste) ملے گا اور اگر کوئی شخص اپنے ذائقہ خانوں کو ان کی اصلی حالت میں محفوظ نہ رکھ سکے تو اس کو غلط ذائقہ (False taste) ملنے لگے گا۔

بگاڑ کے زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ خدا اور رسول والا دین گم ہو جاتا ہے اور دین کی دوسری دوسری شکلیں رائج ہو جاتی ہیں۔ مثلاً قومی دین، برکت والا دین، رسم و رواج والا دین، آبائی فخر والا دین، لوگ دین کی انھیں خود ساختہ شکلوں سے مانوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ خدا اور رسول والے دین کو اجنبی سمجھ کر اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

ایک حدیث

عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال : ان اللہ یرضی لکم ثلاثاً۔ یرضی لکم ان تعبدوہ ولا تشرکوا بہ شیئاً وان تعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا وان تناصحوا من ولاہ اللہ امرکم۔ و یسخط لکم ثلاثا۔ قیل وقال وکثرة السؤال واضاعة المال (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تم سے تین باتوں پر راضی ہوتا ہے۔ وہ اس پر راضی ہوتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑے رہو اور متفرق نہ ہو۔ اور یہ کہ اللہ جس شخص کو تمہارا امیر بنائے اس کی خیر خواہی کرو۔ اور اللہ تم سے تین باتوں پر ناراض ہوتا ہے۔ قیل وقال سے۔ سوال کی کثرت سے اور مال کو ضائع کرنے سے۔

اللہ کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تمام توجہات کا مرکز بن جائے۔ اللہ کے بغیر آدمی کو اپنی زندگی سونی معلوم ہونے لگے۔ اس کے مقابلہ میں شرک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور چیز کو آدمی اپنی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنالے۔ شرک کو چھوڑنا اور اللہ کا عبادت گذار بننا آدمی کو بےنفس اور بے انا بناتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں وہ یقینی طور پر آپس میں جڑ جائیں گے۔ وہ ایک دوسرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا ذمہ دار ہو اس کے بارہ میں مسلمانوں کا رویہ خیر خواہ جیسا ہونا چاہئے نہ کہ حریف جیسا۔ مسلم کی ایک اور روایت کے مطابق دین ہر ایک کے لئے نصیحت (خیر خواہی) کا نام ہے اور اسی طرح حکمرانوں کے لئے بھی (ولائمة المسلمین) عام لوگ جب حکمرانوں کے اندر برائی دیکھتے ہیں تو اس کے خلاف ہنگامے کرتے ہیں اور اس کو تخت سے بے دخل کرنے کی مہم چلاتے ہیں۔ مگر مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ محبت کے ساتھ حکمراں کی اصلاح کی کوشش کرے۔

اللہ کو ایسے بندے پسند ہیں جو قول سے زیادہ عمل سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ اس لئے وہ قیل وقال کی بحث سے سخت ناراض ہوتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں پر غضب ناک ہوتا ہے جو غفلت اور بےحسی میں پڑے رہتے ہیں اور غیر ضروری سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اللہ جن لوگوں کو مال دے اور اس کو وہ حقیقی مدمیں خرچ کرنے کے بجائے ادھر ادھر ضائع کرتے رہیں وہ خدا کی نظر میں بدترین جانور ہیں۔ خدا کبھی ایسے لوگوں پر اپنی رحمت کا سایہ نہیں کرے گا۔

مومن کی تطہیر

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بھی بیماری یا تکلیف جو مسلم کو پہنچتی ہے وہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جاتی ہے (ما من مرض او وجع یصیب المسلم الا کان کفارۃ لذنبہ)

اس طرح کی روایتیں مختلف الفاظ میں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی یا ذہنی تکلیف عام انسان کے لئے تو صرف تکلیف ہے۔ مگر صاحب ایمان کے لئے وہ گناہوں کو دور کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو آدمی ایمان و اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائے، اس کے لئے خود بخود ایسا ہوتا رہے گا کہ جب بھی کوئی تکلیف پڑی تو اپنے آپ ہی اس کی کوتاہیاں اور اس کے گناہ دھلتے چلے جائیں گے۔ اس کا تعلق تکلیف کے بعد ظاہر ہونے والی نفسیاتی کیفیت سے ہے نہ کہ کسی پر اسرار قسم کے خود کار نظام سے۔

یہ دراصل مومن اور غیر مومن کی نفسیات کے فرق کا معاملہ ہے۔ غیر مومن کو کوئی تکلیف پیش آتی ہے تو اس کو وہ کسی کا ظلم سمجھ کر شکایت اور احتجاج کرتا ہے۔ وہ فریاد و ماتم میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس طرح تکلیف ایک غیر مومن کو منفی ردعمل کے سوا کچھ اور نہیں دیتی۔

اس کے برعکس تکلیف کا معاملہ جب ایک ایسے انسان کے ساتھ پیش آتا ہے جس کو ایمان کی معرفت مل چکی ہو، اسلام نے جس کے ذہنی سانچہ کو بدل ڈالا ہو تو وہ تکلیف کا استقبال خدائی آزمائش کے طور پر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تکلیف اس کے اندر خود احتسابی پیدا کرتی ہے۔ وہ تواضع اور اعتراف میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ نفسیاتی حالت اس کو خدا کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دعا کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے گناہوں اور اپنی کوتاہیوں سے معافی مانگنے لگتا ہے۔

اس طرح تکلیف مومن کے لئے پاکی کا سبب بن جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر، تکلیف میں غیر مومن کے لئے منفی نتیجہ ہے اور مومن کے لئے مثبت نتیجہ۔

جاننے کی تڑپ

ایک حدیث ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : انما شفاء العی السوال۔ یعنی جاہل آدمی کے جہل کا علاج سوال کرنا ہے۔ ناواقف آدمی اگر سوال نہ کرے تو اس کی ناواقفیت باقی رہے گی۔ لیکن اگر اس کے اندر سوال کرنے کا مزاج ہو اور وہ دوسروں سے سوال کرے تو کوئی جاننے والا اس کو بتا دے گا، اور اس طرح اس کی بے خبری ختم ہو جائے گی۔

اسی مفہوم میں عربی کا ایک مقولہ ہے کہ : لا ادری نصف العلم۔ یعنی یہ جاننا کہ میں نہیں جانتا، یہ بھی آدھا علم ہے۔ ایک بے خبر آدمی اگر اپنی بے خبری سے لاعلم ہو تو وہ ہمیشہ لاعلمی میں پڑا رہے گا۔ لیکن جب وہ اس ذاتی دریافت تک پہنچ جائے کہ میں فلاں بات کو نہیں جانتا تو وہ اس کی کھوج میں لگ جائے گا۔ وہ اپنے لاادری کو ادری بنانا چاہے گا۔ اس کا یہ جذبہ اس کو علم تک پہنچا دے گا۔ اس کا بے آگہی کا احساس، اس کو آگاہی تک پہنچانے کا زینہ بن جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں اس کو روح جستجو (spirit of inquiry) کہا جاتا ہے اور اس کو بے حد اہمیت دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ دور سائنس کو ظہور میں لانے والی چیز یہی اسپرٹ آف انکوائری (تلاش وجستجو کی روح) ہے۔ جستجو کی تڑپ نے آدمی کو یافت تک پہنچایا ہے۔

قدیم زمانہ میں انسان فطرت کے مظاہر کو خدائی مظاہر سمجھتا تھا۔ وہ ان کو خدائی کا درجہ دیے ہوئے تھا۔ اس لیے ان کو دیکھ کر اس کے اندر جو جذبہ جاگتی تھی وہ پرستش کی اسپرٹ (spirit of worship) تھی۔ جب ان مظاہر کو خدائی کے مقام سے ہٹایا گیا تو اس کے بعد انسان کے اندر ان کے بارہ میں تحقیق وجستجو کی اسپرٹ جاگ اٹھی۔ اس کے نتیجہ میں تمام حقائق فطرت دریافت ہوئے۔

سوال کا مزاج اور تحقیق کا مزاج تمام فکری اور علمی ترقیوں کا زینہ ہے۔ وہی لوگ علم وفکر کی راہ میں بڑی ترقیاں حاصل کرتے ہیں جن کے اندر یہ روح موجود ہو۔ جو لوگ اس روح سے خالی ہوں وہ جامد بن کر رہ جائیں گے۔ وہ ترقی کی اعلیٰ منازل طے نہیں کر سکتے۔

یہی مزاج تمام علمی ترقیوں کی بنیاد ہے۔

غلط فہمی

قرآن میں ایک موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا (الاحزاب ۳۷) سبب نزول یا وقتی انطباق کے اعتبار سے اس آیت کا تعلق زینب اور زید کے معاملہ سے ہے۔ مگر توسیعی انطباق کے اعتبار سے قرآن کی یہ آیت ایک اصول حیات کو بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک بات آدمی کے دل میں ہوتی ہے مگر وہ اس کو اپنی زبان سے ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا۔

پیغمبر اسلام کی زندگی میں اس اصول کی ایک مثال یہ ہے کہ خلافت کے لئے آپ اپنے بعد حضرت ابوبکر صدیق کو سب سے زیادہ اہل سمجھتے تھے۔ مگر آپ نے کبھی اپنی زبان سے اس کا صراحۃً اظہار نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو یقین تھا کہ آپ کے بعد آپ کے اصحاب خود ہی اس مطلوب فیصلہ تک پہنچ جائیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق کی موجودگی میں وہ کسی اور کو اپنا امیر یا خلیفہ نہیں بنائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد جب امارت کا سوال پیدا ہوا تو صحابہ نے تقریباً اتفاق رائے سے حضرت ابوبکر صدیق کو اپنا خلیفہ چن لیا۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اس نظیر کے باوجود خلیفہ اول نے اس معاملہ میں اجتہاد سے کام لیا۔ اپنے بعد خلیفۂ دوم کے معاملہ کو انھوں نے عمومی انتخاب کے اوپر نہیں چھوڑا۔ بلکہ صراحت کے ساتھ حضرت عمر فاروق کو اس منصب کے لئے نامزد فرمایا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ لوگوں کو حضرت عمر فاروق کے بارے میں ایک سخت قسم کی غلط فہمی تھی۔ حضرت عمر فاروق کے مزاج میں شدت تھی۔ لوگ حضرت عمر فاروق کے اخلاص اور قربانی کے معترف تھے۔ مگر ان کو یہ اندیشہ تھا کہ ایک ایسا آدمی خلافت کے نازک منصب کے لئے موزوں نہیں جس کے اندر شدت اور تنقید کا مزاج پایا جائے۔ حضرت عمر فاروق کے بارے میں لوگوں کی اسی غلط فہمی کی بنا پر خلیفۂ اول کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر انہوں نے خود سے عمر فاروق کو نامزد نہیں کیا تو آپ کے بعد مسلمان شاید ان کو اپنا امیر بنانے پر اتفاق نہ کر سکیں گے اور اس طرح عین وہی شخص مسلمانوں کا امیر بننے سے رہ

جائے گا جو اپنی خصوصی اہلیت کی بنا پر مسلمانوں کی پوری جماعت میں امیر یا خلیفہ بننے کا سب سے زیادہ اہل ہے۔

مگر یہ غلط فہمی سراسر بے بنیاد تھی۔ اصل حقیقت برعکس طور پر یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق ان انتہائی نادر انسانوں میں سے تھے جن کو تاریخ ساز انسان کہا جاتا ہے۔ مگر اس غیر معمولی صفت کے باوجود بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ خلیفۂ دوم کے منصب کے لئے لوگ ان کے نام پر متفق ہو جائیں گے۔ یہی اندیشہ تھا جس کی بنا پر خلیفۂ اول کو اس معاملہ میں پیشگی نظیر کے باوجود اجتہاد کرنا پڑا۔ چنانچہ انھوں نے ذاتی مداخلت کرتے ہوئے عمر فاروق کو اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کر دیا۔

حضرت عمر فاروق کے بارہ میں لوگوں کی یہ رائے تمام تر غلط فہمی پر مبنی تھی۔ حضرت عمر فاروق بے حد اصول پسند انسان تھے۔ وہ حق کے معاملہ میں مصالحت کو گوارہ نہیں کرتے تھے۔ اس چیز نے ان کے مزاج میں شدت پیدا کر دی تھی۔ وہ جب بھی کس کو کوئی غلط بات کہتے ہوئے یا غلط کام کرتے ہوئے دیکھتے تو وہ اس پر سخت تنبیہ وتنقید کرتے۔ وہ جس چیز کو حق سمجھتے اس کے اعلان میں وہ کبھی کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ اس بنا پر لوگ ان سے دور رہنے لگے۔ حتیٰ کہ رسول اللہؐ نے فرمایا خدا عمر پر رحم کرے، ان کا کوئی دوست نہیں۔

مگر حضرت عمر کے بارے میں لوگوں کا یہ احساس تمام تر غلط فہمی پر مبنی تھا۔ حضرت عمر فاروق کی شدت صرف ناحق کے خلاف ہوتی تھی نہ کہ کسی انسان کے خلاف۔ وہ عین اس وقت بھی انسان کے خلاف نفرت سے خالی ہوتے جب کہ وہ اس کی تنبیہ کر رہے ہوتے تھے۔ ان کے دل میں عین اس وقت بھی انسان کے لئے خیر خواہی کا جذبہ ہوتا تھا جب کہ بظاہر وہ اس کے خلاف غصہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی ہر سختی میں ایک نرمی چھپی ہوتی تھی۔ ان کی ہر تنقید کے پیچھے محبت کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا۔

عام لوگ اس نازک فرق کو نہ سمجھ سکے۔ اس لئے انہیں حضرت عمر فاروق کے بارے میں سخت غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ تاہم جو لوگ زیادہ باشعور تھے وہ اس راز کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب لوگوں نے حضرت عثمان سے حضرت عمر فاروق کی شکایت کی تو حضرت عثمان نے ان کے بارے میں کہا کہ ان کا

اندران کے باہر سے بہتر ہے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر نے لوگوں کی شکایات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ عمر پر جب خلافت کی ذمہ داری آئے گی تو وہ اپنے آپ نرم ہو جائیں گے۔ (الکامل فی التاریخ لابن الاثیر جلد ۲ صفحہ ۴۲۵)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلط فہمی کتنی خطرناک چیز ہے۔ غلط فہمی کی بنا پر آدمی ایک شخص کے بارے میں بالکل الٹی رائے قائم کر لیتا ہے۔ حالانکہ وہ شخص اس غلط رائے سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ اس قسم کی منفی رائے غلط فہمی میں مبتلا ہونے والے کے اپنے دماغ میں ہوتی ہے۔ باہر کی دنیا میں سرے سے اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ غلط فہمی بلاشبہ ایک سنگین قسم کا اخلاقی جرم ہے۔ ہر آدمی پر لازم ہے کہ اس جرم سے اپنے آپ کو بچائے۔

ا۔ غلط فہمی سے بچنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری تدبیر یہ ہے کہ آدمی محض سن کر کسی بات پر یقین نہ کرے۔ سنی ہوئی بات اکثر غلط ہوتی ہے۔ کسی معاملہ کی صحیح رپورٹ دینا بے حد مشکل کام ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ بہت کم ہوتے ہیں جو کسی واقعہ کو ٹھیک ویسا ہی بیان کریں جیسا کہ وہ ہے۔ اگر ایک آدمی کے دل میں دوسرے آدمی کے خلاف غلط فہمی پیدا ہو جائے تو فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ غلط فہمی میں مبتلا ہونے والا شخص اس آدمی سے ملے اور خود صاحب معاملہ سے تحقیق کرے۔ براہ راست تحقیق کے بغیر کسی کے بارے میں بری رائے قائم کرنا سخت گناہ ہے۔

۲۔ جو آدمی غلط فہمی میں مبتلا ہو اس کے اوپر یہ فرض ہے کہ اس نے جس طرح کسی کے بارہ میں ایک بری رائے قائم کی ہے اسی طرح وضاحت کے بعد وہ اس بری رائے کو اپنے دماغ سے نکالے اور اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ذہن کی اصلاح کر لے۔ جس آدمی کے اندر غلطی کے اعتراف کا مادہ نہ ہو اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ کسی کے بارے میں غلط رائے کو اپنے ذہن میں جگہ دے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ غلط فہمی اکثر حالات میں بے بنیاد ہوتی ہے۔ آدمی یک طرفہ رپورٹ یا ناقص معلومات کی بنیاد پر ایک بری رائے قائم کر لیتا ہے۔ حالانکہ اگر کھلے ذہن کے ساتھ تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں سرے سے ایسی کوئی چیز موجود ہی نہ تھی۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ یا تو اتنا باشعور بنے کہ وہ باتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھ لے، اس کا ذہن اپنے آپ ہی غلط فہمی کو اپنے اندر جگہ دینے سے انکار کردے۔ اور اگر کوئی آدمی اتنا زیادہ باشعور نہ ہوتو انسانیت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ غلط فہمی میں پڑنے سے پہلے براہِ راست طور پر اس کی مکمل تحقیق کرے۔ وہ اس وقت تک ہرگز کسی بات کو نہ مانے جب تک وہ تحقیق کی تمام شرطوں کے ساتھ اس کا جائزہ نہ لے چکا ہو۔

تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو ہر بری بات کو سنتے ہی اسے مان لیں۔ ایسے لوگ بلاشبہہ اسلام سے دور ہیں۔ خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو اسلام کے اعلیٰ معیار پر سمجھتے ہوں۔

۳۔ غلط فہمی دراصل ناقص معلومات کی بنیاد پر کامل رائے قائم کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کسی کے بارے میں ایک جزئی بات سنتا ہے اور اس سے وہ اس آدمی کی کلی تصویر بنالیتا ہے۔ کبھی کسی کا قول اس کے سیاق سے الگ ہوکر سامنے آتا ہے اور پورے سیاق کی روشنی میں دیکھے بغیر ایک ایسی رائے قائم کرلی جاتی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کبھی کسی آدمی کے ایک ظاہری پہلو کو دیکھ کر اس کے باطن کے بارے میں ایک نظریہ بنالیا جاتا ہے۔ کبھی کسی سنی ہوئی بات کو ٹھیک ویسا ہی مان لیا جاتا ہے حالانکہ مختلف راویوں سے گزر کر وہ بات آخر کار ایک ایسی شکل اختیار کرلیتی ہے جس کا اصل واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے علم میں ایک بات آتی ہے اور وہ خود ساختہ تعبیر کے ذریعہ اس کا ایک مفہوم متعین کرلیتا ہے حالانکہ یہ تعبیر اصل حقیقت کے بالکل خلاف ہوتی ہے۔

اس قسم کی مختلف صورتیں ہیں جو غلط فہمی کا سبب بنتی ہیں۔ غلط فہمی کا یہ معاملہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ انتہائی صالح افراد بھی اس کی زد سے مستثنیٰ نہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ لوگوں نے کسی کے خلاف انتہائی بھیانک قسم کی رائے قائم کرلی۔ حالانکہ اس کے پیچھے بے بنیاد غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ایسی حالت میں غلط فہمی کے گناہ سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ آدمی کسی کے خلاف رائے قائم کرنے میں سخت محتاط ہو۔ وہ مکمل تحقیق کے بغیر کبھی ایسی کوئی رائے قائم نہ کرے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ یا تو سرے سے کسی کے بارے میں کوئی رائے ہی قائم نہ کرے اور اگر رائے قائم کرنا ضروری ہوتو اس

کی تحقیق کا حق ادا کرے۔ رائے قائم نہ کرنے پر کسی کی کوئی پکڑ نہیں۔ مگر رائے قائم کرتے ہی آدمی خدا کی پکڑ کی زد میں آجاتا ہے۔ رائے قائم نہ کرنے والا معذور قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر مخالفانہ رائے قائم کرتے ہی اس کا عذر ختم ہو جاتا ہے۔ اب اس کا معاملہ یہ ہو جاتا ہے کہ یا تو وہ دوسرے کے بارے میں اپنی مخالفانہ رائے کو دلیل سے ثابت کرے، یا خود اسی چیز کا مجرم بنے جس کا الزام وہ بے بنیاد طور پر دوسرے کو دینا چاہتا تھا۔

۴۔ غلط فہمی یا بدگمانی کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ بے حد ذمہ داری کی بات ہے۔ اگر آپ کسی کے خلاف برا گمان کر لیں تو آپ اپنے کو اس خطرہ میں مبتلا کر رہے ہیں کہ اگر فریق ثانی برا نہ ہو تو خدا کی نظر میں آپ خود اسی برائی کے ذمہ دار قرار پائیں، جس کا ذمہ دار آپ دوسرے کو سمجھے ہوئے تھے۔

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یَرمی رجلٌ رجلاً بالفِسق ولا یَرمیه بالکُفر الاّ ارتَدَّتْ علیه إنْ لَم یکن صاحبُه کذالك (مسند احمد ۱۸۱/۵) یعنی جب کوئی شخص کسی کے اوپر فسق کا الزام لگائے یا اس کے اوپر کفر کا الزام لگائے تو اس کا الزام خود اسی کی طرف لوٹ آئے گا اگر دوسرا شخص ویسا نہ ہو۔

بے بنیاد غلط فہمی بھی بلاشبہہ ایک الزام کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ کسی کے بارے میں ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا ہونا ہے جو باعتبار واقعہ درست نہیں۔ ایسی حالت میں غلط فہمی یا بدگمانی سے بچنا خود اپنے فائدے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ آدمی کا خود اپنا مسئلہ بن جاتا ہے۔ کیوں کہ فریق ثانی میں اگر وہ برائی نہ ہو تو خود بدگمانی کرنے والا اس کا مجرم قرار پائے گا۔

یہ حدیث رسول بے حد سنگین ہے۔ اس کا تقاضہ ہے کہ آدمی غلط فہمی یا بدگمانی کے معاملہ میں آخری حد تک سنجیدہ ہو جائے۔ غلط فہمی اگر سادہ نوعیت کی ہو مثلاً آپ کسی کے بارے میں یہ رائے قائم کریں کہ وہ جلد غصہ میں آجاتا ہے تو اس میں اس کے لئے کوئی بڑا خطرہ نہیں۔ لیکن اگر کسی کے بارے میں غلط فہمی کی بنا پر ایسی سنگین رائے قائم کر لی جائے جو اخلاقی یا شرعی جرم کی حیثیت رکھتی ہو تو ایسی صورت میں معاملہ بے حد سنگین ہو جائے گا۔ ایسی سنگین غلط فہمی گویا دودھاری تلوار ہے، وہ اگر فریق ثانی کو نہ کاٹے تو خود آپ کی ہلاکت کا سبب بن جائے گی۔

رب بنانا

دورِ زوال کے یہودیوں اور عیسائیوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: انھوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنالیا اور مسیح بن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو صرف یہ حکم تھا کہ وہ صرف ایک معبود کی عبادت کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ پاک ہے اس سے جو وہ شریک کرتے ہیں۔ (التوبہ ۳۱)

احمد اور ترمذی نے یہ روایت کیا ہے کہ عدی بن حاتم الطائی جو جاہلیت کے زمانہ میں نصرانی ہوگئے تھے، وہ مدینہ آئے اور اسلام قبول کرلیا۔ پھر انھوں نے مذکورہ آیت کی نسبت سے رسول اللہ سے کہا کہ انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ کی عبادت تو نہیں کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں۔ ان کے علماء نے حلال کو حرام کیا اور حرام کو حلال کیا تو انھوں نے اس کی پیروی کی۔ یہی ان کی اپنے علماء و مشائخ کی عبادت ہے۔ تفسیر ابن کثیر الجزء الثانی صفحہ ۳۴۸۔

ان آیات میں اتّخاذِ رب کا مطلب اکابر پرستی ہے۔ اس کا اس سیاسی نظریہ سے کوئی تعلق نہیں کہ جو لوگ زمین پر حاکم بن کر اپنا قانون چلا رہے ہوں ان سے لڑ کر انہیں ختم کرو اور زمین پر خدائی قانون کا نفاذ کرو۔ اس آیت کے اندر حال میں موجود ایک صورت کا ذکر ہے نہ کہ مستقبل کی نسبت سے سیاسی مشن کا تعین۔

اس آیت میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ کسی امت کی حالت اس کے دورِ زوال میں کیا ہوتی ہے۔ ایسے زمانہ میں امت کا زندہ تعلق خدا اور رسول کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ اس کی توجہات کا مرکز اس کے اکابر اور مشائخ بن جاتے ہیں۔ اکابر کے اقوال اور ملفوظات اس کے لئے اس کے دین کا ماخذ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مفروضہ بڑوں کی پراسرار کہانیوں میں جینے لگتے ہیں۔ ان کے نزدیک حق صرف وہ ہوتا ہے جو انہیں اپنے بعد کے علماء و مشائخ سے ملا ہو۔ خدا کی کتاب ان کے لئے برکت کا ذریعہ بن جاتی ہے، وہ ان کے لئے حق و باطل میں تمیز کی کسوٹی نہیں ہوتی۔

مدح، تنقید

احادیث میں کثرت سے یہ تلقین کی گئی ہے کہ تم کسی کی مدح نہ کرو۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: **اذا رأیتم المداحین فاحثوا فی وجوههم التراب** (صحیح مسلم، کتاب الزہد) یعنی جب تم مدح کرنے والوں کو دیکھو تو اُن کے منہ پر مٹی ڈال دو۔ اسی طرح ایک روایت میں آیا ہے: **سمع النبی صلی الله علیه وسلم یثنی علی رجلٍ و یطریه فی مدحه، فقال: أهلکتم او قطعتم ظهر الرجل** (صحیح بخاری، کتاب الشہادات) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا کہ ایک شخص دوسرے شخص کی تعریف کر رہا ہے اور اُس کی تعریف میں وہ مبالغہ کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے اس شخص کو ہلاک کر دیا یا یہ فرمایا کہ تم نے اُس کی کمر توڑ دی۔

اسی طرح خلیفۂ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارہ میں ایک روایت میں آیا ہے کہ اُنہوں نے کہا: **المدح الذبح** (**الأدب المفرد، باب ما جاء فی التمادح**)۔ یعنی مدح کرنا آدمی کو ذبح کرنا ہے۔ اسی طرح ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمر نے ایک شخص کو دوسرے شخص کی تعریف کرتے ہوئے سُنا تو اُنہوں نے کہا: **عقرت الرجل، عقرك الله** (**الأدب المفرد، باب ماجاء فی التمادح**) یعنی تم نے اُس شخص کو ذبح کر دیا، اللہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی کرے۔

حدیث اور آثار کی کتابوں میں اس طرح کی بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ مدح کا طریقہ دینی مزاج کے خلاف ہے۔ بعض اوقات اعتراف واقعہ یا اور کسی مصلحت سے کسی کی تعریف کی جاسکتی ہے۔ مگر عمومی طور پر اسلام میں اُس چیز کو سخت ناپسند کیا گیا ہے جس کو مدح خوانی یا قصیدہ گوئی کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی تعریف مادح کے لیے مصلحت پرستی ہے اور ممدوح کے لیے اُس کو عُجب کی غذا دینا ہے۔ اس لیے یہ فعل مادح اور ممدوح دونوں کے لیے ہلاکت خیز ہے۔

تاہم یہ بات قابل غور ہے کہ احادیث میں تعریف کی مذمت تو کی گئی ہے مگر تنقید کی مذمت نہیں کی گئی۔ غالباً کوئی بھی صحیح حدیث ایسی نہیں جس میں تنقید کے فعل کو اُس طرح مطلق طور پر مذموم

قرار دیا گیا ہو جس طرح مدح کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس تنقید کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ مثلاً بہت سی حدیثوں میں لسان کے ذریعہ نہی عن المنکر کا حکم آیا ہے اور اُس کو ایمان کی لازمی علامت بتایا گیا ہے۔ اسی طرح حدیث میں بتایا گیا ہے کہ سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ایک افضل جہاد ہے، وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا کام تنقید ہی کی زبان میں ہوگا، نہ کہ تعریف کی زبان میں۔ جب بھی ایک شخص کسی برائی کو دیکھے، خواہ برائی کرنے والا کوئی عام آدمی ہو یا خاص آدمی، اور پھر وہ اُس کے خلاف لسانی جہاد کرے تو یہ لسانی جہاد عین وہی فعل ہوگا جس کو تنقید کہا جاتا ہے۔ نقد یا تنقید دراصل لسانی جہاد کا ہی دوسرا نام ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ شریعت میں مدح اور تنقید کے درمیان یہ فرق کیوں کیا گیا ہے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ مدح ایک اخلاقی برائی ہے جب کہ تنقید ایک اعلیٰ درجہ کی علمی اور اخلاقی خوبی ہے۔ کسی معاشرہ میں مدح کا رواج پورے معاشرہ کو منافقت کا معاشرہ بنا دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جس سماج میں تنقید اور اختلاف کو سننے کا مزاج ہو وہ معاشرہ ذہنی اور فکری ترقی کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔

تنقید ایک مسلسل احتساب کا عمل ہے۔ تنقید زندہ معاشرہ کی علامت ہے۔ کسی معاشرہ میں تنقید کا عمل نہ ہونا یا تنقید کو بُرا سمجھنا صرف اُس وقت ہوتا ہے جب کہ معاشرہ زوال کا شکار ہو گیا ہو۔ وہ زندگی کی حرارت کھو بیٹھا ہو۔ کھلے ذہن کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت اُس کے اندر باقی نہ رہی ہو۔ تنقید کی حیثیت ایک علمی اور فکری چیلنج کی ہے۔ چیلنج ہر قسم کی ترقی کی واحد ضمانت ہے۔ جس معاشرہ میں چیلنج نہ ہو وہ معاشرہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔ اسی طرح جو معاشرہ تنقید سے محروم ہو جائے وہ علمی اور فکری ترقی سے بھی محروم ہو جائے گا۔

اس معاملہ کی تفصیل میں نے اپنی کتاب دین انسانیت کے باب ''حریت فکر'' میں بیان کی ہے اور اسلام کے دور اول کی مثالوں سے اُس کو واضح کیا ہے۔ تاہم تنقید اور تنقیص میں بہت زیادہ فرق

ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا درست ہوگا کہ تنقید مکمل طور پر جائز ہے اور تنقیص مکمل طور پر ناجائز۔ تنقید بلاشبہہ ایک مطلوب چیز ہے اور تنقیص بلاشبہہ ایک غیر مطلوب چیز۔

تنقید دراصل علمی اختلاف کا دوسرا نام ہے۔ حقائق و واقعات کی روشنی میں خالص موضوعی انداز میں کسی معاملہ کا تجزیہ کرنا وہ چیز ہے جس کو تنقید کہا جاتا ہے۔ تنقید خواہ بظاہر کسی شخص کے افکار و آراء کے حوالہ سے ہو، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ معاملہ کی اصولی وضاحت ہوتی ہے۔ اُس میں غلط اور صحیح کے درمیان تقابل ہوتا ہے، نہ کہ ایک شخص اور دوسرے شخص کے درمیان۔

اس کے برعکس تنقیص ایک شخصی عیب جوئی ہے۔ تنقیص کرنے والے کے سامنے اصلاً کسی امرِ حق کی وضاحت نہیں ہوتی بلکہ ایک شخص کی تذلیل اور تحقیر ہوتی ہے جس کو اُس نے کسی وجہ سے اپنا مخالف سمجھ لیا ہے۔ تنقیص صرف ایک غیر اخلاقی فعل ہے، وہ کسی درجہ میں بھی کوئی علمی واقعہ نہیں۔ تنقید کا عمل اگر علمی اصول کی بنیاد پر ہوتا ہے تو تنقیص کا عمل کسی شخص کے خلاف ذاتی سبّ وشتم کی بنیاد پر۔

زوال کیا ہے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جو آسمانی تعلیم دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ انہوں نے بھلا دیا (ونسوا حظاً مما ذکروا بہ......، فنسوا حظّا مما ذکروا بہ ...... المائدہ ۱۳۔ ۱۴) اس بھلانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ نے کوئی کانفرنس کر کے اس میں با قاعدہ یہ طے کیا ہو کہ آج سے ہم فلاں چند باتیں یاد رکھیں گے اور بقیہ باتوں کو بھلا دیں گے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کا بھولنا ہمیشہ تاریخی اور نفسیاتی اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ تاریخی طور پر دھیرے دھیرے یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے کہ کچھ چیزیں لوگوں کے زندہ حافظے میں باقی رہتی ہیں اور دوسری چیزیں ان کے زندہ حافظہ سے نکل جاتی ہیں۔ کچھ چیزوں کی اہمیت انہیں یاد رہتی ہے اور کچھ چیزوں کی اہمیت سے وہ بے خبر ہو جاتے ہیں۔

حدیث میں پیش گوئی کی گئی تھی کہ یہود و نصاری نے بگاڑ پیدا ہونے کے بعد جو کچھ کیا وہی سب مسلمان بھی بعد کے زمانے میں کریں گے (لتتبعن سنن من کان قبلکم) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امت محمدی پر بھی ایسا وقت آ سکتا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ لوگ دین کے ایک حصہ سے واقف ہوں اور انہیں دین کے دوسرے حصے کی خبر نہ رہے۔ دین کے بعض حصوں کی ان کے یہاں دھوم ہو اور دوسرے زیادہ بڑے حصہ کو انہوں نے اس طرح چھوڑ رکھا ہو جیسے کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ بھی اس دین کا حصہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر عربی کے ذریعہ ان کے پاس بھیجا تھا۔

کسی قوم پر جب بھی یہ حالت آتی ہے تو وہ مزاج میں بگاڑ کی بنا پر آتی ہے۔ سب سے پہلے قوموں کا مزاج بگڑتا ہے پھر اس کے نتیجہ کے طور پر ان کا اخلاق و کردار بھی بدلتا چلا جاتا ہے۔

مثلاً مختلف اسباب کے تحت ظواہر کو روح کا بدل سمجھ لینا۔ اب ایسا ہوتا ہے کہ دین کی اصل روح کو جاننے اور اپنانے کی فکر نہیں ہوتی بلکہ اس کے خارجی مظاہر ہی کو سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ زوال کی علامت ہے اور یہ زوال ہر امت کے ساتھ بہر حال پیش آتا ہے۔

حقیقی اہمیت

پیغمبر اسلام کے طریقہ کا ایک پہلو یہ تھا کہ آپ کی نظر ہمیشہ حقائق پر ہوتی تھی، نہ کہ ظواہر پر۔ ظواہر میں اگر بے خبری کی بنا پر کوئی فرق ہو جائے تو اس کو آپ نا قابل لحاظ سمجھتے تھے۔ البتہ حقیقی اہمیت والی باتوں کے بارے میں آپ کا رویہ ہمیشہ بہت سخت ہوتا تھا۔

پیغمبر اسلام کے آخری حج کا ایک واقعہ بخاری، مسلم، ابوداؤد میں تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ آیا ہے۔ یہ آپ کی زندگی کا آخری سال تھا۔ آپ حج کا فریضہ ادا کرنے کے بعد منیٰ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ آپ کے پاس آتے اور حج کے مسائل دریافت کرتے۔ کوئی کہتا کہ مجھے مسئلہ معلوم نہ تھا چنانچہ میں نے ذبح کرنے سے پہلے بال منڈا لیا۔ کوئی کہتا کہ میں نے رمی سے پہلے نحر (قربانی) کر لی، وغیرہ۔ آپ ہر ایک سے کہتے کہ کرلو، کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح بار بار لوگ آتے رہے اور تقدیم اور تاخیر کی بابت سوال کرتے رہے۔ آپ ہر ایک سے یہی کہتے کہ کوئی حرج نہیں، کوئی حرج نہیں، (افعل ولا حرج) (سنن ابی داؤد ۲/ ۲۱۷، ۲۱۸)

ابوداؤد کی روایت میں مزید ان الفاظ کا اضافہ ہے: کرلو کوئی حرج نہیں۔ حرج تو اس شخص کے لیے ہے جو ایک مسلمان کو بے عزت کرے۔ ایسا ہی شخص ظالم ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے حرج کیا اور ہلاک ہوا۔

دین میں اصل اہمیت معانی کی ہے، نہ کہ ظواہر کی۔ ایک شخص ظاہری چیزوں کا زبردست اہتمام کرے مگر معنوی پہلو کے معاملہ میں وہ غافل ہو تو ایسا شخص اسلام کی نظر میں بے قیمت ہو جائے گا۔

اللہ ہمیشہ آدمی کی نیت کو دیکھتا ہے۔ نیت اگر اچھی ہے تو ظاہری چیزوں میں کمی یا فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر آدمی کی نیت اچھی نہ ہو تو اللہ کی نظر میں اُس کی کوئی قیمت نہیں، خواہ اُس نے ظواہر کے معاملہ میں کتنا ہی زیادہ اہتمام کر رکھا ہو۔ ظاہری خوش نمائی سے انسان فریب میں آسکتا ہے مگر ظاہری خوش نمائی کی خدا کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔

ربانیات

زندہ قلب

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه انه قال: اُطلُب قَلْبَکَ فی ثَلاثَة مَواطِنَ۔ عند سماع القرآن وفی مجالس الذِّکرِ و فی اوقات الخلوة. فَان لَم تَجِدْهُ فی هٰذه المَواطِنَ فَسَلِ الله أن یَمُنَّ علیک بقلبٍ فإنَہُ لَا قَلْبَ لَکْ.

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تم تین مواقع پر اپنے دل کو تلاش کرو۔ قرآن سننے کے وقت اور خدا کے ذکر کی مجلسوں میں اور تنہائی کے وقتوں میں۔ اگر ان مواقع پر تم اپنے دل کو نہ پاؤ تو اللہ سے درخواست کرو کہ وہ تم کو ایک دل دے دے۔ کیوں کہ تمہارے پاس دل موجود نہیں۔

دل آدمی کے جسم میں کیفیت کا سرچشمہ ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بتاتا ہے کہ ایک مومن سے مختلف احوال میں جو قلبی کیفیات مطلوب ہیں، وہ کیا ہیں۔ مثلاً قرآن سننے کے وقت، خدا کی یاد کی مجلسوں میں اور اسی طرح تنہائی کے لمحات میں، یہ تین مواقع وہ ہیں جب کہ دینی اور ربانی کیفیات خصوصی طور پر آدمی کے اندر جاگتی ہیں۔ ان مواقع پر غافل آدمی بھی چونک پڑتا ہے۔ سویا ہوا آدمی بھی جاگ اٹھتا ہے۔ وہ فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آدمی کا دل اگر زندہ ہو تو اس کا حال یہ ہوگا کہ جب اس کے سامنے قرآن پڑھا جائے گا تو اس سے اس کو ربانی غذا ملنے لگے گی۔ جب اس کو خدا کی یاد دلائی جائے گی تو اپنے خالق و مالک کے بارہ میں اس کے اندرونی احساسات جاگ اٹھیں گے۔ جب وہ تنہائی میں ہوگا تو اس کے اندر احتساب خویش کی کیفیت ابھر آئے گی۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے کھڑا ہوا پائے گا۔

اگر کسی آدمی کا حال یہ ہوگا کہ یہ خصوصی مواقع بھی اس کی روح میں ہلچل پیدا نہ کریں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر کی کھیتی ویران ہوگئی ہے۔ اس کے اندر فطرت ربانی کے سوتے خشک ہوگئے ہیں۔ جو شخص اپنے آپ کو اس حال میں پائے، اس کو چاہئے کہ وہ اللہ سے اپنے لئے ایک زندہ قلب اور کیفیت سے بھری ہوئی روح کا طالب بنے۔ کیوں کہ اس کے بغیر انسان کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے بغیر کسی انسان پر سعادتوں کا دروازہ کھلنے والا نہیں۔

قربت خداوندی

ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ: مرضت فلم یعدنی ابن آدم (مسند احمد ۲/ ۴۰۴)۔ یعنی میں بیمار ہوا مگر ابن آدم نے میری عیادت نہیں کی۔ اس کی وضاحت خود حدیث میں اس طرح ہے کہ اگر ابن آدم فلاں مریض کے پاس جاتا تو وہ مجھ کو وہاں پاتا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا اس مریض کے پاس اسی طرح موجود تھا جس طرح کوئی انسان ایک مریض کے پاس موجود ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اگر سچے جذبہ کے ساتھ مریض کی عیادت کرے تو اس عمل کے دوران وہ ملاقات رب کا تجربہ کرے گا۔ یہ الفاظ تجربۂ رب کے معنی میں ہیں نہ کہ مشاہدۂ رب کے معنی میں۔

ایک مومن کے علم میں یہ بات آئی کہ خدا کا فلاں بندہ بیمار ہے۔ مومن کے دل میں اس کے ساتھ ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس نے اس کے حق میں دعا کی۔ پھر وہ اس کی ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ روانہ ہوا تاکہ اس سے مل کر اس کا حال دریافت کرے اور اس کی عیادت کرے۔ یہاں تک کہ وہ مریض کے پاس پہنچا۔ اس نے سچی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت اسے دیکھا: اس کے حق میں سچے جذبہ کے تحت دعائیں کیں۔ اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا اور دل سے اس کے اندر یہ جذبہ ابھرا کہ اللہ اس کو جلد سے جلد صحت مند کر دے۔

یہ پورا عمل جو کہ تمام تر خدائی جذبہ کے تحت تھا، اس کے دوران برابر خدا کا تصور اس کے ذہن پر چھایا رہا۔ مریض سے ربط کے دوارن وہ ہر لمحہ قربت خداوندی کا تجربہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شدت احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

یہی مطلب ہے ان الفاظ کا کہ اگر انسان اپنے بھائی کی مخلصانہ عیادت کرے گا تو وہ وہاں خدا کو پائے گا۔ اس کے احساسات کی دنیا میں خدا اتر آئے گا۔ مریض کی عیادت اس کے لئے ملاقات رب کا تجربہ بن جائے گی۔

حدیث قدسی

صحیح البخاری (کتاب المرضیٰ) میں ایک حدیث قدسی اس طرح آئی ہے: اذا ابتلیت عبدی بحبیبتیه فصبر عوّضته منهما الجنة، یرید عینیه (فتح الباری ۱۰/۱۲۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں اپنے کسی بندہ کو اس کی دو محبوب آنکھوں سے آزماؤں اور وہ اس پر صبر کرے تو میں ان دونوں کے بدلے اسے جنت دے دیتا ہوں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنکھ سے محرومی اور جنت کے حصول میں کوئی لازمی رشتہ ہے۔ آنکھ سے محرومی بذات خود جنت میں داخلہ کا سبب نہیں بن جاتی۔ اصل یہ ہے کہ اس محرومی پر سچا صبر کرنے والے کے اندر وہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو اس کو جنت میں داخلہ کا مستحق بنا دیں۔

ایک عالم کا واقعہ ہے۔ وہ دینی مطالعہ میں مشغول رہتے تھے اور کتابیں لکھ کر دین کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ مگر ادھیڑ عمر کو پہنچ کر ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔ یہ ان کے لئے انتہائی سخت حادثہ تھا۔ مگر انھوں نے اس پر کامل صبر کر لیا۔ اس صبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ذہن مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے رخ پر چلنے کے بجائے مثبت رخ پر سوچنے میں مشغول ہو گیا۔

آخر کار ان کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی جس کے ذریعہ سے وہ اپنے آپ کو دوبارہ کار آمد بنا سکیں۔ انھوں نے اپنی کوششوں کو تحریر کے بجائے تقریر کی طرف موڑ دیا۔ ان کے حافظہ میں معلومات کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ یہ معلومات اب نئے انداز سے تقریر کی صورت میں ظاہر ہونے لگیں۔ بہت جلد وہ ایک کامیاب مقرر کی حیثیت سے عوام وخواص میں مقبول ہو گئے۔

ان کی باچشم تحریروں میں اگر معلومات دین کی خصوصیت ہوتی تھی، تو ان کی بے چشم تقریروں میں معلومات کے ساتھ پرسوز آواز کا اضافہ ہو گیا۔ اس طرح آنکھ کے حادثہ نے ان کے جنتی کردار کو بڑھا کر ان کے استحقاق جنت میں مزید اضافہ کر دیا۔ خدا کی نظر میں وہ پہلے سے زیادہ رحمت خداوندی کے مستحق قرار پائے۔

داخلی کیفیت

قال رسول الله ﷺ ان الله لاینظر الی صورکم واموالکم لکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم (مشکوۃ ۳۔ ۱۴۶۲)۔رسول اللہ نے فرمایا کہ اللہ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے مال کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ وہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

عمل کے دو پہلو ہیں، خارجی اور داخلی۔ اللہ کے یہاں کسی عمل کی قیمت اس کی صورت خارجی کے اعتبار سے متعین نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی کیفیت داخلی کے اعتبار سے متعین ہوتی ہے۔ داخلی احساس اور اندرونی محرک کے اعتبار سے اگر آدمی اللہ کی رضا کے لئے متحرک ہوا ہے تو اس کا عمل قابل انعام ٹھہرے گا۔ اور اگر آدمی کے داخلی وجود اور اس کی اندرونی شخصیت میں اللہ کی رضا طلبی کے سوا کوئی اور جذبہ بسا ہوا تھا تو ایسے آدمی کا عمل رد کر دیا جائے گا۔ وہ اللہ کے یہاں کسی انعام کا مستحق نہیں قرار پائے گا۔

ایک شخص دینی سرگرمی دکھاتا ہے۔ اس کی دینی سرگرمی اگر خالص اللہ کے لئے ہو تو وہ آخرت کی میزان میں قابل قدر ہے، اور اگر اس کی سرگرمی کا محرک لوگوں کے درمیان عزت حاصل کرنا ہو تو ایسی دینی سرگرمی کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ ایک شخص اللہ کے نام پر مال خرچ کرتا ہے۔ اگر یہ کام اس نے رضائے الٰہی کی طلب میں کیا ہے تو وہ آخرت میں اس کا انعام پائے گا۔ لیکن اگر اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کے درمیان نمایاں ہو تو اس کا مالی انفاق آخرت میں اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کوئی کام خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی قدر و قیمت کا تعین اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے پیچھے کام کرنے والے جذبہ سے ہوتا ہے نہ کہ محض اس اعتبار سے کہ وہ ظاہری طور پر لوگوں کو کیسا دکھائی دیتا ہے۔ جو شخص دنیا کے لئے کام کرے، اس نے دنیا ہی میں اپنے عمل کا بدلہ پالیا۔ جو شخص آخرت کے لئے کام کرے تو اس کا عمل آخرت کے دفتر میں محفوظ ہے۔ وہ اپنی آخرت کی زندگی میں اس کا بہترین اجر پائے گا۔ اور بلا شبہ سب سے اچھا اجر آخرت کا اجر ہے۔

اسلام کی شناخت

اسلام کی شناخت ملّی نہیں ہے بلکہ ربّانی ہے۔ مسلم کی پہچان یہ نہیں ہے کہ اس کا کلچر الگ ہو۔ مسلم کی حقیقی پہچان یہ ہے کہ اس کی شخصیت عام انسانوں سے مختلف ہو۔ دور اول کے عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان یہ نہیں تھی کہ آپ کی زبان، آپ کا لباس، آپ کا رہن سہن دوسروں سے مختلف تھا۔ آپ کی پہچان یہ تھی کہ آپ الامین ہیں۔ بہت سے خداؤں کے دیس میں آپ ایک خدا کی عبادت کرنے والے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ: خِيَارُكُم الَّذِينَ إِذَا رُؤُوا ذُكِرَ اللهُ (ابن ماجہ، کتاب الزھد) یعنی تم میں بہتر وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں دیکھا جائے تو خدا یاد آئے۔

اسلامی شناخت کا صحیح تصور یہی ہے۔ سچا مومن وہ ہے جس کو دیکھنا اور جس سے ملنا آدمی کے لیے ایک ربانی تجربہ بن جائے۔ جس کا کلام خدا کی عظمت کا اعلان بنا ہوا ہو۔ جس کے سلوک میں خلق انسان کی خوشبو بسی ہوئی ہو۔ جس کا بولنا اس کے سننے والوں کو چپ کر دیتا ہو۔ اور جس کی خاموشی میں لوگوں کو تقریر کی کیفیت محسوس ہونے لگے۔

مومن وہ انسان ہے جس کو خدا کی معرفت حاصل ہو گئی ہو۔ جس کا سینہ خدا کی یاد سے پھٹ پڑا ہو۔ جو دیکھنے سے پہلے خدا کو دیکھنے لگا ہو۔ ایسا انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی ایک نشانی بن جاتا ہے۔ اس کی پوری شخصیت ایک آسمانی نور میں نہائی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسا آدمی اپنے لباس سے نہیں پہچانا جاتا۔ وہ اپنی اس اندرونی شخصیت سے پہچانا جاتا ہے جو اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ وہ اس کے لباس کو بھی ڈھک لیتی ہے۔

یہی ربانی شخصیت مومن کی اصل پہچان ہے۔ اس کو دیکھنا کسی گروہی امتیاز کو دیکھنا نہیں ہوتا۔ اس کو دیکھنا ایک ایسی ہستی کو دیکھنا بن جاتا ہے جو خدا کی یاد دلا دے، جو دیکھنے والے کے اوپر خدا کی حقیقتِ اعلیٰ کو منکشف کر دے۔

اسلامی شناخت یہ ہے کہ آدمی کا طرز فکر دوسروں سے مختلف ہو جائے۔ اس کے قول میں ایک نیا آہنگ پیدا ہو جائے۔ اس کا اخلاق دوسروں سے الگ دکھائی دینے لگے۔

اسلامی اصول

عن حذیفۃ ، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: قال: لا ینبغی لمسلم ان یذل نفسہ۔ قیل وکیف یذل نفسہ۔ قال یتعرض من البلاء لما لا یطیق۔

(مسند الامام احمد بن حنبل ۵/ ۴۰۵)

حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص کیسے اپنے آپ کو ذلیل کرے گا۔ فرمایا کہ وہ ایسی بلا کا سامنا کرے جس سے وہ مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

اس حدیث رسول سے اسلامی زندگی کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں جب کسی کی طرف سے کوئی بلا یا کوئی ناپسندیدہ صورتحال پیش آئے تو اس وقت یہ درست نہیں ہے کہ آدمی بھڑک کر صاحب بلا سے ٹکرا جائے۔ بلکہ اس کو سوچ سمجھ کر یہ طے کرنا چاہئے کہ دو ممکن راستوں میں سے کون سا راستہ اس کے لئے زیادہ مناسب ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی یہ محسوس کرے کہ اس کے پاس اتنی کافی قوت ہے کہ وہ کامیاب طور پر مقابلہ کرکے زیادتی کرنے والوں کو مجبور کرسکتا ہے کہ وہ اپنی زیادتی سے باز آئیں۔ اگر ایسا ہو تو آدمی کو چاہئے کہ وہ جم کر مقابلہ کرے تاکہ فساد ختم ہو اور اصلاح کی حالت قائم ہو جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ٹھنڈے غور وفکر کے بعد آدمی اس نتیجہ پر پہنچے کہ دونوں فریقوں میں طاقت کا تناسب ناقابل عبور حد تک غیر متناسب ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ اگر مقابلہ آرائی کا طریقہ اختیار کیا گیا تو برعکس نتیجہ نکلے گا اور چھوٹا نقصان زیادہ بڑا نقصان بن جائے گا۔ اگر ایسا ہو تو لازم ہے کہ آدمی صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ اور صاحب بلا سے نہ الجھے۔

مزید یہ کہ اعراض کا مطلب بزدلی نہیں ہے بلکہ وقفۂ تیاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے وقت اور اپنی طاقت کو ٹکراؤ سے بچا کر مزید تیاری میں لگائے، وہ اپنے آپ کو زیادہ مستحکم بنانے کی تدبیر کرے۔ تاکہ آئندہ کوئی شخص اس کے خلاف زیادتی کی ہمت نہ کرے، اور اگر کوئی زیادتی کی کارروائی کرے تو آدمی کے پاس اس کے توڑ کے لئے کافی طاقت موجود ہو۔

یہ بھی اسلام کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے۔

صحت فکر

روایات میں پیغمبر اسلام ﷺ سے جو دعائیں نقل کی گئی ہیں، ان میں سے ایک دعا یہ ہے:

اللّٰهم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه وار نا الاشياء كما هي (اے اللہ، تو ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس کی پیروی کی توفیق دے اور ہمیں باطل کو باطل کے روپ میں دکھا اور ہمیں اس سے بچنے کی توفیق دے۔ اور اے اللہ، تو ہمیں چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں)۔

موجودہ دنیا میں انگنت چیزیں ہیں، اور ہر چیز کے بے شمار پہلو ہیں۔ اسی طرح خود انسان بھی چیزوں کو کسی ایک ہی زاویہ سے نہیں دیکھ پاتا۔ ہر شخص اپنی ذہنی اور قلبی حالت کے تحت چیزوں کو مختلف زاویہ سے اور مختلف رخ سے دیکھتا ہے۔ اس بنا پر ہر آدمی کے لئے اور ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ کوئی خلاف واقعہ رائے قائم کرلے، وہ ایک ایسی رائے قائم کرلے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔

ایسی حالت میں آدمی اگر کوئی درست رائے قائم کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اسے بہت زیادہ اہتمام کرنا پڑے گا۔ وہ سارے متعلق پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اپنی رائے بنائے۔ اسی کے ساتھ وہ مسلسل خدا سے صحت فکر کی دعا کرتا رہے۔ کیوں کہ کوئی بھی شخص خدا کی مدد کے بغیر اس دنیا میں درست رائے تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس دنیا میں چیزیں اس طرح ملی جلی ہیں کہ ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ آدمی حق کو باطل کے روپ میں دیکھ لے، اور باطل اس کو حق کے روپ میں دکھائی دینے لگے۔ ایسی حالت میں غیر معمولی کوشش کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ آدمی حق کو حق کی صورت میں دیکھے، اور باطل اس کو صرف باطل کے روپ میں نظر آئے۔

یہ کسی آدمی کے لئے بہت بڑی نعمت ہے کہ اس کو وہ نگاہ حاصل ہو جائے جو چیزوں کو ویسا ہی دیکھنے لگے جیسا کہ باعتبار حقیقت وہ ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ سب سے زیادہ اسی کی کوشش کرے، وہ سب سے زیادہ اسی کو خدا سے مانگے۔

فراست مومن

قرآن میں تاریخ کے بعض واقعات کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: انّ فی ذلک لآیات للمتوسمین (الحجر ۷۵) اس آیت میں متوسم کی تشریح متفرس سے کی گئی ہے۔ یعنی ان تاریخی واقعات میں نشانی ہے اہل فراست کے لئے (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۰/ ۴۲)

اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی آئی ہے جو اس کی مزید وضاحت کرتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق، اس حدیث رسول کے الفاظ یہ ہیں:

احذروا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور الله وینطق بتوفیق الله (جامع البیان عن تاویل آی القرآن للطبری ۱۴/ ۴۷)	مومن کی فراست سے بچو کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اور وہ اللہ کی توفیق سے کلام کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی پر ایمان آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ چیزوں کو ربانی نظر سے دیکھے اور معاملات کے اوپر اس اعلیٰ اسلوب میں کلام کرنے لگے جو خدا کی خصوصی توفیق سے کسی کو حاصل ہوتا ہے۔

مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن چیزورں کے ظاہر کو دیکھ کر اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ جب کہ مومن چیزوں کے ظاہر سے گزر کر اس کے باطن تک پہنچتا ہے۔ وہ اندرونی حقائق کے اعتبار سے اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ یہی وہ خاص صفت ہے جس کی وجہ سے دونوں کی رایوں میں یہ فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک کی رائے بے پناہ حد تک طاقت ور ہوتی ہے۔ اور دوسرے کی رائے بے وزن اور بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

مثلاً ایک شخص ہے جس کو اللہ سے تعلق نہیں۔ وہ بس اپنی ذات میں جیتا ہے اور اپنی عقل سے رہنمائی لیتا ہے۔ ایسے شخص کو ایک آدمی گالی دیتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ اب کیا ہوگا۔

اب یہ ہوگا کہ اس شخص کی انا بھڑک اٹھے گی۔ اس کی عقل اس کو بتائے گی کہ اس آدمی کو سبق سکھانا ہے۔ اگر میں نے اس کو سبق نہیں سکھایا تو وہ مجھ کو بزدل سمجھ لے گا اور آئندہ میرے خلاف زیادتیوں کے لئے وہ اور بھی جری ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ مذکورہ آدمی سے لڑ جائے گا۔ خواہ اس کے نتیجہ میں اس کو مزید تباہی کے سوا کچھ اور ملنے والا نہ ہو۔

اس کے برعکس جس آدمی کے خوف خدا نے اس کو متواضع بنا رکھا ہو۔ جس کو خدا کی بڑائی کی معرفت اس طرح حاصل ہو جائے کہ اس کے اندر سے اپنی بڑائی کا احساس نکل جائے۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے خلاف اشتعال انگیز بات کرے تو اس کی تواضع کی نفسیات اس کو اس انجام سے بچائے گی کہ وہ اشتعال انگیزی پر بھڑک اٹھے۔ اس کا خوفِ خدا اس بات کا ضامن بن جائے گا کہ بھڑکانے والی بات کے باوجود وہ معتدل بنا رہے۔

اشتعال انگیزی پر بھڑک اٹھنے والا آدمی اگر اپنی عقل کو کھو بیٹھتا ہے تو اشتعال انگیزی پر نہ بھڑکنے والے آدمی کو یہ خصوصیت حاصل ہوگی کہ اس کے جذبات پوری طرح اس کے قابو میں ہوں اور اس کی عقل معاملے کو ٹھیک ٹھیک سمجھے اور درست طور پر اپنی جوابی کارروائی کا منصوبہ بنائے۔

مومن کی یہی صفت ہے جو اس کو صاحب فراست بناتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ بے پناہ حد تک ناقابل تسخیر ہو جاتا ہے۔

مومنانہ عمل، دوسرے لفظوں میں، ایک صابرانہ عمل ہے۔ اور غیر مومنانہ عمل اس کے مقابلے میں ایک عاجلانہ عمل۔ صابرانہ کارروائی منصوبہ بند کارروائی کا نام ہے اور عاجلانہ کارروائی غیر منصوبہ بند کارروائی کا نام۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عاجلانہ کارروائی ہمیشہ ناکام ہوتی ہے، اور صابرانہ کارروائی ہمیشہ کامیاب۔ تاریخ کے تمام تجربات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسلّمہ ہے جس میں کوئی بھی استثناء نہیں۔

کامیاب زندگی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس کے ساتھ میں جیوں، اور وہ لمبی نہ ہو کہ میں اسے بھول جاؤں۔ آپ نے فرمایا: لا تغضب (موطا امام مالک، ۶۵۲) یعنی تم غصہ نہ کرو۔ یہ موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا سب سے زیادہ یقینی اصول ہے۔ ایک فرد کے لئے بھی اور پوری قوم کے لیے بھی۔

غصہ کیا ہے۔ غصہ دراصل ناپسندیدہ صورتِ حال کا منفی جواب (negative response) ہے۔ موجودہ دنیا میں مختلف اسباب سے ہر لمحہ کسی نہ کسی ناپسندیدہ صورت حال سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کبھی کوئی ایسی بات پیش آجاتی ہے جس سے آپ کی انا بھڑک اٹھتی ہے۔ کبھی کسی کی ایک روش سے آپ کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی مفاد کا ٹکراؤ آپ کے اندر مخالفانہ جذبات کو جگا دیتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی سے آپ کی امیدیں پوری نہیں ہوتیں اور آپ کے اندر اس کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی سب وہ چیزیں ہیں جن کو انسانی زبان میں غصہ کہا جاتا ہے۔

یہ غصہ آدمی کے لیے بے حد مہلک ہے۔ وہ آدمی سے اس کی سوچنے کی صلاحیت کو چھین لیتا ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے عمل کا نقشہ بنائے۔ وہ اس کو تعمیر کے بجائے تخریب کے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ غصہ آدمی دوسرے کے خلاف کرتا ہے، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ہمیشہ آدمی کے اپنے نقصان کا باعث بنتا ہے۔

موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اُس کو مشتعل کر دیں، جو اُس کے اندر منفی نفسیات کو جگا دیں۔ اس صورت حال کو بدلنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں کامیاب زندگی کی تعمیر کا طریقہ صرف یہ ہے کہ آدمی صبر و تحمل کی روش اختیار کرے۔ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہونے کا آرٹ سیکھ لے۔ وہ اُن حالات کے ساتھ ایڈجسٹ کر کے رہ سکے جن کو بدلنے کی قدرت اُس کو حاصل نہیں۔

زندگی میں وہ صورت حال کیوں پیش آتی ہے جب کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کو دوسرے آدمی کے خلاف غصہ آئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں خدا نے ہر ایک کو آزادی دی ہے کیوں کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے، اور آزادی کے بغیر امتحان ممکن نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب غصہ کی صورت حال پیدا ہو تو آدمی کو یہ سوچنا چاہئے کہ وہ اگر اپنے غصہ کو انتقام بنائے گا اور فریق ثانی سے لڑنے کی کوشش کرے گا تو اس کا یہ لڑنا کسی انسان سے لڑنا نہیں ہوگا بلکہ خدا کے مقرر کئے ہوئے فطری نقشہ سے لڑنا ہوگا۔ ایسی حالت میں غصہ کرنے والے کی ناکامی یقینی ہے۔ کیوں کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ کوئی بھی شخص اتنا طاقتور نہیں کہ وہ خدا کے بنائے ہوئے فطری نقشہ سے لڑ کر جیت سکے۔ جب ایک آدمی غصہ کو برداشت کر لے تو وہ اپنے آپ کو بہت بڑے خدائی انعام کا مستحق بناتا ہے کیوں کہ ایسے موقع پر غصہ کو برداشت کر لینا خدا کے فطری نظام کے اعتراف کے ہم معنی ہوتا ہے۔

حکمت اسلام

خطرہ کہاں ہے

ایک عربی پرچہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا: **الاقلیات المسلمة تواجه خطر الذوبان**۔ یعنی مسلم اقلیتوں کو اس خطرہ کا سامنا ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ میں گھل مل جائیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ **الاسلام یعلو ولا یعلیٰ** (اسلام ہمیشہ غالب رہتا ہے وہ کبھی مغلوب نہیں ہوتا) فتح الباری ۲۶۱/۳۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ کی حیثیت عطا فرمائی ہے تو اس کے لیے مغلوب ہونے یا جذب ہوجانے کا خطرہ کیوں محسوس کیا جارہا ہے۔

اس کی وجہ بالکل سادہ ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں میں فرق نہ کرنا ہے۔ کوئی مسلم گروہ اپنے زوال کی بنا پر مذکورہ قسم کے خطرہ میں مبتلا ہوسکتا ہے لیکن اسلام، ایک ربانی نظریہ کی حیثیت سے اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کو کسی بھی حال میں غیر اسلامی طاقتوں سے مغلوب ہونے یا ان میں جذب ہوجانے کا خطرہ لاحق ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو کہ وہ کسی غیر مسلم طاقت سے مغلوب ہوجائیں گے یا اس میں جذب ہوجائیں گے تو پیشگی طور پر یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی وجہ خود مسلمانوں کا اسلام میں کمزور ہونا ہے نہ کہ غیر مسلموں کا ان کے مقابلہ میں طاقتور ہوجانا۔

اس لیے جب بھی اس قسم کا خطرہ پیدا ہو تو مصلحین کو چاہئے کہ وہ خود مسلم نسلوں کو دوبارہ اسلام پر اٹھانے کی کوشش کریں۔ وہ ان کے کیس کو قومی کیس کے بجائے اسلام کا کیس بنا دیں۔ اس کے بجائے غیر مسلم طاقتوں کے خلاف قولی یا عملی ہنگامہ آرائی کرنا ایک غیر متعلق فعل ہے جس کا خدا کی اس دنیا میں کوئی فائدہ نکلنے والا نہیں۔ مسلمانوں کا ہر مسئلہ داخلی کمزوری کا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں کے ہر مسئلہ کو صرف داخلی استحکام کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے۔

اصلاح میں تدریج

ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ نے فرمایا کہ قرآن میں سب سے پہلے وہ آتیں اور صورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت کا اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوگئے تو اس کے بعد حلال وحرام کے احکام اترے۔ اور اگر ایسا ہوتا کہ شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، بحواله فتح الباری، ۸/۶۵۵)

اس روایت سے ایک عظیم حکمت نبوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی عملی حکمت ہے جس کو تدریج (graduation) کہا جاتا ہے۔ انسان کی اصلاح ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ انسان عام طور پر کچھ خیالات اور عادات سے مانوس ہوجاتے ہیں۔ وہ اسی کو درست سمجھنے لگتے ہیں۔ اس بنا پر وہ کسی نئی چیز کو فوری طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں انسانوں کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کام کو حکمت اور تدریج کے ساتھ کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں پہلے لوگوں کی سوچ کو بدلا۔ لوگوں کے اندر قبولیت کا مزاج پیدا کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کے اندر اصلاح کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہوگئی تو اس کے بعد آپ نے شرعی احکام کا نفاذ فرمایا۔ اگر آپ فکری تطہیر اور مزاج سازی کے بغیر شریعت کے قوانین نافذ کرتے تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہوتا، اور وہ انقلابی نتیجہ برآمد نہ ہوتا جو عرب کے سماج میں برآمد ہوا۔

خاموشی ضروری ہے

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت)

حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ بولنا۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں بولنا انتہائی ضروری ہوتا ہے اس لیے اس شخص کو گونگا شیطان (شیطان اخرس) کہا گیا ہے جو بولنے کے موقع پر نہ بولے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب کہ چپ رہنا ہی زیادہ صحیح اور ضروری ہے۔

خاموشی کے ضروری ہونے کی ایک مثال غزوۂ احد کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے تھے اور ایک غار میں لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے اعلان کر دیا کہ محمدؐ قتل کر دیئے گیے۔ صحابہ پر سراسیمگی چھا گئی۔ اس دوران ایک صحابی کی نظر آپ پر پڑی۔ وہ بول پڑے کہ رسول اللہ یہاں ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بولے بغیر اشارہ سے ان کو منع کیا کہ چپ رہو (اشار الیہ الرسول ان اصمت) اس کی ایک مثال وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے ساتھی سے کہو کہ چپ رہو، جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تم نے لغو فعل کیا (اذا قلت لصاحبك اسكت والامام يخطب فقد لغوت)

انفرادی مجالس میں بھی خاموشی کا یہ اصول ضروری ہے۔ مگر جب معاملہ قوم کا ہو تو اس کی اہمیت لاکھوں گُنا بڑھ جاتی ہے۔ کسی نازک موقع پر ایک رہنما کی خاموشی ایک بڑے فساد کو روکنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک رہنما کی بے موقع تقریر ایک ایسا فساد برپا کر سکتی ہے جس میں سیکڑوں انسان مارے جائیں اور کروروں روپے کی جائداد جلا کر خاک کر دی جائے۔ اسی مفہوم میں سسٹر کنسولتا (Sister Consolata) نے کہا ہے کہ کسی قوم کی ناکامیوں کی سب سے زیادہ تعداد کا سبب خاموشی کے اصول کو توڑنا ہے:

The greatest number of failings in a community come from breaking the rule of silence.

خاموشی کی طاقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں حدیث میں آتا ہے کہ آپ دیر دیر تک خاموش رہتے تھے : فکان طویل الصمت (مسند احمد) آپ نے فرمایا کہ تم لوگ خاموشی کا طریقہ اختیار کرو : فعلیکم بالصمت (الدارمی) الترمذی، الدارمی، مسند احمد میں ہے آپ نے فرمایا کہ جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی (من صمت نجا)

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک اہم پہلو وہ ہے جو طریق کار سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ شور وغل کا طریقہ اختیار کرنے والا اس دنیا میں ناکام ونامراد رہتا ہے۔ اور جو آدمی خاموش تدبیر کا طریقہ اختیار کرے، اس کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوگی کہ قوانین فطرت اس کا ساتھ دیں گے اور وہ کامیابی کی مطلوب منزل تک پہنچ کر رہے گا۔

لاویٹر (Johann Kaspar Lavater) ۱۷۴۱ میں زیورک میں پیدا ہوا، ۱۸۰۱ میں وہیں اس کی وفات ہوئی۔ فطرت کے اسی قانون کو اس نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ وہ شخص بولنا نہیں جانتا جو چپ نہیں رہ سکتا۔ وہ اس سے اور بھی کم واقف ہے کہ زیادہ موثر طور پر کوئی کام کس طرح کیا جائے :

He knows not how to speak who cannot be silent;
still less how to act with vigor and decision.

چپ رہنے والا سوچتا ہے، اور جو آدمی سوچے وہی اس لائق ہوتا ہے کہ بہتر اور موثر انداز میں کام کر سکے۔ اسی طرح جو آدمی چپ رہتا ہے وہ اپنے ذہن میں اپنے عمل کا نقشہ بناتا ہے۔ وہ منصوبہ بند انداز میں اپنے عمل کا خاکہ تیار کرتا ہے، اور جو آدمی منصوبہ بند صورت میں اپنا عملی اقدام کرے، اس کا یہ فطری حق ہے کہ خدا کی اس دنیا میں وہ لازماً کامیاب ہو۔

خاموشی زیادہ بہتر کلام ہے۔ خاموشی زیادہ گہرے انداز میں عمل کرنا ہے۔ خاموش رہنے والا اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو زیادہ نتیجہ خیز طور پر استعمال کر سکے۔

سنت کے خلاف

جنوری ۱۹۸۷ کا واقعہ ہے۔ شہر کی ایک بس ایک بڑی مسلم تعلیم گاہ کے سامنے سے گذری۔ اتفاق سے ایک مسلمان طالب علم بس کی زد میں آگیا اور اس کے نیچے دب کر ہلاک ہوگیا۔ حادثہ کی خبر سن کر تعلیم گاہ کے مسلم طلبہ وہاں آئے تو ڈرائیور بھاگ چکا تھا۔ البتہ بس سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ طلبہ نے بس کو آگ لگادی۔ مزید انھوں نے یہ کیا کہ جو بس ادھر سے گذرتی اس کو روکتے اور آگ لگاتے۔ آگ بجھانے کے لیے فائر بریگیڈ کے لوگ آئے تو ان کو پتھر مار کر بھگا دیا۔ پولیس آئی تو انھوں نے پولیس پر بھی پتھر مارنے شروع کیے۔

اب پولیس کی باری تھی۔ پولیس غصہ میں بے قابو ہوکر طالب علموں کے اوپر ٹوٹ پڑی۔ اس کے پاس ہتھیار تھے۔ اس نے نہ صرف یہ کیا کہ سڑک پر کھڑے ہوئے طالب علموں کو مارا بلکہ وہ ہاسٹل میں اور تعلیم گاہ کے کمروں میں گھس گئی۔ اس نے سیکڑوں طالب علموں کو مار مار کر بری طرح زخمی کر دیا۔ وغیرہ۔

اس طرح کے واقعات ہندستان میں پچھلے ۴۰ سال سے مسلسل پیش آرہے ہیں۔ ان کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں مگر کہانی سب کی ایک ہے۔ ایسا ہر واقعہ ہمیشہ مسلمانوں کی کسی اشتعال انگیز کارروائی سے شروع ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کے شدید جانی و مالی نقصان پر ختم ہوتا ہے۔ چھوٹے بڑے تمام واقعات کو شمار کیا جائے تو چالیس سال میں ان کی تعداد ۴۰ ہزار تک پہونچ چکی ہوگی۔ جب بھی ایسا واقعہ ہوتا ہے تو مسلمانوں کے تمام اصاغر اور اکابر بلا استثنار یہ کرتے ہیں کہ وہ یک طرفہ طور پر پولیس اور انتظامیہ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ کوئی ایک بھی قابل ذکر شخص ایسا نہیں جو اس طرح کے معاملات میں مسلمانوں کو سمجھائے اور انھیں تنبیہ کرے۔

ہمارے یہ تمام لیڈر بلاشبہ سنت کے خلاف عمل کر رہے ہیں۔ اور حدیث کے مطابق، ہر بات جو سنت کے خلاف ہو وہ بدعت ہے۔ اور ہر بدعت کا آخری انجام تباہی ہے۔ پچھلی نصف صدی سے مسلمان جو کچھ بھگت رہے ہیں وہ سنت سے اسی انحراف کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کا مذکورہ عمل سنت سے انحراف کیوں ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ایک حدیث کا مطالعہ کیجئے:

قال الامام احمد حدثنا عمرو بن عاصم عن   حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

حماد بن سلمة عن علی بن زید عن الحسن عن جندب عن حذیفة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : لاینبغی لمسلم ان یذل نفسہ۔ قیل وکیف یذل نفسہ۔ قال : یتعرض من البلاء لما لایطیق۔ وکذا رواہ الترمذی وابن ماجہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کیسے کوئی شخص خود اپنے کو ذلیل کرے گا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ایسی بلا کا سامنا کرے جس سے نپٹنے کی اسے طاقت نہ ہو۔

اس حدیث کی روشنی میں دیکھئے تو مذکورہ قسم کے واقعات میں پولیس یا اکثریتی فرقہ کی شکایت کرنا سراسر غیر مسنون فعل ہے۔ ایسا ہر واقعہ خود اپنی غیر اسلامیت کی داستان ہے نہ کہ اغیار کے ظلم کی داستان۔ کیوں کہ اس ملک میں مسلمان جب اقلیت میں ہیں اور جب یہ معلوم ہے کہ مسلمانوں کی متشددانہ کارروائی کے بعد پولیس آئے گی۔ اور موجودہ حالت میں یہ بھی معلوم ہے کہ پولیس جب آئے گی تو وہ یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی مارپیٹ کرے گی اور مسلمان اس کو ہرگز روک نہ سکیں گے۔ ایسی صورت میں مذکورہ قول رسولؐ کے مطابق، مسنون طریقہ یہ ہے کہ مسلمان ابتدائی اشتعال کا واقعہ نہ کریں۔ وہ ایسے آغاز سے اپنے آپ کو بچائیں جس کے متعلق معلوم ہے کہ اس کا انجام لازمی طور پر ان کے خلاف نکلے گا۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مومن ایک بل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ (المومن لایلدغ من جحر مرتین) مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ایک ہی بل میں وہ روزانہ ہاتھ ڈالتے ہیں اور ہر روز اس سے ڈسے جاتے ہیں۔ کسی نادان شخص نے بھڑ کے چھتہ میں صرف ایک بار ہاتھ ڈالا ہوگا۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ روزانہ بھڑ کے چھتہ میں ہاتھ ڈال رہے ہیں اور روزانہ اس کا انجام بھگت رہے ہیں۔ کیا اس کے باوجود ان کا یہ دعویٰ درست ہو سکتا ہے کہ اسلام کو وہ اپنا دین سمجھتے ہیں۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول مانتے ہیں۔ دین اور رسول کا مفہوم اگر وہی ہو جو لغت کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے تو ان کا دعویٰ درست نہیں۔ اور اگر مسلمانوں کا اپنا کوئی علیحدہ لغت ہو جس میں انھوں نے بطور خود ان الفاظ کا کوئی دوسرا مفہوم لکھ رکھا ہو تو البتہ ان کا دعویٰ درست ہو سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسے کسی لغت کی قیمت ان کے اپنے نزدیک خواہ کتنی ہی زیادہ ہو، خدا اور خلق کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں۔

قال اللہ، قال الرسول

قرآن میں منکرین حق کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ------ اور انھوں نے شروع کیا تم سے پہلی بار (وَھُم بدؤاکم اوّل مرۃ، التوبہ ۱۳) مفسرین نے اس کی تشریح میں یہ قول نقل کیا ہے کہ البادئ اظلم (شروع کرنے والا زیادہ ظالم ہے)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

عن ابی ھریرۃ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قلتَ لصاحبکَ یوم الجمعۃ انصِت والامام یخطبُ فقد لغوتَ (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کے دن تم اپنے ساتھی سے کہو کہ چپ رہو جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو، تو تم نے لغو کام کیا۔

قرآن کی مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دو آدمی آپس میں لڑجائیں تو ان میں سے جس شخص نے ٹکراؤ میں پہل کیا ہے، وہ زیادہ بڑا ظالم قرار پائے گا۔ اجتماعی زندگی میں اختلاف یا شکایت کے مواقع آتے ہیں۔ مگر ایسے مواقع پر آدمی کو پرامن تدبیر پر رک کے رہنا ہے۔ اس کے لیے کسی حال میں یہ جائز نہیں کہ وہ حد کو پار کر کے ٹکراؤ اور تصادم کے میدان میں داخل ہوجائے۔

اوپر جو حدیث نقل کی گئی، اس سے ایک اور اسلامی اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایک آدمی غلطی کر بیٹھے تو دوسرے آدمی کو چاہیے کہ وہ اس سے اعراض کرے، وہ ہرگز جوابی غلطی نہ کرے۔ جوابی غلطی، ایک غلطی کو دو غلطی بنا دیتی ہے۔ وہ اس برائی میں مزید اضافہ کر دیتی ہے جس کو برداشت نہ کر کے اس کے خلاف اقدام کیا گیا تھا۔

یہ خدا اور رسول کا حکم ہے۔ اس کے مطابق آدمی کو پہلی غلطی سے بھی بچنا ہے اور دوسری جوابی غلطی سے بھی۔ کیوں کہ پہلی غلطی کرنے والا اگر ظالم ہے تو دوسری غلطی کرنے والا لاغی۔

اس دنیا میں سب سے بڑا ظلم کرنے والا وہ ہے جو جارحیت کا آغاز کرے۔ اور سب سے زیادہ لغو کام کرنے والا وہ ہے جو ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کرے۔ اللہ سے ڈرنے والے لوگوں کو ظلم سے بھی بچنا ہے اور لغو کام کرنے سے بھی۔

اسلام اولاً فساد کی پہل کرنے والوں کو روکتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص پہلی نادانی کر بیٹھے تو اسلام کا تاکیدی حکم یہ ہے کہ فریق ثانی ہرگز دوسری نادانی نہ کرے۔

ہندستان میں ہولی کے دن ایک ہندو کچھ مسلمانوں کے اوپر رنگ ڈال دیتا ہے۔ مسلمان مشتعل ہو کر لڑنے لگتے ہیں۔ اور پھر ساری بستی میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ پاکستان کے ایک ہوٹل میں کسی مسئلہ پر تکرار ہوتی ہے۔ ایک پٹھان کچھ مہاجرین کے اوپر گرم چائے کی پیالی پھینک دیتا ہے۔ یہ مہاجرین مشتعل ہو کر لڑ پڑتے ہیں۔ اور اس کے بعد پورے شہر میں مہاجر مسلمان اور پٹھان مسلمان کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

ان واقعات میں بلاشبہ فساد کا آغاز کرنے والا ہندستان میں ہندو اور پاکستان میں پٹھان ہے۔ مگر قرآن کی رو سے دیکھئے تو دونوں جگہ فساد کو بڑھانے کی ذمہ داری فریق ثانی پر عائد ہوتی ہے۔ ہندستان میں مسلمان کے اوپر اور پاکستان میں مہاجر کے اوپر۔ کیوں کہ دونوں جگہ فریق ثانی نے یہ کیا کہ فریق اول کے جس واقعہ پر قرآن نے عفو و درگزر کا حکم دیا تھا۔ اس کو انھوں نے انتقام اور جوابی کارروائی کا عنوان بنایا۔

موجودہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ اس لیے مذکورہ نوعیت کے چھوٹے چھوٹے واقعات بہر حال ہر جگہ پیش آئیں گے، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک۔ یہ اس تخلیقی منصوبہ کا فطری نتیجہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو بنایا ہے۔ اسی لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس طرح کے واقعات کو اعراض کے خانہ میں ڈال دو۔ اس کو اشتعال اور انتقام کا مسئلہ نہ بناؤ ـــــ اب جو شخص ایسا نہ کرے وہ بلاشبہ غلطی پر ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے نظامِ تخلیق پر راضی نہیں ہوا۔

ہندستان اور پاکستان میں جو لوگ عفو و درگذر کے اصول کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، وہی لوگ "پٹرو ڈالر" کے ملکوں میں جاکر مبالغہ کی حد تک عفو و درگذر کے اصول کی پابندی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں قرآن کے حکم کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اہمیت پٹرو ڈالر کے حکم کی ہے۔ اس سے زیادہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ اپنے آپ کو قرآن کا مومن کامل سمجھتے ہیں۔

علم کا حصول

صحیح مسلم میں کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ (بابُ اوقات الصلوات الخمس) کے تحت ایک روایت اِن الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

عن عبد اللّٰہ بن یحیی بن ابی کثیر — عبداللہ بن یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ

قال سمعتُ ابی یقول:

لایُستطاعُ العلم براحۃِ الجسم — علم جسمانی راحت کے ساتھ نصیب نہیں ہوتا۔

اس حدیث کا اگرچہ اوقاتِ نماز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بظاہر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ امام مسلم نے اس کو اوقات الصلوۃ کے باب کے تحت کیوں نقل کیا۔ تاہم اس سے قطعِ نظر، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے حصول کے لیے جاں فشانی کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم میں گہری بصیرت اس کے بغیر حاصل نہیں ہوتی کہ آدمی راحت وآرام سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو علم کے حصول کے لیے وقف کر دے۔

علم کے لیے تحقیق اور مطالعہ انتہائی حد تک ضروری ہے۔ جب آدمی صحیح معنوں میں تحقیق اور مطالعہ میں لگتا ہے تو مصروفیتوں کی ایک پوری دنیا اس کے سامنے کھل جاتی ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ کھانا، نیند، آرام اور دوسرے جسمانی تقاضوں کو نظر انداز کیے بغیر وہ اپنے تحقیق اور مطالعہ کے کام کو جاری نہیں رکھ سکتا۔ اس وقت جو آدمی علم کا سچا طالب ہو وہ دوسرے تمام تقاضوں کو ثانوی قرار دے کر ہمہ تن علم کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔

مگر یہ بھی صرف ایک ظاہری بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم میں مشغول ہونا خود ایک راحت ہے۔ آدمی جب علم کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو یہ تجربہ اس کے لیے اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ وہ خود ہر قسم کے آرام کا بدل بن جاتا ہے۔ اب جسمانی راحت کو چھوڑنا راحت کو چھوڑنا نہیں ہوتا بلکہ چھوٹی راحت سے نکل کر زیادہ بڑی راحت کو پالینے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

یہی وہ چیز ہے جو علم کے طالب کے لیے ہر قسم کی بے آرامی کو قابل قبول بنا دیتی ہے۔ وہ بڑی چیز کو پانے کی خوشی میں چھوٹی چیز کے کھونے کو برداشت کر لیتا ہے۔

پانچویں نہ بنو، ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے

ایک حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
کن عالما او متعلما او مستمعا او محبا ولا تکن الخامس فتھلک
تم علم کو جاننے والے بنو یا علم کو سیکھنے والے یا علم کو سننے والے یا علم سے محبت کرنے والے،
اور پانچویں نہ بنو ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے ۔

اس حدیث میں علم سے مراد وہ علم ہے جو آدمی کو اللہ اور اللہ کی باتوں سے باخبر کرے۔ لوگوں میں کوئی پڑھا لکھا ہوتا ہے، کوئی جاہل۔ کوئی ذہین ہوتا ہے کوئی غبی۔ اس لئے آدمیوں کی مختلف حالت کے اعتبار سے آپ نے چار درجے مقرر کردیئے۔ اور فرمایا کہ ہر حال میں تم کو ان چار درجوں میں سے کسی ایک درجہ پہ ہونا چاہیئے۔

یا تو تم وہ شخص بنو جس نے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرکے دین خداوندی کو بخوبی سمجھ لیا ہو اور اس کے لئے وہ ضروری محنت و ریاضت کرلی ہو جو آدمی کو صحیح معرفت تک پہنچاتی ہے۔ اگر یہ مقام تم کو حاصل نہ ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ تم اپنی اس کمی سے آگاہ ہو اور اس کو پورا کرنے کے لئے علم حقیقی کو سیکھنا شروع کردو، قرآن وسنت کے طالب علم بن جاؤ۔ اگر تم اپنے حالات کے لحاظ سے یہ بھی نہ کرسکو تو تیسرا درجہ یہ ہے کہ تمھارے اندر اس واقعہ کا اعتراف پیدا ہوجائے کہ تم نہ صاحب علم ہو نہ طالب علم۔ ایسی حالت میں تمہارے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ تم سننے والے بن جاؤ۔ جہاں کہیں خدا کی باتیں ہوں، تم وہاں خاموشی سے بیٹھو اور جو کچھ بتایا جارہا ہو اس کو غور سے سنو۔ پھر اگر کوئی اس درجہ پر بھی نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنی اس محرومی کا احساس کرے۔ اور اس احساس محرومی کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں ان لوگوں کے لئے محبت پیدا کرے جو اس متاع علم میں اپنا حصہ پائے ہوئے ہیں جس سے وہ اپنا حصہ نہ پاسکا۔ یہ چوتھا درجہ ہے جہاں کوئی مومن اس دنیا میں ہوسکتا ہے ۔

اس کے بعد جو پانچواں درجہ ہے وہ ہدایت کا نہیں بلکہ گمراہی کا درجہ ہے۔ وہ یہ کہ آدمی علم حقیقت سے باخبر نہ ہو، اس کے باوجود بحث و نزاع کرے، وہ علم دین کے بجائے کسی اور علم کا متعلم بن جائے۔ وہ سننے اور سیکھنے کے لئے ان مجالس کا انتخاب کرے جہاں دین کی باتیں نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ اس کے دل میں محبت و احترام بھی ان لوگوں کے لئے ہوجائے جو علم دین کے مالک تو نہیں ہیں البتہ دوسری قسم کی مہارتوں میں کمال رکھتے ہیں یہ انسان کی پانچویں حالت ہے اور جو اپنے آپ کو اس حال پر پائے اس کو سمجھنا چاہیئے کہ وہ ہلاک ہوگیا۔ الا یہ کہ وہ واپس لوٹے اور مذکورہ چار میں سے کوئی ایک بننے کی کوشش کرے ۔

فرق کو جانئے

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن خیر کی باتیں سننے سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ جنت تک پہنچ جائے (صفحہ ۹)

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے۔ پس وہ جہاں اسے پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے (والکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن، فحیث وجدھا فھو احق بھا) جامع الاصول فی احادیث الرسول ۹/۸

یہاں حکمت کی بات سے مراد صرف وہ بات نہیں ہے جو قرآن اور حدیث میں ہو بلکہ ہر وہ صحیح بات ہے جو کسی جگہ پائی جائے۔ اس سے مراد دراصل دانش مندی (Wisdom) کی بات ہے۔ اور دانش مندی کی بات کسی بھی شخص کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ حتی کہ ایک جاہل اور عام آدمی کے ذریعہ بھی۔ دانش مندی کی بات دراصل فطرت کی بات ہوتی ہے۔ اور اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لیے دانش مندی کی ہر بات اسلام کی اپنی ہی بات ہے۔ اور مومن کو اسے خود اپنی چیز سمجھ کر لے لینا چاہیے۔

اس کی وضاحت کے لیے یہاں ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔ ایک عیسائی عالم نے خدا سے دعا کی تو اس نے اپنی دعا میں یہ الفاظ کہے۔ اے خدا مجھے وہ طاقت دے کہ میں جس چیز کو بدل سکتا ہوں اس کو بدلوں اور وہ تحمل دے کہ میں اس چیز کے ساتھ رہ سکوں جس کو میں بدل نہیں سکتا اور وہ دانش مندی کہ میں فرق کو جانوں :

Oh God give me the strength to change the things which I can, and the serenity to live with things I cannot change, and the wisdom to see the difference.

یہ بات اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی عیسائی یا غیر عیسائی کی بات نہیں ہے بلکہ وہ فطرت کی بات ہے۔ اور اسلام چوں کہ دینِ فطرت ہے اس لیے دانش کی ہر بات خود اسلام کی بات ہے مومن کو چاہیے کہ دانش کی ہر بات کو خود اپنی بات سمجھ کر قبول کر لے۔

خاموش منصوبہ

ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ایک بار ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک مہم پر جا رہے تھے۔ راستہ میں کچھ لوگ بلند آواز سے اللہ اکبر پکارنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ اے لوگو، خاموشی کا طریقہ اختیار کرو۔ تم جس خدا کو پکار رہے ہو وہ بہرا یا غائب نہیں ہے۔ وہ تمہارے قریب ہے اور سب کچھ سنتا اور جانتا ہے (بخاری و مسلم)

اسی طرح ۹ ھ میں جب آپ اپنے دس ہزار ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے تو آپ نے مکمل خاموشی اور رازداری کا طریقہ اختیار فرمایا جس کی تفصیلات سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس مہم کے دوران آپ نے جو طریقہ اختیار فرمایا وہ آپ کی اس دعا کے الفاظ میں واضح طور پر جھلک رہا ہے۔ آپ نے دعا کرتے ہوئے کہا۔ اے اللہ، میری کوئی خبر قریش کو اس وقت تک پہنچنے نہ دے جب تک میں ان کی بستیوں میں داخل نہ ہو جاؤں۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ پیغمبر کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی مقصد کو حاصل کرنا ہو تو اس کی ساری منصوبہ بندی رازدری کے ساتھ ہونی چاہئے۔ فریق ثانی کے خلاف اقدام اس طرح کیا جانا چاہئے کہ اس کو صرف اس وقت خبر ہو جب کہ واقعہ عملاً ہو چکا ہو۔

ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ رازداری سے مدد لو۔ یہ بے حد اہم ہدایت ہے۔ رازدری ایک مددگار ہتھیار ہے۔ جو لوگ اس پر امن ہتھیار کو استعمال کریں وہ ہمیشہ اپنے منصوبہ کی تکمیل میں کامیاب رہیں گے۔

یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ ایک لفظ میں اس کو خاموش منصوبہ کہا جا سکتا ہے۔ یعنی شور و غل کے طریقہ سے مکمل پرہیز کرتے ہوئے فریق ثانی تک اس طرح پہنچنا کہ پیشگی طور پر اس کو اس کی اطلاع نہ مل سکے۔ اور اس کے لئے جوابی تیاری کرنا ممکن نہ رہے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔

ترتیب وتدریج

صحیح البخاری (کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن) میں حضرت عائشہ رضی کی ایک روایت ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ اسلام میں پہلے جنّت وجہنم والی آیتیں اتریں۔ جب لوگوں کے اندر قبولیت کا مادہ پیدا ہوگیا تو اس کے بعد حرام و حلال کے احکام اترے۔ اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ شراب چھوڑ دو اور زنا چھوڑ دو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم تو کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے، ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے (لقالوا لاندع الخمر ابداً ولاندع الزنا ابداً) فتح الباری ۸/۶۵۵

احکام کو جاری کرنے کی یہ ترتیب صرف دور اول کے لیے نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ترتیب وتدریج صرف ابتدائی دور کے لیے تھی جب کہ قرآن اتر رہا تھا، اب جبکہ قرآن پورا اتر چکا تو اب وہ بیک وقت پورا نافذ بھی کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ احکام کے اجراء اور نفاذ کا تعلق معاشرہ کی ایمانی اور اخلاقی حالت سے ہے۔ جب بھی لوگوں میں ایمانی اور اخلاقی کمزوری پائی جائے گی تو دوبارہ وہی ترتیب مطلوب ہو جائے گی جو دور اول میں مطلوب تھی۔

مورخین اسلام نے خلیفۂ عادل حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے بارہ میں لکھا ہے کہ خلیفہ ہو جانے کے باوجود انھوں نے سارے شرعی احکام بیک بار نافذ نہیں کیے۔ ان کے نوجوان صاحبزادہ عبدالملک نے ایک دن کہا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ تمام شرعی احکام کو نافذ نہیں کر رہے ہیں۔ اب آپ اس قوم کے خلیفہ ہیں، تمام شرعی احکام کو نافذ کر کے آپ موجودہ تمام ظلم وفساد کو ختم کر دیجئے۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا :

لاتعجل یابنی، فإن الله ذم الخمر فی القرآن مرتین وحرمها فی الثالثة۔ وانی اخاف ان احمل الحق علی الناس جملة فیدفعونه جملة ویکون من ذا فتنة۔

(المجلة ۱۸ - ۲۴ فروری ۱۹۹۶، صفحہ ۳۵)

اے میرے بیٹے، جلدی نہ کرو۔ کیوں کہ اللہ نے شراب کی دو بار مذمت کی اور پھر تیسری بار اس کو حرام کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں حق کو بیک وقت لوگوں کے اوپر لاد دوں تو وہ اس کو بیک وقت اتار پھینکیں گے۔ اور پھر ایک نیا فتنہ پیدا ہو جائے گا۔

عمر بن عبد العزیز کے اس جواب پر ان کے صاحبزادہ عبد الملک نے یہ نہیں کہا کہ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب کہ قرآن اتر رہا تھا۔ اب جب کہ پورا قرآن نازل ہو چکا ہے تو اب بعد کے زمانہ کے لیے یہ ترتیب نہیں ہے۔ اب ہمارے پاس مکمل شریعت ہے، اور اب ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم سیاسی طاقت کو استعمال کر کے پوری شریعت کو مکمل طور پر نافذ کر دیں۔ اب ہم اس کے حصے بخرے نہیں کر سکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ترتیب ہی ابدی طور پر اس کے نفاذ کی ترتیب بھی ہے۔ اگلی نسلوں میں ہمیں دوبارہ یہ دیکھنا ہے کہ لوگوں کی ایمانی طاقت کیا ہے۔ لوگوں کی قبولیت کا کیا حال ہے۔ سماجی اور سیاسی حالات کیسے ہیں۔ اور پھر حقیقی صورت حال کا جائزہ لے کر اس کے مطابق تدریجی طور پر شرعی احکام کو نافذ کرنا ہے۔

اسی کا نام اسلامی حکمت ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ نظری اور عملی پہلوؤں میں فرق کیا جائے۔ اسلام کے عملی احکام کو بالترتیب اتنا ہی نافذ کیا جائے جتنا کہ لوگوں کے اندر قبولیت کا مادہ پایا جا رہا ہے، اور بقیہ اجزاء شریعت کے سلسلے میں ترغیب و تبلیغ کی مہم جاری رکھی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قوانین کے نفاذ کا معاملہ ۵۰ فی صد حکومت سے تعلق رکھتا ہے، اور بقیہ ۵۰ فی صد زیر نفاذ انسانوں سے۔ کوئی قانون کسی معاشرہ میں اسی وقت نافذ ہوتا ہے جب کہ خود معاشرہ کے اندر اس کے حق میں ایک درجہ کی آمادگی پیدا ہو چکی ہو۔ معاشرہ میں موافق فضا پیدا کیے بغیر اس کے اندر قانون کا نفاذ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ زمین تیار کیے بغیر اس سے ہری بھری فصل حاصل کرنا۔

حکمت کی بات

قال ابن عباس : ما انتفعت بشئ بعد النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم انتفاعی بکلمات کتبھن الیّ امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ قال : کتب الیّ : بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم . امابعد : فان المرء یفرح بادراك مالم یکن لیفوته ـ ویغتم بفوت مالم یکن لیدرکه ـ فاذا آتاك اللّٰه من الدنیا شیئًا فلا تکثرن به فرحًا. و اذامنعك منھا فلا تکثرن علیه حزنا. ولیکن ھمك لما بعد الموت . والسّلام

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جس کلام سے مجھ کو سب سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا وہ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ایک خط تھا۔ انھوں نے مجھے لکھا :
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ آدمی ایک ایسی چیز کو پاکر خوش ہوتا ہے جس کو وہ کھونے والا نہ تھا۔ اور ایک ایسی چیز کو کھوکر غمگین ہوتا ہے جس کو وہ پانے والا نہ تھا۔ پس جب اللہ تم کو دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز دے تو تم اس کو پاکر بہت زیادہ خوش نہ ہو۔ اور جب اللہ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز تم سے روکے تو تم اس پر بہت زیادہ غمگین نہ ہو۔ اور تمہاری فکر اس چیز کے لیے ہونا چاہیے جو موت کے بعد ہے ۔ والسلام

کیوں ایسا ہے کہ لوگ کوئی چیز پاتے ہیں تو اس پر ناز کرنے لگتے ہیں اور اگر وہ کوئی چیز کھوتے ہیں تو غم اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ پانے کو کامیابی سمجھتے ہیں اور کھونے کو محرومی۔ حالانکہ اس دنیا میں نہ تو پانا کامیابی ہے اور نہ کھونا محرومی۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں پانا اور کھونا دونوں امتحان کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ تعالٰے ہر آدمی کو جانچنا چاہتا ہے۔ اسی مصلحت کے تحت وہ کبھی کسی کو ایک چیز دیتا ہے اور کبھی کسی سے کوئی چیز چھین لیتا ہے۔ دونوں ہی کا مقصد آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کا بندہ پاکر کیسا بنتا ہے اور کھوکر اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو پانے پر فخر و ناز کرنا بھی اس کو اتنا ہی بے معنی معلوم ہوگا جتنا کھونے پر آہ و فغاں کرنا۔

فہمِ دین

۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ کو ۱۰ فلسطینی عرب ہمارے دفتر (نئی دہلی) میں آئے۔ ان کے قائد شیخ کمال الخطیب تھے جو فلسطین کی اسلامک مومنٹ کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ بقیہ نوجوان وہ تھے جو دہلی کی مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پورے ملک میں زیر تعلیم فلسطینی نوجوانوں کا سالانہ مخیّم (کیمپ) بنگلور میں اسی سال دسمبر میں ہوا۔ یہ لوگ اس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے ان میں سے ایک استاد جہاد محمد تھے وہ ریسرچ کے تحت دہلی میں مقیم ہیں۔ ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے : 6846964

یہ سب نوجوان انتہا پسند فلسطینی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کہ تشدد کے ذریعہ فلسطین کے مسئلہ کو حل کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجئے۔ میں نے کہا کہ نہ صرف فلسطین بلکہ کشمیر، الجزائر اور اس قسم کے دوسرے تمام مقامات کے لیے میری ایک ہی نصیحت ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تمام لوگ تشدد کے طریقہ کو مکمل طور پر ختم کر دیں اور صرف امن کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی تحریک چلائیں۔ وہ کسی بھی حال میں اور کسی بھی عذر کو لے کر متشددانہ طریقہ نہ اختیار کریں۔

میں نے کہا کہ آپ کو میرا یہ مشورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی روشنی میں ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ کی یہ روایت آئی ہے کہ : ما خُيّر رسول الله صلى الله عليه وسلم بين أمرين إلا أخذ أيسرهما (فتح الباری ۶/۶۵۴) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کسی معاملہ میں دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان طریقہ کا انتخاب فرماتے۔

میں نے کہا کہ آپ اور آپ جیسے دوسرے لوگ آزادیٔ وطن یا جہاد اسلام کے نام سے جو تحریک چلا رہے ہیں اس میں باعتبار اسلوب آپ کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ ایک، پُرتشدد طریقہ اور دوسرا پُرامن طریقہ۔ بروقت آپ لوگوں نے اپنی تحریک کے لیے پرتشدد طریقہ کو اختیار کر رکھا ہے۔ مذکورہ روایت کے مطابق یہ سنتِ رسولؐ کے خلاف ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں آپ اختیار ایسر (اختیار اسھل) کے طریقہ کو اپنائیں۔ یعنی تشدد کے طریقہ کو

چھوڑ کر پر امن جدوجہد کے اصول پر اپنی تحریک چلائیں۔

ایک فلسطینی نوجوان نے کہا کہ صحیح بخاری کی اس روایت میں آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ مَالَمْ یَکُنْ اِثْمًا (جب تک کہ وہ گناہ نہ ہو)۔ اس وقت فلسطین اور دوسرے اس قسم کے مقامات پر حکمراں طبقہ لوگوں کو قتل کر رہا ہے اور ان کی اقتصادیات کو تباہ کر رہا ہے پھر اس سے بڑا اثم اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس اثم عظیم کی موجودگی میں کیسے اختیار ایسر کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ خود حدیث کے الفاظ کے مطابق اس اثم کی موجودگی میں ہمیں امن کے سہل طریقہ کو چھوڑ کر تشدد کے مشکل طریقہ کو اختیار کرنا چاہیے۔

میں نے کہا کہ مالم یکن اثما کا یہ مطلب نہیں۔ پوری حدیث اس طرح ہے کہ مالم یکن اثمًا، فان کان اثمًا کان ابعد الناس منہ (جب تک کہ وہ اثم نہ ہو۔ اور اگر وہ اثم ہو تو آپ اس سے بہت زیادہ دور رہتے تھے) یہاں "وہ" سے مراد فریق ثانی کی روش نہیں ہے۔ بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریقہ ہے۔ اس کا تعلق فعلِ غیر سے نہیں ہے بلکہ فعلِ رسولؐ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی صورت حال کے مقابلہ کے لیے جب آپ کو دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہو تو آپ ہمیشہ آسان طریقہ کے ذریعہ سے فریق ثانی کا مقابلہ کرنے کی کوشش فرماتے۔ بشرطیکہ اختیار کیا جانے والا یہ طریقہ اثم نہ ہو۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ ایک شخص کو پیاس لگی ہوئی ہے، اپنی پیاس بجھانے کے لیے اس کے سامنے دو صورتیں ہیں۔ ایک طرف وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پاس شراب کی بوتل رکھی ہوئی ہے۔ دوسری طرف اس کے علم میں آتا ہے کہ اس علاقہ میں پانی کا ایک چشمہ ہے مگر وہ پہاڑ کے اوپر واقع ہے۔ اس مثال میں شراب پی کر اپنی پیاس بجھانا بظاہر آسان ہے اور چل کر پانی تک پہنچنا بظاہر مشکل۔ مگر یہاں شریعت کا حکم ہو گا کہ وہ آدمی آسان ہونے کے باوجود شراب سے اپنی پیاس نہ بجھائے بلکہ سفر کرکے چشمہ تک پہنچے اور اس کے پانی سے اپنی پیاس بجھائے۔

ابن حجر العسقلانی نے حدیث کے مذکورہ حصہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

(ای مالم یکن الاسھل مقتضیاً للاثم فانہ حینئذٍ یختار الاشد (فتح الباری ۶/۶۶۵) یعنی جب

تک آسان طریقہ کسی اثم کا مقتضی نہ ہو اور جب وہ طریقہ اثم کا مقتضی ہو تو آپ مشکل طریقہ کا انتخاب فرماتے۔

سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری عمر نبوت میں اس اصول کو اختیار فرمایا کہ جہاں آسان طریقہ اور مشکل طریقہ، دو میں سے ایک کا انتخاب کرنے کا موقع ہو تو آپ نے ہمیشہ آسان کا انتخاب فرمایا۔

مثلاً مکہ میں بیت اللہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ اب اس معاملہ میں آپ کو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ ایک انتخاب تھا ـــــ بیت اللہ میں داخل ہو کر بتوں کو توڑنا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انتخاب یہ تھا کہ پر امن طور پر یہ تبلیغ کی جائے کہ اے لوگو، بت پرستی کو چھوڑو اور ایک خدا کی عبادت کرو۔ ان دونوں میں بت شکنی کا طریقہ واضح طور پر مشکل تھا اور پر امن تبلیغ کا طریقہ اس کے مقابلہ میں واضح طور پر آسان۔ چنانچہ آپ نے مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کو لے لیا۔

اسی طرح ہجرت کے موقع پر آپ کے سامنے دو میں سے ایک کا انتخاب تھا۔ ایک یہ کہ مکہ والوں کے ظلم کے خلاف مسلح لڑائی چھیڑیں، اور دوسرے یہ کہ اپنے اصحاب کے ساتھ خاموش طور پر مکہ سے مدینہ چلے جائیں۔ یہاں بھی آپ نے مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کا انتخاب فرمایا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ مشرک قبائل بارہ ہزار کی تعداد میں مسلح ہو کر مدینہ کی طرف بڑھ رہے ہیں، آپ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ نوجوان مسلمانوں کی رائے یہ تھی کہ ان کے خلاف جنگ کی تیاری کی جائے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت سلمان فارسیؓ نے بتایا کہ ایران میں جب اس قسم کی صورت حال پیش آتی ہے تو اپنے اور دشمنوں کے درمیان خندق کھود کر مسلح ٹکراؤ کو روک دیا جاتا ہے۔ اس وقت آپ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ کو اختیار فرمایا جو دو ممکن صورتوں میں سے آسان صورت کے ہم معنی تھا۔

اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر آپؐ کے سامنے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اپنے تقریباً پندرہ سو اصحاب کو لے کر قریش سے مسلح ٹکراؤ کریں۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انتخاب یہ تھا کہ قریش سے صلح کر کے جنگ کو ٹال دیا جائے اور اپنی طاقت کو پر امن تبلیغ کی طرف موڑ دیا جائے۔ یہاں بھی آپ نے وہی طریقہ اختیار فرمایا جو مشکل کے مقابلہ میں آسان کا انتخاب لینے کے ہم معنی تھا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے صرف عربی جاننا کافی نہیں۔ مذکورہ تمام افراد عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ مگر مذکورہ حدیث کو وہ نہ سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان جاننے کے ساتھ آدمی کے اندر سنجیدگی ضروری ہے جس کو قرآن میں تقویٰ کہا گیا ہے (البقرہ ۲۸۲) اگر سنجیدگی نہ ہو تو صرف عربی زبان کو جاننا قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

قرآن کے مطابق، تقویٰ علم صحیح کا ذریعہ ہے (واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ) آدمی کے اندر اگر تقویٰ کی صفت نہ ہو تو خارجی معلومات کا کوئی بھی ذخیرہ اس کا بدل نہیں بن سکتا۔ تقویٰ عالم کے لیے ایک خدائی لگام کی مانند ہے۔ یہ لگام اس کو اِدھر اُدھر منحرف ہونے سے بچاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کا مفہوم متعین کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مفہوم اپنی خواہشات اور اپنے تعصبات کے تحت مقرر کیا جائے۔ جو لوگ اس قسم کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ بظاہر ایک آیت یا ایک حدیث کا حوالہ دیں گے۔ مگر اس آیت اور اس حدیث میں وہ خود اپنے آپ کو پڑھ رہے ہوں گے نہ کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی بات کو۔ ایسے لوگ اپنے جذبات و خیالات میں اتنا زیادہ گم ہوتے ہیں کہ ان کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ آیت یا حدیث کو بے لاگ انداز میں سمجھ سکیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی پوری طرح خالی الذھن ہو کر قرآن و حدیث کو پڑھے، وہ کھلے ذہن کے تحت یہ جاننے کی کوشش کرے کہ خود آیت یا حدیث کے الفاظ سے کیا مفہوم نکل رہا ہے ایسے ہی لوگ اس کے صحیح مفہوم تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

اس معاملہ میں تقویٰ کا رول یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر احتیاط کا مزاج بناتا ہے، خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ آیت یا حدیث کا ٹھیک وہی مفہوم لے جو واقعی طور پر اس سے نکلتا ہے نہ کہ کوئی خود ساختہ مفہوم جو آدمی کے اپنے دماغ میں تو ضرور ہے، مگر آیت کے الفاظ میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

شریعت کا حکم

اسلامی شریعت کا ایک متفقہ مسئلہ ہے: المشقة تجلب التیسیر (مشقت آسانی کا موجب ہوتی ہے۔) یعنی جب کسی شرعی حکم پر عمل کرنا مشقت کا باعث ہو تو ایسے حالات میں خود شرعی حکم کو نرم کر دیا جاتا ہے، نہ یہ کہ حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر قیمت پر شریعت کی تعمیل پر اصرار کیا جائے۔

مثال کے طور پر ایک مسلمان پر حج کی عبادت فرض ہو چکی ہے، مگر اس کے لئے حج کے سفر کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ کسی وجہ سے خطرناک ہو گیا ہے تو ایسی حالت میں یہ حکم نہیں دیا جائے گا کہ تم جان و مال کا خطرہ مول لے کر حج کے لئے نکلو، بلکہ خود حج کا فریضہ اس کے اوپر سے ساقط ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک شخص مرض میں مبتلا ہے۔ نماز کا وقت آیا اور اس پر نماز کی ادائیگی فرض ہو گئی لیکن اندیشہ ہے کہ اگر وہ پانی سے وضو کرے گا تو اس کا مرض بڑھ جائے گا۔ ایسی حالت میں اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم جان پر کھیل کر وضو کرو۔ بلکہ اس سے کہا جائے گا کہ تم مٹی سے تیمم کر کے اپنی نماز ادا کر لو۔ اسی طرح ایک شخص بھوکا ہے اور وہ ایسے حالات میں ہے کہ وہاں خنزیر کے گوشت کے سوا کوئی اور چیز اس کے لئے قابل حصول نہیں۔ اس وقت اس سے شریعت کا مطالبہ یہ نہیں ہوگا کہ خواہ تم بھوکے مر جاؤ مگر حرام گوشت کا کوئی ٹکڑا اپنے منہ میں مت ڈالو۔ اس کے برعکس ایسے مضطر شخص کے لئے خنزیر کے گوشت کو کھانا جائز قرار دیدیا جائے گا۔ وغیرہ۔

شریعت کا ہر حکم استطاعت کے ساتھ مشروط ہے (التغابن ۱۶) اسی کو حدیث میں ان الفاظ میں فرمایا کہ: اذا امرتکم بامر فأتومنه ما استطعتم (بخاری و مسلم) یعنی جب میں تم کو کوئی حکم دوں تو اس میں سے جتنا تمہارے بس میں ہو اتنا کرو۔

یہ شریعت کا ایک نہایت اہم اصول ہے اور اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے علماء اس اصول کو صرف جزئی مشقتوں پر منطبق کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں شاید کوئی بھی عالم نہیں جو اس شرعی اصول کو بڑی بڑی مشقتوں کے معاملہ میں چسپاں کرتا ہو۔

موجودہ زمانہ میں اس کوتاہی کا بے پناہ نقصان مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں تقریباً ہر مسلم علاقہ میں "سیاسی انقلاب" کے نام سے تحریکیں چلائی جارہی ہیں۔ ان تحریکوں کا براہ راست ٹکراؤ حکومت وقت سے ہوتا ہے۔ حکومت وقت ان تحریکوں کو اپنے لئے سیاسی خطرہ سمجھ کر ان پر پابندی لگاتی ہے۔ اس کے بعد تحریکوں کے علمبردار تشدد پر اتر آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت اپنی طاقت کو استعمال کر کے ان تحریکوں کو کچلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ واقعہ آج دنیا کے تقریباً ہر حصہ میں مختلف صورتوں میں پیش آرہا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے صرف ایک ہی کام کر رہے ہیں، اور وہ شکایت اور احتجاج ہے۔ وہ تحریک چلانے والے لوگوں کو کچھ نہیں کہتے۔ البتہ حکمرانوں کو اسلام دشمن قرار دے کر رات دن وہ ان کی مذمت میں مشغول ہیں۔

یہ طریقہ واضح طور پر اسلامی شریعت کے خلاف ہے۔ جب شریعت یہ کہتی ہے کہ جس حکم پر عمل کرنا مشقت کا باعث ہورہا ہو وہ عمل مسلمانوں سے رفع کر دیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مذکورہ نوعیت کی تباہ کن سیاست کا مطلب اپنے آپ کو ایک ایسے حکم کا مکلف بنانا ہے جس کا مکلف شریعت نے ان کو نہیں کیا۔

جب یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ مشقت کے موقع پر شریعت حکم کو آسان کر دیتی ہے تو یہی اصول اس سیاسی معاملہ میں بھی اپنایا جائے گا جس طرح وہ عبادت اور اکل وشرب کے معاملہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس حکم کا تعلق جس طرح عبادت سے ہے اسی طرح جہاد سے بھی ہے۔

آج اگرچہ ہر ملک میں یہ صورت حال ہے کہ حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ کرنے میں مشقت پیش آرہی ہے، مگر عین اسی وقت ہر ملک میں غیر سیاسی میدان میں کام کرنے کے مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ مثلاً تعلیم وتربیت، معاشی تعمیر، اصلاح معاشرہ، دعوت وتبلیغ، وغیرہ۔ اس طرح کے بہت سے نہایت قیمتی کام ہیں جو غیر سیاسی میدان میں کئے جاسکتے ہیں۔ اور ان کو کرنے میں کسی مشقت کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ مسلمانوں کو تباہ کن ٹکراؤ کے راستہ پر لے جارہے ہیں اور ان کو تعمیر کے میدان میں کھلے مواقع کے استعمال کی طرف راغب نہیں کرتے وہ یقیناً شریعت سے انحراف کر رہے ہیں نہ کہ شریعت کی تعمیل۔

انجام پر غور کرنا

جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال : یارسول اللہ اوصنی ، فقال : امستوص انت ۔ فقال نعم ۔ قال علیہ الصلوٰۃ والسلام : اذا ھممت بامر فتدبر عاقبتہ ۔ فان کان رشداً فامضہ وان کان غیا فانتہ عنہ

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول ، مجھے نصیحت کیجئے ۔ آپ نے فرمایا ، کیا تم واقعۃً نصیحت لینا چاہتے ہو اس نے کہا۔ ہاں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو اس کے انجام پر غور کرو ۔ اگر اس میں بھلائی ہو تو اس کو کرو ۔ اور اگر اس میں برائی ہو تو اس سے رک جاؤ ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر کام کو اس کے انجام کے اعتبار سے دیکھنا چاہیے ۔ جو چیز باعتبار انجام ٹھیک ہو اس کو کرنا اور جو چیز باعتبار انجام ٹھیک نہ ہو اس کو نہ کرنا ، یہ اسلام کا طریقہ ہے اور یہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو سکھایا ہے ۔

عام طور پر لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ چیزوں کو محض ان کی ظاہری صورت (Face value) کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اور بس فوراً اس میں کود پڑتے ہیں ۔ مگر یہ سراسر غیر اسلامی طریقہ ہے ۔ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ چیزوں کو ان کی حقیقت کے اعتبار دیکھا جائے نہ کہ محض ظاہر کے اعتبار سے ۔

جب بھی کوئی معاملہ سامنے آئے تو اقدام کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لیا جائے ۔ خاص طور پر یہ غور کیا جائے کہ اگر اقدام کیا جاتا ہے تو دوسروں کا ردعمل کیا ہوگا ۔ کن طاقتوں سے مقابلہ پیش آئے گا ۔ کن مسائل سے نمٹ کر اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا۔ اقدام کے نفسیاتی ، سماجی اور سیاسی اثرات کیا ہوں گے ۔ تمام ضروری پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد صرف اس وقت اقدام کیا جائے جب کہ یہ یقین ہو جائے کہ یہ اقدام مفید اور صحیح نتیجہ پر پہونچنے والا ہے ۔

اقدام صرف وہ ہے جو نتیجہ خیز ہو ۔ جو اقدام نتیجہ خیز نہ ہو ، وہ اقدام نہیں ، خودکشی ہے ۔ ایسے اقدام سے پرہیز کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خودکشی سے پرہیز کرنا ۔

تالیف قلب

قرآن کی سورہ نمبر ۹ میں بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ (صدقات) کے خرچ کی مدیں کیا کیا ہیں اور وہ کن لوگوں کو دی جائیں گی۔ ان مستحقین میں سے ایک قسم وہ ہے جن کو قرآن میں مؤلفۃ القلوب کہا گیا ہے (التوبۃ ۶۰)۔ یعنی وہ لوگ جن کی دلجوئی کرنا مقصود ہو۔ اس سے مراد وہ افراد ہیں جن کو اسلام کی طرف راغب کرنا ہو یا وہ اسلام قبول کرنے کے باوجود کمزور ہوں اور انہیں ایمان پر مستحکم کرنے کے لئے مالی دلجوئی کی ضرورت ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں دونوں قسم کے لوگوں کو اس مقصد کے لیے یہ عطیات دئے۔ مثلاً نومسلموں میں اقرع بن حابس کو، اور غیر مسلموں میں صفوان بن امیہ کو، وغیرہ۔

بعد کو عباسی خلافت کے زمانہ میں جب اسلامی فقہ کی تدوین ہوئی تو بیشتر علماء اس کے قائل ہو گئے کہ اسلام کے عزت اور غلبہ کے بعد اب مؤلفۃ القلوب کی مد ساقط اور منقطع ہو چکی ہے۔ مفسر القرطبی نے لکھا ہے کہ: **انقطع هذا الصنف بعز الإسلام و ظهوره** (**الجامع لأحكام القرآن**، ۱۸۱/۸)۔

تالیفِ قلب کا یہ مسئلہ کسی بھی کتاب کے متعلق ابواب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً قاضی محمد ثناء اللہ العثمانی نے یہ بتاتے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں مؤلفۃ القلوب کو ترغیب کے لیے خمس یا زکوۃ میں سے عطیات دئے، لکھتے ہیں: **و أما اليوم فقد أعز الله تعالىٰ الإسلام و له الحمد و أغناه عن أن يتألف عليه رجال فلا يعطى مشرك تالفا بحال و قد قال بهذا كثير من أهل العلم أن المؤلفة منقطعة و سهمهم ساقط** (**التفسير المظهري**، ۲۳۴/۴) یعنی جہاں تک آج کا تعلق ہے، تو اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت و طاقت دے دی ہے اور اسلام کو اس سے مستغنی کر دیا ہے کہ کسی کی تالیف قلب کی جائے۔ پس کسی بھی مشرک کو کسی بھی حال میں تالیف قلب کے لئے کچھ نہیں دیا جائے گا۔ اور اکثر اہل علم کا یہی قول ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی مد منقطع ہے اور ان کا حصہ ساقط ہو چکا ہے۔ (نیز ملاحظہ ہو، فتح القدیر للشوکانی ۳۷۴/۲)

بعد کے زمانہ کے اکثر علماء کا مسلک یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد

تالیف قلب کی یہ مد باقی نہ رہی۔ گویا کہ اب مالِ زکوۃ کی صرف سات مدیں ہیں نہ کہ قرآن کے بیان کے مطابق، آٹھ مدیں۔ ان لوگوں کے نزدیک تالیفِ قلب کی حکمت ضعف ہے۔ یعنی اسلام جب ضعیف تھا تو اپنے ضعف کی مالی تلافی کے لیے زکوۃ میں یہ مد مقرر کی گئی۔ مگر اسلام جب طاقتور ہو گیا تو اس قسم کی مالی دلجوئی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس بنا پر بعد کو یہ مد ساقط یا موقوف ہو گئی۔ فقہاء میں امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا یہ مسلک کلیتًا ہے اور دوسرے علماء کا کسی قدر گنجائش کے ساتھ۔ مثلاً یہ کہ اب نو مسلم کو دیا جا سکتا ہے مگر کسی غیر مسلم کو نہیں دیا جائے گا۔ ان کے نزدیک نو مسلم لوگ فقراء مسلمین کے حکم میں داخل ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تالیف قلب کا حکم نہ تو ساقط ہوا ہے اور نہ یہ حکم ضعفِ اسلام کی بنا پر تھا۔ یہ حکم مصلحتِ دعوت کی بنا پر ہے نہ کہ ضعف اسلام کی بنا پر۔

اسلامی دعوت میں اصل انحصار دلیل پر ہوتا ہے۔ داعی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دلیل کی قوت سے مدعو کو مطمئن کرے اور اُس کے اندر ذہنی تبدیلی لائے۔ مگر اس دعوتی عمل میں کچھ چیزوں کی ضرورت بطور معاون ہوتی ہے۔ مثلاً نرم گفتاری، اعلیٰ اخلاق، مدعو کے ساتھ تقریب کا معاملہ کرنا۔ چنانچہ تقریب دعوت کی اسی مصلحت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد تقریباً سولہ ماہ تک یہود کے قبلہ کو اپنا قبلہ بنائے رکھا۔ (تفسیر القرطبی، ۱۵۰/۲)

تالیفِ قلب کی انہی صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ مال یا تحفہ کے ذریعہ ان کی دلجوئی کی جائے۔ اس مقصد کے لئے دوسرے اموال کے علاوہ زکوۃ کی رقم بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ مال زکوۃ کے خرچ کی یہ مد ابدی ہے، وہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک دعوت کا عمل لوگوں کے درمیان جاری ہو، خواہ مسلمان، سیاسی اعتبار سے، طاقت کی حالت میں ہوں یا ضعف کی حالت میں۔

تالیفِ قلب (دلجوئی) کا تعلق صرف زکوۃ کے مال سے نہیں ہے۔ اس کو زکوۃ کی ۸ مدوں میں سے ایک مد قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ مدعو گروہ کی آخری حد تک رعایت کرو۔ حتی کہ ان کی دلجوئی کے لئے اگر زکوۃ کے اموال سے دینا ہو تو اُس میں سے بھی انہیں دو۔

تالیفِ قلب آدابِ دعوت کا ایک عام اصول ہے۔ اس کا تعلق ہر اس پہلو سے ہے جو مدعو کے دل میں اسلام کے لئے نرم گوشہ (soft corner) پیدا کرنے والا ہو۔ قرآن وسنت میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ کا فرعون سے نرم زبان میں کلام کرنا (طٰہٰ ۴۴)، پیغمبروں کا اپنی مخاطب قوم سے یہ کہنا کہ ہم تو تمہاری ایذاؤں پر صبر ہی کریں گے (ابراہیم ۱۲)۔ مخالف لوگوں سے

موعظت حسنۃ (النحل ۱۲۵)، وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی تو آپ نے بنو ہاشم کے لوگوں کو اپنے گھر پر بلایا تا کہ انہیں توحید کا پیغام دیں۔ اس موقع پر آپ نے پہلے ان کی تواضع کی اور انہیں دودھ پلایا۔ جب وہ اس سے فارغ ہو گئے تو اس کے بعد آپ نے انہیں نبوت کا پیغام دیا۔ یہ بھی مدعو کے حق میں تالیفِ قلب کی ایک صورت تھی۔ (مسند احمد، الجزء الاول، صفحہ ۱۵۹)

تالیف قلب دراصل ایک جامع حکم ہے جس کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک بدو مدینہ کی مسجد نبوی میں آیا۔ اُس نے مسجد کے اندر پیشاب کر دیا۔ لوگ اس کو مارنے کے لیے دوڑے تو آپ نے لوگوں کو منع کر دیا اور بدو کو زجر و توبیخ کے بغیر واپس کر دیا۔ یہ بھی تالیفِ قلب کی ایک صورت تھی۔

اسی طرح قبیلۂ دوس کے طفیل بن عمرو الدوسی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد وہ اپنی قوم کی طرف واپس گئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی۔ مگر قوم نے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ ان کو ستایا اور سرکشی کا معاملہ کیا۔ وہ دوبارہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور قبیلہ کی شکایت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ دوس کے حق میں دعا کی اور طفیل بن عمرو الدوسی سے کہا کہ تم اپنی قوم کی طرف واپس جاؤ، اس کو اسلام کی طرف دعوت دو اور اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو (ارجع الی قومک فادعهم و ارفق بهم)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت بھی مدعو کے حق میں تالیفِ قلب کی ایک مثال ہے۔ (سیرت ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۴۰۹)

جو لوگ مؤلفۃ القلوب کے حصہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منقطع یا منسوخ مانتے ہیں ان کی اس رائے کی ایک خاص بنیاد حضرت عمر فاروق کا ایک واقعہ ہے۔ ابن ہمام کی روایت ہے کہ عیینہ اور اقرع خلیفہ ابو بکر صدیق کے پاس آئے اور ایک زمین کی مانگ کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے پہلے تالیف قلب کے طور پر کچھ مال دیا تھا۔ ان کی مانگ پر ان کے لیے حضرت ابو بکر نے ایک تحریر لکھ کر دی۔ حالانکہ یہ دونوں مدینہ کے صاحب ثروت افراد تھے۔

یہ دونوں جب باہر آئے تو ان کی ملاقات حضرت عمر فاروق سے ہوئی۔ حضرت عمر نے تحریر کو لے کر پھاڑ دیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اس کے بعد یہ معاملہ خلیفہ ابو بکر صدیقؓ کے سامنے آیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چیز تم کو تالیف قلب کے لیے دی تھی۔ اب اللہ نے اسلام کو طاقتور بنا دیا ہے اور اس کو تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔ حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کی

اس رائے سے اتفاق کیا۔ (التفسیر المظہری ۴/۶ ۲۳۶)۔

اس واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تالیفِ قلب کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تالیفِ قلب کے لیے جو مال دیا جاتا ہے وہ مؤلفۃ القلوب کے مطالبہ پرنہیں دیا جاتا بلکہ حاکم کی اپنی صوابدید پر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ دونوں اشخاص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی فیصلہ کے تحت کچھ مال دیا تھا نہ کہ ان کے مطالبہ کی بنیاد پر۔ اس کے بعد جب حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ آیا تو ان دونوں صاحبان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ کا غلط استعمال کرتے ہوئے خود اپنی طرف سے یہ مانگ کی کہ ہم کو فلاں زمین عطیہ میں دی جائے۔ یہ ایک قسم کا استحصال (exploitation) تھا۔ حضرت عمر فاروق نے معاملہ کی اس نوعیت کو سمجھا اور درمیان میں پڑ کر دونوں صاحبان کو اس سے روک دیا کہ وہ مسلمانوں کے اموال کو غلط طور پر حاصل کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ تالیف قلب اسلام کا ایک مستقل اصول ہے۔ وہ اپنی مختلف صورتوں میں ہر حال میں جاری رہتا ہے خواہ امن کے حالات ہوں یا جنگ کے حالات، اور خواہ اہل اسلام بے اقتدار ہوں یا اقتدار کی حالت میں ہوں، کسی بھی حال میں تالیفِ قلب کا حکم ساقط یا موقوف نہیں ہوتا۔

دعوت الی اللہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، خیر خواہی کا ایک عمل ہے (الاعراف ۷۹)۔ یہ دراصل انسانیت کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ ہے جو ایک مومن کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اللہ کی رحمت کے سایے میں لانے کی کوشش کرے۔ اسی خیر خواہی کی بنا پر مومن یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی بات اس طرح مؤثر انداز میں کہے کہ وہ سننے والے کے دل میں اُتر جائے (النساء ۶۳)۔ یہی جذبہ داعی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کی زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کرے تاکہ پیغام رسانی کا ماحول بگڑنے نہ پائے (ابراہیم ۱۲)، وغیرہ۔

اس قسم کی مختلف چیزیں گویا آداب دعوت سے تعلق رکھتی ہیں۔ دعوت کے انہی آداب میں سے ایک متعین چیز وہ ہے جس کو تالیفِ قلب کہا جاتا ہے، یعنی مدعو کی دل جوئی اور اس کی رعایت۔ جس طرح ایک سچا تاجر اپنے گاہک کی آخری حد تک رعایت کرتا ہے تاکہ اس کے ساتھ مستحکم تجارتی تعلقات قائم ہوں۔ اسی طرح داعی ہر ممکن طریقہ سے اپنے مدعو کی دل جوئی کرتا ہے تاکہ وہ اس کے دعوتی پیغام کی طرف پوری طرح راغب ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تالیفِ قلب دعوت وتبلیغ کا مستقل اصول ہے، کسی بھی حال میں اور کسی بھی صورت میں اس کو ساقط نہیں کیا جا سکتا۔

کام کا صحیح طریقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ کار کیا تھا، اس سوال کا جواب حضرت عائشہ کی ایک روایت میں ملتا ہے: ما خیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین أمرین إلا اختار ایسرھما۔ (صحیح البخاری، کتاب الحدود، باب اقامة الحدود)۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دو امر میں سے ایک امر کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کا انتخاب فرماتے تھے۔

حدیث میں اُیسر کا لفظ ہے۔ اس کی تشریح شارحینِ حدیث نے عام طور پر اُسہل کے لفظ سے کی ہے (فتح الباری ۶/ ۶۶۵) یعنی زیادہ سہل۔ مگر اسہل (سہل تر) کے لفظ سے اُس کی اصل حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ پیغمبر اسلام اور دوسرے تمام پیغمبر، قرآن کے بیان کے مطابق، اولو العزم پیغمبر (الاحقاف ۳۵) تھے۔ کوئی پیغمبر کبھی سہل پسند نہیں ہوتا۔ سہل پسندی پیغمبر کے مزاج کے خلاف ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس حدیث میں اُیسر کا لفظ زیادہ قابل عمل کے معنٰی میں ہے، نہ کہ سادہ طور پر محض سہل کے معنٰی میں۔

حضرت عائشہ کی اس روایت کا مفہوم اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی سیرت کی روشنی میں متعین کیا جائے تو اس سے پوری حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو اس روایت میں اُیسر سے مراد قابل حصول نقشۂ کار (available framework) ہے۔ ہر صورت حال میں دو عملی طریقہ ممکن ہوتا ہے۔ ایک وہ طریقہ جو بروقت موجود نقشہ ہی میں قابلِ عمل ہو۔ اور دوسرا طریقہ وہ جس کا تقاضا یہ ہو کہ پہلے موجود نقشہ کو بدلا جائے، اُس کے بعد ہی اپنا مطلوب عمل شروع کیا جاسکتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اُس نقشۂ کار میں اپنا عمل جاری کیا جو بروقت آپ کے لیے ممکن اور قابل حصول تھا۔ اس پیغمبرانہ طریقِ کار کی ایک مثال یہ ہے کہ قدیم مکہ میں آپ کو دین توحید کی تبلیغ کا کام کرنا تھا۔ اب اس کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ کعبہ کے موجود اجتماع گاہ کو استعمال کیا جائے جہاں بتوں کی پوجا کے لیے لوگ پہلے سے اکٹھا ہوا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ آپ اس سے

الگ اپنا کوئی نیا مقام اجتماع بنائیں۔ دوسرا اور نیا اجتماع گاہ بنانا اس وقت سخت مشکل کام تھا۔ اس کے برعکس کعبہ کا صحن ایک بنے بنائے اجتماع گاہ کی صورت میں موجود تھا۔ پیغمبر اسلام نے بتوں کی موجودگی کے ناپسندیدہ پہلو کو وقتی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس موجود نقشۂ کار کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں اپنے دعوتی خطاب کا مستقل سلسلہ شروع کر دیا۔

کام کا یہی وہ عملی طریقہ ہے جس کو مذکورہ حدیث میں اختیار ایسر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں قابلِ حصول نقشۂ کار (available framework) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے اس پیغمبرانہ حکمت کو نہیں سمجھا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ وہ اُیسر اور اُعسر میں فرق نہ کر سکے۔ اُن کے لیے قابلِ حصول نقشۂ کار موجود تھا مگر اپنی بے خبری کی بنا پر وہ نا قابلِ حصول نقشۂ کار میں اپنی عملی سرگرمیاں دکھاتے رہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق، اس کا نتیجہ صرف یک طرفہ تباہی ہو سکتا تھا اور وہی اُن کے حصہ میں پیش آیا۔

برصغیر ہند میں اس کی ایک مثال انگریزوں کے خلاف علماء ہند کی پُرتشدد تحریک ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ علماء کی یہ پُرتشدد تحریک ساٹھ سالہ قربانیوں کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ اس کے برعکس مہاتما گاندھی کی انہی انگریزوں کے خلاف پُرامن تحریک صرف پچیس سال میں اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوگئی۔ اس فرق کا واحد سبب یہ تھا کہ مہاتما گاندھی کی پُرامن جدوجہد قابلِ حصول نقشۂ کار کے دائرہ میں تھی، جب کہ علماء ہند کی پُرتشدد جدوجہد نا قابلِ حصول نقشۂ کار کے دائرہ میں۔

اس معاملہ کی دوسری مثال الإخوان المسلمون کی تحریک ہے۔ انہوں نے مصر میں شاہ فاروق (وفات ۱۹۶۵) اور صدر جمال عبدالناصر (وفات ۱۹۷۰) کو مغرب نواز اور اسلام دشمن قرار دے کر اُن کے خلاف پُرتشدد تحریک چلائی۔ مگر غیر معمولی قربانیوں کے باوجود اخوانیوں کے حصہ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ البتہ مصر ایک تباہ شدہ ملک ہو کر رہ گیا۔ مزید یہ کہ اسی اخوانی فکر کے لوگ اپنے ملک میں سیاسی داروگیر سے بھاگ کر بڑی تعداد میں امریکہ گئے۔ اب وہ وہاں مختلف قسم کے اسلامی ادارے

بڑے پیمانہ پر چلا رہے ہیں۔ اور پُرفخر طور پر وہاں اپنے کارنامے بیان کرتے ہیں۔

الإخوان المسلمون مصر میں کیوں ناکام رہے اور امریکہ میں خود اپنے دعویٰ کے مطابق، وہ کیوں کامیاب ہیں۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ انہوں نے مصر میں پُرتشدد نقشۂ کار کے مطابق کام کرنا چاہا جو وہاں اُن کے لیے قابل حصول ہی نہ تھا۔ اس کے برعکس امریکہ میں وہ پرامن طریقِ کار کے مطابق کام کر رہے ہیں جو وہاں کے حالات میں اُن کے لیے پوری طرح قابلِ حصول ہے۔

تاہم الإخوان المسلمون کو نہ مصر میں اُن کے کام پر کوئی کریڈٹ دیا جاسکتا ہے اور نہ امریکہ میں اُن کے کام پر۔ مصر میں اُن کا کام صرف سیاسی نادانی کے خانہ میں لکھا جائے گا۔ اور امریکہ میں وہ اپنے کام پر دوہرا معیار (ڈبل اسٹینڈرڈ) اختیار کرنے والے قرار پائیں گے، اِلّا یہ کہ وہ کھلے لفظوں میں یہ اعلان کریں کہ مصر میں اُن کی پالیسی سراسر غلطی اور نادانی کی پالیسی تھی۔ اعتراف کے بعد غلطی ایک نیکی بن جاتی ہے اور اعتراف کے بغیر غلطی صرف غلطی رہتی ہے۔

جماعت اسلامی کا معاملہ بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ جماعت اسلامی اور اُس کے بانی نے پاکستان میں زبردست سیاسی ہنگامہ برپا کیا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ پاکستان میں وہاں کے سیکولر حکمرانوں نے سیکولر نظام قائم کر رکھا ہے۔ جب تک اس سیکولر نظام کو توڑا نہ جائے یہاں کوئی قابلِ ذکر اسلامی کام کرنا ممکن نہیں۔ جماعت اسلامی اور اُس کے بانی کی ٹکراؤ کی اس سیاست کا کوئی مثبت نتیجہ پاکستان کو نہیں ملا۔ بلکہ برعکس طور پر پاکستان ایک تباہ شدہ ملک بن کر رہ گیا۔

اب اسی جماعت اسلامی کی فکر کو ماننے والے لوگ نہایت اطمینان کے ساتھ انڈیا کے سیکولر نظام کے تحت کام کر رہے ہیں۔ وہ پُرفخر طور پر یہاں اپنے اسلامی کارنامے بیان کرتے ہیں۔ مگر جماعت اسلامی کا معاملہ بھی وہی ہے جو الإخوان المسلمون کا معاملہ ہے۔ جماعت اسلامی کے لوگوں نے پاکستان میں جو کچھ کیا اُس پر اُنہیں صرف سیاسی نادانی کا کریڈٹ دیا جائے گا۔ اسی طرح انڈیا کی جماعت اسلامی کے لوگ انڈیا میں اپنے اعلان کے مطابق، جو کارنامے انجام دے رہے ہیں اُس پر بھی وہ کوئی کریڈٹ نہیں پاسکتے۔ اِلّا یہ کہ وہ کھلے طور پر یہ اعلان کریں کہ اُن کے بانی کا نظریہ سیکولرزم یا

سیکولر نظام کے بارے میں سراسر غلط تھا اور زمانہ سے بے خبری پر مبنی تھا۔ اس کھُلے اعلان کے بغیر یقینی طور پر وہ کسی مثبت انعام کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ غلطی کے اعلان کے بغیر انڈیا میں اُن کی پالیسی دوہرا معیار (ڈبل اسٹینڈرڈ) کی پالیسی قرار پائے گی۔ اور غلطی کے اعتراف کے بعد اُن کی یہ پالیسی موجبِ ثواب توبہ کی حیثیت اختیار کرلے گی۔

قابلِ حصول نقشۂ کار (available framework) کی جو بات یہاں لکھی گئی، وہ فرد اور جماعت دونوں کے لیے یکساں طور پر نہایت اہم ہے۔ حدیث کی زبان میں وہ اختیارِ أیسر کی پالیسی ہے، اور فطرت کی زبان میں وہ حقیقت پسندی کی پالیسی۔ یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔ اس طریقہ کو اختیار کیے بغیر اس دنیا میں نہ کوئی فرد کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل کرسکتا ہے اور نہ کوئی جماعت۔ یہ ایک ایسا اٹل قانون ہے جس میں کسی کے لیے بھی کوئی استثناء نہیں۔

مستقبل پر نظر

ایک غزوہ میں ایسا ہوا کہ مسلمانوں نے نہ صرف دشمن فوج کے مردوں کو قتل کیا بلکہ ان کے کچھ بچوں کو بھی مار ڈالا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ سخت ناراض ہوئے۔ آپ نے فرمایا: لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ آج وہ حد سے گزر گیے اور بچوں کو قتل کر ڈالا۔ یہ سن کر ایک شخص نے کہا کہ یہ مقتول بچے کیا مشرکین کے بچے نہ تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے بہترین لوگ مشرکین کی اولاد ہی تو ہیں (انما خیارکم ابناء المشرکین، احمد، نسائی)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کی نظر ہمیشہ مستقبل پر ہوتی ہے۔ وہ حال سے اوپر اٹھ کر آگے کی طرف دیکھتا ہے۔ حتی کہ حال کی ناموافق باتوں پر اس امید میں صبر کرتا ہے کہ آئندہ نئے امکانات پیدا ہوں گے اور آج کا ناموافق کل کے موافق میں تبدیل ہو جائے گا۔

دنیا کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں امکانات کی کوئی حد نہیں۔ آج جو شخص انکار کر رہا ہے کل وہ اقرار کرنے والا بن سکتا ہے۔ آج جو شخص بظاہر دشمن بنا ہوا ہے اس میں آئندہ ایسی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کرے اور آپ کا دوست اور ساتھی بن جائے۔ حتی کہ باپ کا رویہ اگر مایوسانہ ہو تو مومن اس کے بیٹے سے امید قائم کر لیتا ہے کہ شاید وہ بڑا ہو کر حق کا اعتراف کرنے والا بن جائے۔

یہ دنیا موافق امکانات سے بھری ہوئی ہے۔ مگر موافق امکانات کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کے لیے بلند حوصلگی اور عالی ظرفی درکار ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی دشمن اور دوست کی اصطلاحوں سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ وہ نفرت اور محبت کے جذبات سے بلند ہو کر رائے قائم کرے۔ اس بلند ہمتی کے بغیر ان امکانات کو استعمال کرنا ہرگز ممکن نہیں۔

ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے، اور دوسرا اس کا باطن۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چیز اپنے ظاہر کے اعتبار سے کچھ ہوتی ہے اور باطن کے اعتبار سے کچھ اور۔

عام انسان چیزوں کو صرف ان کے ظاہر کی حد تک دیکھتے ہیں۔ مومن وہ ہے جو چیزوں کو ان کے اندرونی امکانات کے اعتبار سے دیکھنے لگے۔

غلط فہمی

بعض اخبارات ہر روز کوئی خاص قول نقل کرتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک ٹائمس آف انڈیا بھی ہے جو روزانہ اپنے اڈیٹوریل کے اوپر کوئی نہ کوئی قول درج کرتا ہے۔ اخبار مذکور کی اشاعت ۱۶ جولائی ۱۹۸۸ کو میں نے کھولا تو اس میں حسب ذیل فقرہ چھپا ہوا تھا :

Beware of novel affairs, for surely
all innovation is error (Muhammad)

یہ ایک حدیث رسول کا انگریزی ترجمہ ہے۔ مگر اپنی موجودہ شکل میں وہ ناقص ہے اور سخت غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس انگریزی فقرہ کا اردو ترجمہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا : نئی باتوں سے بچو، کیوں کہ ہر جدت یقیناً غلطی ہے۔ کوئی شخص صرف اس ترجمہ کو پڑھے تو وہ سمجھے گا کہ پیغمبر اسلام نئی چیز یا نئی ایجاد کے مخالف تھے۔ حالاں کہ مذکورہ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔

یہ ایک لمبی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جو احمد، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ امورِ دین میں تم لوگ میری سنت پر اور خلفاء راشدین کی سنت پر قائم رہنا، اس سے کسی حال میں نہ ہٹنا۔ یہ نصیحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :

وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ — اور تم نئی بات نکالنے سے بچو، کیوں کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا کا فقرہ اسی حدیث کا انگریزی ترجمہ ہے۔ مگر اس حدیث میں جس بدعت سے روکا گیا ہے وہ دین میں نئی بات نکالنا ہے نہ کہ عام ضرورت کی چیزوں میں نئی بات نکالنا۔ مثلاً کوئی شخص اذان کے بدلے نقارہ بجائے تو یہ بدعت ہے۔ لیکن اذان کی آواز کو تیز کرنے کے لیے لاؤڈ اسپیکر استعمال کیا جائے تو وہ بدعت نہیں۔ حج کو قمری مہینہ کے بجائے شمسی مہینہ میں ادا کیا جائے تو یہ بدعت ہے۔ لیکن اگر حج کے سفر کے لیے اونٹ کے بجائے ہوائی جہاز استعمال کیا جائے تو یہ بدعت نہیں۔

قصوروار کون

ایک شخص نے سانڈ کو چھیڑا۔ اس کے بعد سانڈ نے اس کو اپنی سینگ سے مارا۔ ایسی حالت میں صرف یہ نہیں کہا جائے گا کہ سانڈ نے آدمی کو مارا۔ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ سانڈ نے آدمی کو مارا اور آدمی نے اپنے آپ کو سانڈ سے مروایا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے:

الترمذی، ابن ماجہ اور البیہقی نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا ینبغی للمؤمن أن یذل نفسه، قالوا و کیف یذل نفسه، قال: یتعرض من البلاء لما لا یطیق** (مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۱۷۷) یعنی کسی مومن کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ لوگوں نے کہا کہ کوئی شخص کیسے اپنے آپ کو ذلیل کرے گا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ایک ایسی مصیبت مول لے جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو۔

یہ حدیث افراد کے لئے بھی ہے اور قوموں کے لئے بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی فرد یا قوم کسی بڑی طاقت کو چھیڑے یا اس کو غصہ دلائے اور اس کے بعد یہ طاقت اس کو کچل ڈالے تو اس فرد یا قوم کے لئے یہ مظلومیت کا معاملہ نہیں ہوگا بلکہ وہ حماقت کا معاملہ ہوگا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی خود سے ایک مصیبت میں پڑتا ہے اور پھر وہ کسی دوسرے کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ مگر ایسا کرنا درست نہیں۔ جو مصیبت اپنی نادانی کی بنا پر پیش آئے اس کے لئے آپ دوسرے کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ جس تباہی کا سبب خود اپنا غلط اقدام ہو، اس کا قصوروار دوسرے کو ٹھہرانا ایک ایسی کوشش ہے جو شریعت کے نزدیک بھی قابل رد ہے اور عقل کے نزدیک بھی قابل رد۔

فطرت کا یہی وہ اصول ہے جس کو ایک عوامی مثل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے ——— آ بیل مجھے مار۔ موجودہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں بیل بھی ہے اور انسان بھی۔ ہم تخلیق کے اس نقشہ کو بدل نہیں سکتے۔ ہمارے لئے ممکن صورت صرف یہ ہے کہ ہم پھول کی طرح کانٹے کے ساتھ زندگی گزارنے کا ہنر سیکھ لیں۔

اسلامی انقلاب میں عمومی تائید

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ کا ایک واقعہ حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ ایک غزوہ (جنگ) میں ایک شخص نے حصہ لیا اور زبردست جنگی کارنامہ انجام دے کر جنگ کو جیتنے میں مدد دی۔ لیکن جنگ کے آخر میں پیغمبر اسلام ﷺ نے اعلان فرمایا کہ یہ شخص اہل جنت میں سے نہیں ہے بلکہ اہل نار میں سے ہے۔

جن لوگوں نے اس جنگ میں اس کے بہادرانہ کارنامے دیکھے تھے، انہیں آپ کے اس ارشاد پر تعجب ہوا۔ مگر جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس آدمی نے بہادرانہ قتال تو ضرور کیا تھا مگر آخر میں اس نے خود اپنی تلوار سے اپنے کو ہلاک کر لیا۔ گویا کہ اس کا معاملہ خودکشی کا معاملہ تھا، نہ کہ شہادت کا معاملہ۔

اس واقعہ کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے حضرت بلال سے فرمایا کہ اے بلال، اٹھو اور یہ اعلان کر دو کہ جنت میں صرف وہی شخص جائے گا جو مؤمن ہو اور اللہ بے شک اس دین کی مدد فاجر آدمی سے بھی کرے گا (**لایدخل الجنة الا مومن، وان الله لیوید هذاالدین بالرجل الفاجر**) فتح الباری ۱۱/۷۰۵۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے اس ارشاد سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام نے انسانی زندگی میں جو ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا چاہا تھا، اس کا آغاز اگرچہ مخلص اہل ایمان کریں گے مگر اس کی آخری تکمیل نسل در نسل کے تاریخی عمل کے ذریعہ ہوگی۔ اس تاریخی عمل میں نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی مؤثر طور پر اپنا کردار ادا کریں گے۔ پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد آپ کے بعد کی تاریخ میں مسلسل واقعہ بنتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آئندہ آفاق و انفس میں ایسی حقیقتیں ظاہر ہوں گی جو اسلام کی صداقت کو خالص علمی سطح پر ثابت شدہ بنا دیں (حم السجدہ ۵۳)

موجودہ زمانہ میں سائنسی تحقیق کے بعد جو دریافتیں ہوئی ہیں، انہوں نے اس پیشین گوئی کو حرف بحرف ایک ثابت شدہ حقیقت بنا دیا ہے۔ یہ جدید دریافتیں غیر مسلم قوموں کے ذریعہ ظہور میں

آئی ہیں۔ مسلم افراد کا حصہ ان میں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔

مذکورہ واقعہ ایک اعتبار سے ایک انسان کا واقعہ ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ ایک اصول کو بتاتا ہے۔ وہ اصول یہ کہ جہاں تک آخرت کے انعام یا جنّت میں داخلہ کا تعلق ہے، وہ صرف مخلص اہل ایمان کے حصہ میں آئے گا۔ گہرے اخلاص اور سچے ایمان کے بغیر کسی شخص کو آخرت کی ابدی جنّت ملنے والی نہیں ہے۔

لیکن جہاں تک دنیوی اعتبار سے اسلام کی تاریخ کا تعلق ہے، اس معاملہ میں ایسے افراد کا بھی حصہ ہوگا جو اخلاص اور ایمان کی شرط پر پورے نہ اترتے ہوں۔ دنیوی اعتبار سے اسلام کا جو تاریخی قلعہ بننے والا ہے، اس کی تعمیر میں بے شمار لوگ براہ راست یا بالواسطہ طور پر حصّہ لیں گے۔ ایسے لوگوں کو خدا دنیا کی کچھ چیزیں بطور معاوضہ دے سکتا ہے، مگر آخرت کا خصوصی انعام ایسے لوگوں کے لیے مقدّر نہیں۔

ربانیات

زندہ قلب

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ انہ قال: اُطلُب قَلْبَکَ فی ثلاثَة مَواطِنَ۔ عند سماع القرآن وفی مجالس الذِّکرِ و فی اوقات الخلوة. فَان لَم تَجِدْهُ فی هٰذه المَواطِنَ فَسَلِ الله أن يَمُنَّ عليک بقلبٍ فإنَهُ لَا قَلْبَ لَکْ.

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تم تین مواقع پر اپنے دل کو تلاش کرو۔ قرآن سننے کے وقت اور خدا کے ذکر کی مجلسوں میں اور تنہائی کے وقتوں میں۔ اگر ان مواقع پر تم اپنے دل کو نہ پاؤ تو اللہ سے درخواست کرو کہ وہ تم کو ایک دل دے دے۔ کیوں کہ تمہارے پاس دل موجود نہیں۔

دل آدمی کے جسم میں کیفیت کا سرچشمہ ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بتاتا ہے کہ ایک مومن سے مختلف احوال میں جو قلبی کیفیات مطلوب ہیں، وہ کیا ہیں۔ مثلاً قرآن سننے کے وقت، خدا کی یاد کی مجلسوں میں اور اسی طرح تنہائی کے لمحات میں، یہ تین مواقع وہ ہیں جب کہ دینی اور ربانی کیفیات خصوصی طور پر آدمی کے اندر جاگتی ہیں۔ ان مواقع پر غافل آدمی بھی چونک پڑتا ہے۔ سویا ہوا آدمی بھی جاگ اٹھتا ہے۔ وہ فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آدمی کا دل اگر زندہ ہو تو اس کا حال یہ ہوگا کہ جب اس کے سامنے قرآن پڑھا جائے گا تو اس سے اس کو ربانی غذا ملنے لگے گی۔ جب اس کو خدا کی یاد دلائی جائے گی تو اپنے خالق و مالک کے بارہ میں اس کے اندرونی احساسات جاگ اٹھیں گے۔ جب وہ تنہائی میں ہوگا تو اس کے اندر احتساب خویش کی کیفیت ابھر آئے گی۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے کھڑا ہوا پائے گا۔

اگر کسی آدمی کا حال یہ ہوگا کہ یہ خصوصی مواقع بھی اس کی روح میں ہلچل پیدا نہ کریں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر کی کھیتی ویران ہوگئی ہے۔ اس کے اندر فطرت ربانی کے سوتے خشک ہوگئے ہیں۔ جو شخص اپنے آپ کو اس حال میں پائے، اس کو چاہئے کہ وہ اللہ سے اپنے لئے ایک زندہ قلب اور کیفیت سے بھری ہوئی روح کا طالب بنے۔ کیوں کہ اس کے بغیر انسان کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے بغیر کسی انسان پر سعادتوں کا دروازہ کھلنے والا نہیں۔

قربت خداوندی

ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ: مرضت فلم یعدنی ابن آدم (مسند احمد ۲/ ۴۰۴)۔ یعنی میں بیمار ہوا مگر ابن آدم نے میری عیادت نہیں کی۔ اس کی وضاحت خود حدیث میں اس طرح ہے کہ اگر ابن آدم فلاں مریض کے پاس جاتا تو وہ مجھ کو وہاں پاتا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا اس مریض کے پاس اسی طرح موجود تھا جس طرح کوئی انسان ایک مریض کے پاس موجود ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اگر سچے جذبہ کے ساتھ مریض کی عیادت کرے تو اس عمل کے دوران وہ ملاقات رب کا تجربہ کرے گا۔ یہ الفاظ تجربۂ رب کے معنی میں ہیں نہ کہ مشاہدۂ رب کے معنی میں۔

ایک مومن کے علم میں یہ بات آئی کہ خدا کا فلاں بندہ بیمار ہے۔ مومن کے دل میں اس کے ساتھ ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس نے اس کے حق میں دعا کی۔ پھر وہ اس کی ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ روانہ ہوا تا کہ اس سے مل کر اس کا حال دریافت کرے اور اس کی عیادت کرے۔ یہاں تک کہ وہ مریض کے پاس پہنچا۔ اس نے سچی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت اسے دیکھا: اس کے حق میں سچے جذبہ کے تحت دعائیں کیں۔ اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا اور دل سے اس کے اندر یہ جذبہ ابھرا کہ اللہ اس کو جلد سے جلد صحت مند کر دے۔

یہ پورا عمل جو کہ تمام تر خدائی جذبہ کے تحت تھا، اس کے دوران برابر خدا کا تصور اس کے ذہن پر چھایا رہا۔ مریض سے ربط کے دوارن وہ ہر لمحہ قربت خداوندی کا تجربہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شدت احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

یہی مطلب ہے ان الفاظ کا کہ اگر انسان اپنے بھائی کی مخلصانہ عیادت کرے گا تو وہ وہاں خدا کو پائے گا۔ اس کے احساسات کی دنیا میں خدا اتر آئے گا۔ مریض کی عیادت اس کے لئے ملاقات رب کا تجربہ بن جائے گی۔

حدیث قدسی

صحیح البخاری (کتاب المرضیٰ) میں ایک حدیث قدسی اس طرح آئی ہے: اذا ابتلیت عبدی بحبیبتیه فصبر عوّضته منهما الجنة، یرید عینیه (فتح الباری ۱۰/۱۲۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں اپنے کسی بندہ کو اس کی دو محبوب آنکھوں سے آزماؤں اور وہ اس پر صبر کرے تو میں ان دونوں کے بدلے اسے جنت دے دیتا ہوں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنکھ سے محرومی اور جنت کے حصول میں کوئی لازمی رشتہ ہے۔ آنکھ سے محرومی بذات خود جنت میں داخلہ کا سبب نہیں بن جاتی۔ اصل یہ ہے کہ اس محرومی پر سچا صبر کرنے والے کے اندر وہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو اس کو جنت میں داخلہ کا مستحق بنا دیں۔

ایک عالم کا واقعہ ہے۔ وہ دینی مطالعہ میں مشغول رہتے تھے اور کتابیں لکھ کر دین کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ مگر ادھیڑ عمر کو پہنچ کر ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔ یہ ان کے لئے انتہائی سخت حادثہ تھا۔ مگر انھوں نے اس پر کامل صبر کر لیا۔ اس صبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ذہن مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے رخ پر چلنے کے بجائے مثبت رخ پر سوچنے میں مشغول ہو گیا۔

آخر کار ان کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی جس کے ذریعہ سے وہ اپنے آپ کو دوبارہ کارآمد بنا سکیں۔ انھوں نے اپنی کوششوں کو تحریر کے بجائے تقریر کی طرف موڑ دیا۔ ان کے حافظہ میں معلومات کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ یہ معلومات اب نئے انداز سے تقریر کی صورت میں ظاہر ہونے لگیں۔ بہت جلد وہ ایک کامیاب مقرر کی حیثیت سے عوام وخواص میں مقبول ہو گئے۔

ان کی باچشم تحریروں میں اگر معلومات دین کی خصوصیت ہوتی تھی، تو ان کی بے چشم تقریروں میں معلومات کے ساتھ پرسوز آواز کا اضافہ ہو گیا۔ اس طرح آنکھ کے حادثہ نے ان کے جنتی کردار کو بڑھا کر ان کے استحقاق جنت میں مزید اضافہ کر دیا۔ خدا کی نظر میں وہ پہلے سے زیادہ رحمت خداوندی کے مستحق قرار پائے۔

داخلی کیفیت

قال رسول الله ﷺ ان اللہ لاینظر الی صورکم واموالکم لکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم (مشکوۃ ۳۔ ۱۴۶۲)۔رسول اللہ نے فرمایا کہ اللہ تمہاری صورتوں کواور تمہارے مال کونہیں دیکھتا۔ بلکہ وہ تمہارے دلوں کواور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

عمل کے دو پہلو ہیں، خارجی اور داخلی۔ اللہ کے یہاں کسی عمل کی قیمت اس کی صورت خارجی کے اعتبار سے متعین نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی کیفیت داخلی کے اعتبار سے متعین ہوتی ہے۔ داخلی احساس اور اندرونی محرک کے اعتبار سے اگر آدمی اللہ کی رضا کے لئے متحرک ہوا ہے تو اس کا عمل قابل انعام ٹھہرے گا۔ اور اگر آدمی کے داخلی وجود اور اس کی اندرونی شخصیت میں اللہ کی رضا طلبی کے سوا کوئی اور جذبہ بسا ہوا تھا تو ایسے آدمی کا عمل رد کر دیا جائے گا۔ وہ اللہ کے یہاں کسی انعام کا مستحق نہیں قرار پائے گا۔

ایک شخص دینی سرگرمی دکھاتا ہے۔ اس کی دینی سرگرمی اگر خالص اللہ کے لئے ہو تو وہ آخرت کی میزان میں قابل قدر ہے، اور اگر اس کی سرگرمی کا محرک لوگوں کے درمیان عزت حاصل کرنا ہو تو ایسی دینی سرگرمی کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ ایک شخص اللہ کے نام پر مال خرچ کرتا ہے۔ اگر یہ کام اس نے رضائے الٰہی کی طلب میں کیا ہے تو وہ آخرت میں اس کا انعام پائے گا۔ لیکن اگر اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کے درمیان نمایاں ہو تو اس کا مالی انفاق آخرت میں اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کوئی کام خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی قدر و قیمت کا تعین اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے پیچھے کام کرنے والے جذبہ سے ہوتا ہے نہ کہ محض اس اعتبار سے کہ وہ ظاہری طور پر لوگوں کو کیسا دکھائی دیتا ہے۔ جو شخص دنیا کے لئے کام کرے، اس نے دنیا ہی میں اپنے عمل کا بدلہ پالیا۔ جو شخص آخرت کے لئے کام کرے تو اس کا عمل آخرت کے دفتر میں محفوظ ہے۔ وہ اپنی آخرت کی زندگی میں اس کا بہترین اجر پائے گا۔ اور بلاشبہ سب سے اچھا اجر آخرت کا اجر ہے۔

اسلام کی شناخت

اسلام کی شناخت ملّی نہیں ہے بلکہ ربّانی ہے۔ مسلم کی پہچان یہ نہیں ہے کہ اس کا کلچر الگ ہو۔ مسلم کی حقیقی پہچان یہ ہے کہ اس کی شخصیت عام انسانوں سے مختلف ہو۔ دور اول کے عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان یہ نہیں تھی کہ آپ کی زبان، آپ کا لباس، آپ کا رہن سہن دوسروں سے مختلف تھا۔ آپ کی پہچان یہ تھی کہ آپ الامین ہیں۔ بہت سے خداؤں کے دیس میں آپ ایک خدا کی عبادت کرنے والے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ : خِیارُکُم الّذین إذا رُؤُوا ذُکِرَ اللّٰہُ (ابن ماجہ، کتاب الزہد) یعنی تم میں بہتر وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں دیکھا جائے تو خدا یاد آئے۔

اسلامی شناخت کا صحیح تصور یہی ہے۔ سچا مومن وہ ہے جس کو دیکھنا اور جس سے ملنا آدمی کے لیے ایک ربانی تجربہ بن جائے۔ جس کا کلام خدا کی عظمت کا اعلان بنا ہوا ہو۔ جس کے سلوک میں حقیقی انسان کی خوشبو بسی ہوئی ہو۔ جس کا بولنا اس کے سننے والوں کو چپ کر دیتا ہو۔ اور جس کی خاموشی میں لوگوں کو تقریر کی کیفیت محسوس ہونے لگے۔

مومن وہ انسان ہے جس کو خدا کی معرفت حاصل ہو گئی ہو۔ جس کا سینہ خدا کی یاد سے پھٹ پڑا ہو۔ جو دیکھنے سے پہلے خدا کو دیکھنے لگا ہو۔ ایسا انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی ایک نشانی بن جاتا ہے۔ اس کی پوری شخصیت ایک آسمانی نور میں نہائی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسا آدمی اپنے لباس سے نہیں پہچانا جاتا۔ وہ اپنی اس اندرونی شخصیت سے پہچانا جاتا ہے جو اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ وہ اس کے لباس کو بھی ڈھک لیتی ہے۔

یہی ربانی شخصیت مومن کی اصل پہچان ہے۔ اس کو دیکھنا کسی گروہی امتیاز کو دیکھنا نہیں ہوتا۔ اس کو دیکھنا ایک ایسی ہستی کو دیکھنا بن جاتا ہے جو خدا کی یاد دلا دے، جو دیکھنے والے کے اوپر خدا کی حقیقتِ اعلیٰ کو منکشف کر دے۔

اسلامی شناخت یہ ہے کہ آدمی کا طرزِ فکر دوسروں سے مختلف ہو جائے۔ اس کے قول میں ایک نیا آہنگ پیدا ہو جائے۔ اس کا اخلاق دوسروں سے الگ دکھائی دینے لگے۔

اسلامی اصول

عن حذیفۃ ، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: قال: لا ینبغی لمسلم ان یذل نفسہ. قیل وکیف یذل نفسہ. قال یتعرض من البلاء لما لا یطیق۔

(مسند الامام احمد بن حنبل ۵/ ۴۰۵)

حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص کیسے اپنے آپ کو ذلیل کرے گا۔ فرمایا کہ وہ ایسی بلا کا سامنا کرے جس سے وہ مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

اس حدیث رسول سے اسلامی زندگی کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں جب کسی کی طرف سے کوئی بلا یا کوئی ناپسندیدہ صورتحال پیش آئے تو اس وقت یہ درست نہیں ہے کہ آدمی بھڑک کر صاحب بلا سے ٹکرا جائے۔ بلکہ اس کو سوچ سمجھ کر یہ طے کرنا چاہئے کہ دو ممکن راستوں میں سے کونسا راستہ اس کے لئے زیادہ مناسب ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی یہ محسوس کرے کہ اس کے پاس اتنی کافی قوت ہے کہ وہ کامیاب طور پر مقابلہ کرکے زیادتی کرنے والوں کو مجبور کرسکتا ہے کہ وہ اپنی زیادتی سے باز آئیں۔ اگر ایسا ہو تو آدمی کو چاہئے کہ وہ جم کر مقابلہ کرے تاکہ فساد ختم ہو اور اصلاح کی حالت قائم ہوجائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ٹھنڈے غور وفکر کے بعد آدمی اس نتیجہ پر پہنچے کہ دونوں فریقوں میں طاقت کا تناسب ناقابل عبور حد تک غیر متناسب ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ اگر مقابلہ آرائی کا طریقہ اختیار کیا گیا تو برعکس نتیجہ نکلے گا اور چھوٹا نقصان زیادہ بڑا نقصان بن جائے گا۔ اگر ایسا ہو تو لازم ہے کہ آدمی صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ اور صاحب بلا سے نہ الجھے۔

مزید یہ کہ اعراض کا مطلب بزدلی نہیں ہے بلکہ وقفۂ تیاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے وقت اور اپنی طاقت کو ٹکراؤ سے بچا کر مزید تیاری میں لگائے، وہ اپنے آپ کو زیادہ مستحکم بنانے کی تدبیر کرے۔ تاکہ آئندہ کوئی شخص اس کے خلاف زیادتی کی ہمت نہ کرے، اور اگر کوئی زیادتی کی کارروائی کرے تو آدمی کے پاس اس کے توڑ کے لئے کافی طاقت موجود ہو۔

یہ بھی اسلام کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے۔

صحت فکر

روایات میں پیغمبر اسلام ﷺ سے جو دعائیں نقل کی گئی ہیں، ان میں سے ایک دعاء یہ ہے:

اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه وار نا الاشياء كما هي (اے اللہ، تو ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس کی پیروی کی توفیق دے اور ہمیں باطل کو باطل کے روپ میں دکھا اور ہمیں اس سے بچنے کی توفیق دے۔ اور اے اللہ، تو ہمیں چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں)۔

موجودہ دنیا میں انگنت چیزیں ہیں، اور ہر چیز کے بے شمار پہلو ہیں۔ اسی طرح خود انسان بھی چیزوں کو کسی ایک ہی زاویہ سے نہیں دیکھ پاتا۔ ہر شخص اپنی ذہنی اور قلبی حالت کے تحت چیزوں کو مختلف زاویہ سے اور مختلف رخ سے دیکھتا ہے۔ اس بنا پر ہر آدمی کے لئے اور ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ کوئی خلاف واقعہ رائے قائم کر لے، وہ ایک ایسی رائے قائم کر لے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔

ایسی حالت میں آدمی اگر کوئی درست رائے قائم کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اسے بہت زیادہ اہتمام کرنا پڑے گا۔ وہ سارے متعلق پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اپنی رائے بنائے۔ اسی کے ساتھ وہ مسلسل خدا سے صحت فکر کی دعا کرتا رہے۔ کیوں کہ کوئی بھی شخص خدا کی مدد کے بغیر اس دنیا میں درست رائے تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس دنیا میں چیزیں اس طرح ملی جلی ہیں کہ ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ آدمی حق کو باطل کے روپ میں دیکھ لے، اور باطل اس کو حق کے روپ میں دکھائی دینے لگے۔ ایسی حالت میں غیر معمولی کوشش کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ آدمی حق کو حق کی صورت میں دیکھے، اور باطل اس کو صرف باطل کے روپ میں نظر آئے۔

یہ کسی آدمی کے لئے بہت بڑی نعمت ہے کہ اس کو وہ نگاہ حاصل ہو جائے جو چیزوں کو ویسا ہی دیکھنے لگے جیسا کہ باعتبار حقیقت وہ ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ سب سے زیادہ اسی کی کوشش کرے، وہ سب سے زیادہ اسی کو خدا سے مانگے۔

فراست مومن

قرآن میں تاریخ کے بعض واقعات کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: انّ فی ذلک لآیات للمتوسمین (الحجر ۷۵) اس آیت میں متوسم کی تشریح متفرس سے کی گئی ہے۔ یعنی ان تاریخی واقعات میں نشانی ہے اہل فراست کے لئے (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۰/۴۲)

اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی آئی ہے جو اس کی مزید وضاحت کرتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق، اس حدیث رسول کے الفاظ یہ ہیں:

احذروا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور الله وینطق بتوفیق الله (جامع البیان عن تاویل آی القرآن للطبری ۱۴/۴۷)	مومن کی فراست سے بچو کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اور وہ اللہ کی توفیق سے کلام کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی پر ایمان آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ چیزوں کو ربانی نظر سے دیکھے اور معاملات کے اوپر اس اعلیٰ اسلوب میں کلام کرنے لگے جو خدا کی خصوصی توفیق سے کسی کو حاصل ہوتا ہے۔

مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن چیزدرں کے ظاہر کو دیکھ کر اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ جب کہ مومن چیزوں کے ظاہر سے گزر کر اس کے باطن تک پہنچتا ہے۔ وہ اندرونی حقائق کے اعتبار سے اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ یہی وہ خاص صفت ہے جس کی وجہ سے دونوں کی رایوں میں یہ فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک کی رائے بے پناہ حدتک طاقت ور ہوتی ہے۔ اور دوسرے کی رائے بے وزن اور بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

مثلاً ایک شخص ہے جس کو اللہ سے تعلق نہیں۔ وہ بس اپنی ذات میں جیتا ہے اور اپنی عقل سے رہنمائی لیتا ہے۔ ایسے شخص کو ایک آدمی گالی دیتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ اب کیا ہوگا۔

اب یہ ہوگا کہ اس شخص کی انا بھڑک اٹھے گی۔ اس کی عقل اس کو بتائے گی کہ اس آدمی کو سبق سکھانا ہے۔ اگر میں نے اس کو سبق نہیں سکھایا تو وہ مجھ کو بزدل سمجھ لے گا اور آئندہ میرے خلاف زیادتیوں کے لئے وہ اور بھی جری ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ مذکورہ آدمی سے لڑ جائے گا۔ خواہ اس کے نتیجہ میں اس کو مزید تباہی کے سوا کچھ اور ملنے والا نہ ہو۔

اس کے برعکس جس آدمی کے خوف خدا نے اس کو متواضع بنا رکھا ہو۔ جس کو خدا کی بڑائی کی معرفت اس طرح حاصل ہو جائے کہ اس کے اندر سے اپنی بڑائی کا احساس نکل جائے۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے خلاف اشتعال انگیز بات کرے تو اس کی تواضع کی نفسیات اس کو اس انجام سے بچائے گی کہ وہ اشتعال انگیزی پر بھڑک اٹھے۔ اس کا خوفِ خدا اس بات کا ضامن بن جائے گا کہ بھڑکانے والی بات کے باوجود وہ معتدل بنا رہے۔

اشتعال انگیزی پر بھڑک اٹھنے والا آدمی اگر اپنی عقل کو کھو بیٹھتا ہے تو اشتعال انگیزی پر نہ بھڑکنے والے آدمی کو یہ خصوصیت حاصل ہوگی کہ اس کے جذبات پوری طرح اس کے قابو میں ہوں اور اس کی عقل معاملے کو ٹھیک ٹھیک سمجھے اور درست طور پر اپنی جوابی کارروائی کا منصوبہ بنائے۔

مومن کی یہی صفت ہے جو اس کو صاحب فراست بناتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ بے پناہ حد تک ناقابل تسخیر ہو جاتا ہے۔

مومنانہ عمل، دوسرے لفظوں میں، ایک صابرانہ عمل ہے۔ اور غیر مومنانہ عمل اس کے مقابلے میں ایک عاجلانہ عمل۔ صابرانہ کارروائی منصوبہ بند کارروائی کا نام ہے اور عاجلانہ کارروائی غیر منصوبہ بند کارروائی کا نام۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عاجلانہ کارروائی ہمیشہ ناکام ہوتی ہے، اور صابرانہ کارروائی ہمیشہ کامیاب۔ تاریخ کے تمام تجربات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسلّمہ ہے جس میں کوئی بھی استثناء نہیں۔

کامیاب زندگی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس کے ساتھ میں جیوں، اور وہ لمبی نہ ہو کہ میں اسے بھول جاؤں۔ آپ نے فرمایا: لا تغضب (موطا امام مالک، ۶۵۲) یعنی تم غصہ نہ کرو۔ یہ موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا سب سے زیادہ یقینی اصول ہے۔ ایک فرد کے لئے بھی اور پوری قوم کے لیے بھی۔

غصہ کیا ہے۔ غصہ دراصل ناپسندیدہ صورتِ حال کا منفی جواب (negative response) ہے۔ موجودہ دنیا میں مختلف اسباب سے ہر لمحہ کسی نہ کسی ناپسندیدہ صورت حال سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کبھی کوئی ایسی بات پیش آجاتی ہے جس سے آپ کی انا بھڑک اٹھتی ہے۔ کبھی کسی کی ایک روش سے آپ کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی مفاد کا ٹکراؤ آپ کے اندر مخالفانہ جذبات کو جگا دیتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی سے آپ کی امیدیں پوری نہیں ہوتیں اور آپ کے اندر اس کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی سب وہ چیزیں ہیں جن کو انسانی زبان میں غصہ کہا جاتا ہے۔

یہ غصہ آدمی کے لیے بے حد مہلک ہے۔ وہ آدمی سے اس کی سوچنے کی صلاحیت کو چھین لیتا ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے عمل کا نقشہ بنائے۔ وہ اس کو تعمیر کے بجائے تخریب کے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ غصہ آدمی دوسرے کے خلاف کرتا ہے، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ہمیشہ آدمی کے اپنے نقصان کا باعث بنتا ہے۔

موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اُس کو مشتعل کر دیں، جو اُس کے اندر منفی نفسیات کو جگا دیں۔ اس صورت حال کو بدلنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں کامیاب زندگی کی تعمیر کا طریقہ صرف یہ ہے کہ آدمی صبر وتحمل کی روش اختیار کرے۔ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہونے کا آرٹ سیکھ لے۔ وہ اُن حالات کے ساتھ ایڈجسٹ کرکے رہ سکے جن کو بدلنے کی قدرت اُس کو حاصل نہیں۔

زندگی میں وہ صورت حال کیوں پیش آتی ہے جب کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کو دوسرے آدمی کے خلاف غصہ آئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں خدا نے ہر ایک کو آزادی دی ہے کیوں کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے، اور آزادی کے بغیر امتحان ممکن نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب غصہ کی صورت حال پیدا ہو تو آدمی کو یہ سوچنا چاہئے کہ وہ اگر اپنے غصہ کو انتقام بنائے گا اور فریقِ ثانی سے لڑنے کی کوشش کرے گا تو اس کا یہ لڑنا کسی انسان سے لڑنا نہیں ہوگا بلکہ خدا کے مقرر کئے ہوئے فطری نقشہ سے لڑنا ہوگا۔ ایسی حالت میں غصہ کرنے والے کی ناکامی یقینی ہے۔ کیوں کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ کوئی بھی شخص اتنا طاقتور نہیں کہ وہ خدا کے بنائے ہوئے فطری نقشہ سے لڑ کر جیت سکے۔ جب ایک آدمی غصہ کو برداشت کر لے تو وہ اپنے آپ کو بہت بڑے خدائی انعام کا مستحق بناتا ہے کیوں کہ ایسے موقع پر غصہ کو برداشت کر لینا خدا کے فطری نظام کے اعتراف کے ہم معنی ہوتا ہے۔

حکمت اسلام

خطرہ کہاں ہے

ایک عربی پرچہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا: الاقلیات المسلمۃ تواجہ خطر الذوبان۔ یعنی مسلم اقلیتوں کو اس خطرہ کا سامنا ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ میں گھل مل جائیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ الاسلام یعلو ولا یعلیٰ (اسلام ہمیشہ غالب رہتا ہے وہ کبھی مغلوب نہیں ہوتا) فتح الباری ۲۶۱/۳۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ کی حیثیت عطا فرمائی ہے تو اس کے لیے مغلوب ہونے یا جذب ہوجانے کا خطرہ کیوں محسوس کیا جارہا ہے۔

اس کی وجہ بالکل سادہ ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں میں فرق نہ کرنا ہے۔ کوئی مسلم گروہ اپنے زوال کی بنا پر مذکورہ قسم کے خطرہ میں مبتلا ہوسکتا ہے لیکن اسلام، ایک ربانی نظریہ کی حیثیت سے اس سے ارفع واعلیٰ ہے کہ اس کو کسی بھی حال میں غیر اسلامی طاقتوں سے مغلوب ہونے یا ان میں جذب ہوجانے کا خطرہ لاحق ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو کہ وہ کسی غیر مسلم طاقت سے مغلوب ہوجائیں گے یا اس میں جذب ہوجائیں گے تو پیشگی طور پر یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی وجہ خود مسلمانوں کا اسلام میں کمزور ہونا ہے نہ کہ غیر مسلموں کا ان کے مقابلہ میں طاقتور ہوجانا۔

اس لیے جب بھی اس قسم کا خطرہ پیدا ہو تو مصلحین کو چاہئے کہ وہ خود مسلم نسلوں کو دوبارہ اسلام پر اٹھانے کی کوشش کریں۔ وہ ان کے کیس کو قومی کیس کے بجائے اسلام کا کیس بنادیں۔ اس کے بجائے غیر مسلم طاقتوں کے خلاف قولی یا عملی ہنگامہ آرائی کرنا ایک غیر متعلق فعل ہے جس کا خدا کی اس دنیا میں کوئی فائدہ نکلنے والا نہیں۔ مسلمانوں کا ہر مسئلہ داخلی کمزوری کا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں کے ہر مسئلہ کو صرف داخلی استحکام کے ذریعہ حل کا جاسکتا ہے۔

اصلاح میں تدریج

ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ نے فرمایا کہ قرآن میں سب سے پہلے وہ آتیں اور صورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت کا اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے تو اس کے بعد حلال وحرام کے احکام اترے۔ اور اگر ایسا ہوتا کہ شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، بحواله فتح الباری، ۶۵۵/۸)

اس روایت سے ایک عظیم حکمت نبوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی عملی حکمت ہے جس کو تدریج (graduation) کہا جاتا ہے۔ انسان کی اصلاح ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ انسان عام طور پر کچھ خیالات اور عادات سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ اسی کو درست سمجھنے لگتے ہیں۔ اس بنا پر وہ کسی نئی چیز کو فوری طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں انسانوں کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کام کو حکمت اور تدریج کے ساتھ کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں پہلے لوگوں کی سوچ کو بدلا۔ لوگوں کے اندر قبولیت کا مزاج پیدا کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کے اندر اصلاح کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی تو اس کے بعد آپ نے شرعی احکام کا نفاذ فرمایا۔ اگر آپ فکری تطہیر اور مزاج سازی کے بغیر شریعت کے قوانین نافذ کرتے تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہوتا، اور وہ انقلابی نتیجہ برآمد نہ ہوتا جو عرب کے سماج میں برآمد ہوا۔

خاموشی ضروری ہے

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت)

حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ بولنا۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں بولنا انتہائی ضروری ہوتا ہے اس لیے اس شخص کو گونگا شیطان (شیطان اخرس) کہا گیا ہے جو بولنے کے موقع پر نہ بولے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب کہ چپ رہنا ہی زیادہ صحیح اور ضروری ہے۔

خاموشی کے ضروری ہونے کی ایک مثال غزوۂ احد کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے تھے اور ایک غار میں لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے اعلان کر دیا کہ محمدؐ قتل کر دیئے گیے۔ صحابہ پر سراسیمگی چھاگئی۔ اس دوران ایک صحابی کی نظر آپ پر پڑی۔ وہ بول پڑے کہ رسول اللہ یہاں ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بولے بغیر اشارہ سے ان کو منع کیا کہ چپ رہو (اشار الیہ الرسول ان اصمت) اس کی ایک مثال وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے ساتھی سے کہو کہ چپ رہو، جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تم نے لغو فعل کیا (اذا قلت لصاحبك اسکت والامام یخطب فقد لغوت)

انفرادی مجالس میں بھی خاموشی کا یہ اصول ضروری ہے۔ مگر جب معاملہ قوم کا ہو تو اس کی اہمیت لاکھوں گنا بڑھ جاتی ہے۔ کسی نازک موقع پر ایک رہنما کی خاموشی ایک بڑے فساد کو روکنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک رہنما کی بے موقع تقریر ایک ایسا فساد برپا کر سکتی ہے جس میں سیکڑوں انسان مارے جائیں اور کروروں روپے کی جائداد جلا کر خاک کر دی جائے۔ اسی مفہوم میں سسٹر کنسولٹا (Sister Consolata) نے کہا ہے کہ کسی قوم کی ناکامیوں کی سب سے زیادہ تعداد کا سبب خاموشی کے اصول کو توڑنا ہے:

The greatest number of failings in a community
come from breaking the rule of silence.

خاموشی کی طاقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں حدیث میں آتا ہے کہ آپ دیر دیر تک خاموش رہتے تھے : فکان طویل الصمت (مسند احمد) آپ نے فرمایا کہ تم لوگ خاموشی کا طریقہ اختیار کرو : فعلیکم بالصمت (الدارمی) الترمذی ، الدارمی ، مسند احمد میں ہے آپ نے فرمایا کہ جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی (من صمت نجا)

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک اہم پہلو وہ ہے جو طریق کار سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ شور و غل کا طریقہ اختیار کرنے والا اس دنیا میں ناکام و نامراد رہتا ہے۔ اور جو آدمی خاموش تدبیر کا طریقہ اختیار کرے ، اس کو یہ خوش قسمتی حاصل ہو گی کہ قوانین فطرت اس کا ساتھ دیں گے اور وہ کامیابی کی مطلوب منزل تک پہنچ کر رہے گا۔

لاویٹر (Johann Kaspar Lavater) ۱۷۴۱ میں زیورک میں پیدا ہوا ، ۱۸۰۱ میں وہیں اس کی وفات ہوئی۔ فطرت کے اسی قانون کو اس نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ وہ شخص بولنا نہیں جانتا جو چپ نہیں رہ سکتا۔ وہ اس سے اور بھی کم واقف ہے کہ زیادہ موثر طور پر کوئی کام کس طرح کیا جائے :

He knows not how to speak who cannot be silent;
still less how to act with vigor and decision.

چپ رہنے والا سوچتا ہے ، اور جو آدمی سوچے وہی اس لائق ہوتا ہے کہ بہتر اور موثر انداز میں کام کر سکے۔ اسی طرح جو آدمی چپ رہتا ہے وہ اپنے ذہن میں اپنے عمل کا نقشہ بناتا ہے۔ وہ منصوبہ بند انداز میں اپنے عمل کا خاکہ تیار کرتا ہے ، اور جو آدمی منصوبہ بند صورت میں اپنا عملی اقدام کرے ، اس کا یہ فطری حق ہے کہ خدا کی اس دنیا میں وہ لازماً کامیاب ہو۔

خاموشی زیادہ بہتر کلام ہے۔ خاموشی زیادہ گہرے انداز میں عمل کرنا ہے۔ خاموش رہنے والا اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو زیادہ نتیجہ خیز طور پر استعمال کر سکے۔

سنت کے خلاف

جنوری ۱۹۸۷ کا واقعہ ہے۔ شہر کی ایک بس ایک بڑی مسلم تعلیم گاہ کے سامنے سے گذری۔ اتفاق سے ایک مسلمان طالب علم بس کی زد میں آگیا اور اس کے نیچے دب کر ہلاک ہوگیا۔ حادثہ کی خبر سن کر تعلیم گاہ کے مسلم طلبہ وہاں آئے تو ڈرائیور بھاگ چکا تھا۔ البتہ بس سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ طلبہ نے بس کو آگ لگادی۔ مزید انھوں نے یہ کیا کہ جو بس ادھر سے گذرتی اس کو روکتے اور آگ لگاتے۔ آگ بجھانے کے لیے فائر بریگیڈ کے لوگ آئے تو ان کو پتھر مار کر بھگا دیا۔ پولیس آئی تو انھوں نے پولیس پر بھی پتھر مارنے شروع کیے۔

اب پولیس کی باری تھی۔ پولیس غصہ میں بے قابو ہو کر طالب علموں کے اوپر ٹوٹ پڑی۔ اس کے پاس ہتھیار تھے۔ اس نے نہ صرف یہ کیا کہ سڑک پر کھڑے ہوئے طالب علموں کو مارا بلکہ وہ ہاسٹل میں اور تعلیم گاہ کے کمروں میں گھس گئی۔ اس نے سیکڑوں طالب علموں کو مار مار کر بری طرح زخمی کر دیا۔ وغیرہ۔

اس طرح کے واقعات ہندستان میں پچھلے ۴۰ سال سے مسلسل پیش آرہے ہیں۔ ان کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں مگر کہانی سب کی ایک ہے۔ ایسا ہر واقعہ ہمیشہ مسلمانوں کی کسی اشتعال انگیز کارروائی سے شروع ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کے شدید جانی و مالی نقصان پر ختم ہوتا ہے۔ چھوٹے بڑے تمام واقعات کو شمار کیا جائے تو چالیس سال میں ان کی تعداد ۴۰ ہزار تک پہونچ چکی ہوگی۔ جب بھی ایسا واقعہ ہوتا ہے تو مسلمانوں کے تمام اصاغر اور اکابر بلا استثنار یہ کرتے ہیں کہ وہ یک طرفہ طور پر پولیس اور انتظامیہ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ کوئی ایک بھی قابل ذکر شخص ایسا نہیں جو اس طرح کے معاملات میں مسلمانوں کو سمجھائے اور انھیں تنبیہ کرے۔

ہمارے یہ تمام لیڈر بلاشبہ سنت کے خلاف عمل کر رہے ہیں۔ اور حدیث کے مطابق، ہر بات جو سنت کے خلاف ہو وہ بدعت ہے۔ اور ہر بدعت کا آخری انجام تباہی ہے۔ پچھلی نصف صدی سے مسلمان جو کچھ بھگت رہے ہیں وہ سنت سے اسی انحراف کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کا مذکورہ عمل سنت سے انحراف کیوں ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ایک حدیث کا مطالعہ کیجئے:

قال الامام احمد حدثنا عمرو بن عاصم عن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

حماد بن سلمة عن علی بن زید عن الحسن عن جندب عن حذیفة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : لاینبغی لمسلم ان یذل نفسہ۔ قیل وکیف یذل نفسہ۔ قال : یتعرض من البلاء لما لا یطیق۔ وکذا رواہ الترمذی وابن ماجہ۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کیسے کوئی شخص خود اپنے کو ذلیل کرے گا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ایسی بلا کا سامنا کرے جس سے نپٹنے کی اسے طاقت نہ ہو۔

اس حدیث کی روشنی میں دیکھئے تو مذکورہ قسم کے واقعات میں پولیس یا اکثریتی فرقہ کی شکایت کرنا سراسر غیر مسنون فعل ہے۔ ایسا ہر واقعہ خود اپنی غیر اسلامیت کی داستان ہے نہ کہ اغیار کے ظلم کی داستان۔ کیوں کہ اس ملک میں مسلمان جب اقلیت میں ہیں اور جب یہ معلوم ہے کہ مسلمانوں کی متشدّدانہ کارروائی کے بعد پولیس آئے گی۔ اور موجودہ حالت میں یہ بھی معلوم ہے کہ پولیس جب آئے گی تو وہ یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی مار پیٹ کرے گی اور مسلمان اس کو ہرگز روک نہ سکیں گے۔ ایسی صورت میں مذکورہ قولِ رسولؐ کے مطابق، مسنون طریقہ یہ ہے کہ مسلمان ابتدائی اشتعال کا واقعہ نہ کریں۔ وہ ایسے آغاز سے اپنے آپ کو بچائیں جس کے متعلق معلوم ہے کہ اس کا انجام لازمی طور پر ان کے خلاف نکلے گا۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مومن ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ (المومن لایلدغ من جحر مرّتین) مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ایک ہی بل میں وہ روزانہ ہاتھ ڈالتے ہیں اور ہر روز اس سے ڈسے جاتے ہیں۔ کسی نادان شخص نے بھڑ کے چھتہ میں صرف ایک بار ہاتھ ڈالا ہوگا۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ روزانہ بھڑ کے چھتہ میں ہاتھ ڈال رہے ہیں اور روزانہ اس کا انجام بھگت رہے ہیں۔ کیا اس کے باوجود ان کا یہ دعویٰ درست ہو سکتا ہے کہ اسلام کو وہ اپنا دین سمجھتے ہیں۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول مانتے ہیں۔ دین اور رسول کا مفہوم اگر وہی ہو جو لغت کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے تو ان کا دعویٰ درست نہیں۔ اور اگر مسلمانوں کا اپنا کوئی علیحدہ لغت ہو جس میں انھوں نے بطور خود ان الفاظ کا کوئی دوسرا مفہوم لکھ رکھا ہو تو البتہ ان کا دعویٰ درست ہو سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسے کسی لغت کی قیمت ان کے اپنے نزدیک خواہ کتنی ہی زیادہ ہو، خدا اور خلق کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں۔

قال اللہ، قال الرسول

قرآن میں منکرین حق کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ـــــــ اور انھوں نے شروع کیا تم سے پہلی بار (وَهُم بدؤاكم اوّل مرة ، التوبہ ۱۳) مفسرین نے اس کی تشریح میں یہ قول نقل کیا ہے کہ البادئ اظلم (شروع کرنے والا زیادہ ظالم ہے)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

عن ابی هريرة ، قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قلتَ لصاحبكَ يوم الجمعة انصِت والامام يخطبُ فقد لغوتَ (متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کے دن تم اپنے ساتھی سے کہو کہ چپ رہو جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو، تو تم نے لغو کام کیا۔

قرآن کی مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دو آدمی آپس میں لڑجائیں تو ان میں سے جس شخص نے ٹکراؤ میں پہل کیا ہے، وہ زیادہ بڑا ظالم قرار پائے گا۔ اجتماعی زندگی میں اختلاف یا شکایت کے مواقع آتے ہیں۔ مگر ایسے مواقع پر آدمی کو پر امن تدبیر پر رہنا ہے۔ اس کے لیے کسی حال میں یہ جائز نہیں کہ وہ حد کو پار کرکے ٹکراؤ اور تصادم کے میدان میں داخل ہوجائے۔

اوپر جو حدیث نقل کی گئی، اس سے ایک اور اسلامی اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایک آدمی غلطی کر بیٹھے تو دوسرے آدمی کو چاہیے کہ وہ اس سے اعراض کرے، وہ ہرگز جوابی غلطی نہ کرے۔ جوابی غلطی، ایک غلطی کو دو غلطی بنا دیتی ہے۔ وہ اس برائی میں مزید اضافہ کر دیتی ہے جس کو برداشت نہ کرکے اس کے خلاف اقدام کیا گیا تھا۔

یہ خدا اور رسول کا حکم ہے۔ اس کے مطابق آدمی کو پہلی غلطی سے بھی بچنا ہے اور دوسری جوابی غلطی سے بھی۔ کیوں کہ پہلی غلطی کرنے والا اگر ظالم ہے تو دوسری غلطی کرنے والا لاغی۔

اس دنیا میں سب سے بڑا ظلم کرنے والا وہ ہے جو جارحیت کا آغاز کرے۔ اور سب سے زیادہ لغو کام کرنے والا وہ ہے جو ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کرے۔ اللہ سے ڈرنے والے لوگوں کو ظلم سے بھی بچنا ہے اور لغو کام کرنے سے بھی۔

اسلام اولاً فساد کی پہل کرنے والوں کو روکتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص پہلی نادانی کر بیٹھے تو اسلام کا تاکیدی حکم یہ ہے کہ فریق ثانی ہرگز دوسری نادانی نہ کرے۔

ہندستان میں ہولی کے دن ایک ہندو کچھ مسلمانوں کے اوپر رنگ ڈال دیتا ہے۔ مسلمان مشتعل ہو کر لڑنے لگتے ہیں۔ اور پھر ساری بستی میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ پاکستان کے ایک ہوٹل میں کسی مسئلہ پر تکرار ہوتی ہے۔ ایک پٹھان کچھ مہاجرین کے اوپر گرم چائے کی پیالی پھینک دیتا ہے۔ یہ مہاجرین مشتعل ہو کر لڑ پڑتے ہیں۔ اور اس کے بعد پورے شہر میں مہاجر مسلمان اور پٹھان مسلمان کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

ان واقعات میں بلاشبہ فساد کا آغاز کرنے والا ہندستان میں ہندو اور پاکستان میں پٹھان ہے۔ مگر قرآن کی رو سے دیکھئے تو دونوں جگہ فساد کو بڑھانے کی ذمہ داری فریق ثانی پر عائد ہوتی ہے۔ ہندستان میں مسلمان کے اوپر اور پاکستان میں مہاجر کے اوپر۔ کیوں کہ دونوں جگہ فریق ثانی نے یہ کیا کہ فریق اول کے جس واقعہ پر قرآن نے عفو و درگزر کا حکم دیا تھا۔ اس کو انھوں نے انتقام اور جوابی کارروائی کا عنوان بنایا۔

موجودہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ اس لیے مذکورہ نوعیت کے چھوٹے چھوٹے واقعات بہر حال ہر جگہ پیش آئیں گے، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک۔ یہ اس تخلیقی منصوبہ کا فطری نتیجہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو بنایا ہے۔ اسی لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس طرح کے واقعات کو اعراض کے خانہ میں ڈال دو۔ اس کو اشتعال اور انتقام کا مسئلہ نہ بناؤ —— اب جو شخص ایسا نہ کرے وہ بلاشبہہ غلطی پر ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے نظامِ تخلیق پر راضی نہیں ہوا۔

ہندستان اور پاکستان میں جو لوگ عفو و درگذر کے اصول کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، وہی لوگ "پٹرو ڈالر" کے ملکوں میں جا کر مبالغہ کی حد تک عفو و درگذر کے اصول کی پابندی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں قرآن کے حکم کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اہمیت پٹرو ڈالر کے حکم کی ہے۔ اس سے زیادہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ اپنے آپ کو قرآن کا مومن کامل سمجھتے ہیں۔

علم کا حصول

صحیح مسلم میں کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ (بابُ اوقات الصلوات الخمس) کے تحت ایک روایت اِن الفاظ میں نقل کی گئی ہے :

عن عبد اللّٰہ بن یحیی بن ابی کثیر	عبداللہ بن یحیی بن ابی کثیر سے روایت ہے۔ وہ کہتے
قال سمعتُ ابی یقول:	ہیں کہ میں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ
لا یُستطاعُ العلم براحۃِ الجسم	علم جسمانی راحت کے ساتھ نصیب نہیں ہوتا۔

اس حدیث کا اگرچہ اوقاتِ نماز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بظاہر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ امام مسلم نے اس کو اوقات الصلوۃ کے باب کے تحت کیوں نقل کیا۔ تاہم اس سے قطع نظر، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے حصول کے لیے جاں فشانی کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم میں گہری بصیرت اس کے بغیر حاصل نہیں ہوتی کہ آدمی راحت و آرام سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو علم کے حصول کے لیے وقف کر دے۔

علم کے لیے تحقیق اور مطالعہ انتہائی حد تک ضروری ہے۔ جب آدمی صحیح معنوں میں تحقیق اور مطالعہ میں لگتا ہے تو مصروفیتوں کی ایک پوری دنیا اس کے سامنے کھل جاتی ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ کھانا، نیند، آرام اور دوسرے جسمانی تقاضوں کو نظر انداز کیے بغیر وہ اپنے تحقیق اور مطالعہ کے کام کو جاری نہیں رکھ سکتا۔ اس وقت جو آدمی علم کا سچا طالب ہو وہ دوسرے تمام تقاضوں کو ثانوی قرار دے کر ہمہ تن علم کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔

مگر یہ بھی صرف ایک ظاہری بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم میں مشغول ہونا خود ایک راحت ہے۔ آدمی جب علم کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو یہ تجربہ اس کے لیے اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ وہ خود ہر قسم کے آرام کا بدل بن جاتا ہے۔ اب جسمانی راحت کو چھوڑنا راحت کو چھوڑنا نہیں ہوتا بلکہ چھوٹی راحت سے نکل کر زیادہ بڑی راحت کو پا لینے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

یہی وہ چیز ہے جو علم کے طالب کے لیے ہر قسم کی بے آرامی کو قابل قبول بنا دیتی ہے۔ وہ بڑی چیز کو پانے کی خوشی میں چھوٹی چیز کے کھونے کو برداشت کر لیتا ہے۔

پانچویں نہ بنو، ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے

ایک حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
کن عالما او متعلما او مستمعا او محبا ولا تکن الخامس فتھلک
تم علم کو جاننے والے بنو یا علم کو سیکھنے والے یا علم کو سننے والے یا علم سے محبت کرنے والے،
اور پانچویں نہ بنو ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے۔

اس حدیث میں علم سے مراد وہ علم ہے جو آدمی کو اللہ اور اللہ کی باتوں سے باخبر کرے۔ لوگوں میں کوئی پڑھا لکھا ہوتا ہے، کوئی جاہل۔ کوئی ذہین ہوتا ہے کوئی غبی۔ اس لئے آدمیوں کی مختلف حالت کے اعتبار سے آپ نے چار درجے مقرر کردیئے۔ اور فرمایا کہ ہر حال میں تم کو ان چار درجوں میں سے کسی ایک درجہ پہ ہونا چاہیئے۔

یا تو تم وہ شخص بنو جس نے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرکے دین خداوندی کو بخوبی سمجھ لیا ہو اور اس کے لئے وہ ضروری محنت و ریاضت کرلی ہو جو آدمی کو صحیح معرفت تک پہنچاتی ہے۔ اگر یہ مقام تم کو حاصل نہ ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ تم اپنی اس کمی سے آگاہ ہو اور اس کو پورا کرنے کے لئے علم حقیقی کو سیکھنا شروع کردو، قرآن وسنت کے طالب علم بن جاؤ۔ اگر تم اپنے حالات کے لحاظ سے یہ بھی نہ کرسکو تو تیسرا درجہ یہ ہے کہ تمھارے اندر اس واقعہ کا اعتراف پیدا ہوجائے کہ تم نہ صاحب علم ہو نہ طالب علم۔ ایسی حالت میں تمھارے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ تم سننے والے بن جاؤ۔ جہاں کہیں خدا کی باتیں ہوں، تم وہاں خاموشی سے بیٹھو اور جو کچھ بتایا جارہا ہو اس کو غور سے سنو۔ پھر اگر کوئی اس درجہ پر بھی نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنی اس محرومی کا احساس کرے۔ اور اس احساس محرومی کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں ان لوگوں کے لئے محبت پیدا کرے جو اس متاع علم میں اپنا حصہ پائے ہوئے ہیں جس سے وہ اپنا حصہ نہ پاسکا۔ یہ چوتھا درجہ ہے جہاں کوئی مومن اس دنیا میں ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد جو پانچواں درجہ ہے وہ ہدایت کا نہیں بلکہ گمراہی کا درجہ ہے۔ وہ یہ کہ آدمی علم حقیقت سے باخبر نہ ہو، اس کے باوجود بحث و نزاع کرے، وہ علم دین کے بجائے کسی اور علم کا متعلم بن جائے۔ وہ سننے اور سیکھنے کے لئے ان مجالس کا انتخاب کرے جہاں دین کی باتیں نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ اس کے دل میں محبت و احترام بھی ان لوگوں کے لئے ہوجائے جو علم دین کے مالک تو نہیں ہیں البتہ دوسری قسم کی مہارتوں میں کمال رکھتے ہیں یہ انسان کی پانچویں حالت ہے اور جو اپنے آپ کو اس حال پر پائے اس کو سمجھنا چاہئے کہ وہ ہلاک ہوگیا۔ الا یہ کہ وہ واپس لوٹے اور مذکورہ چار میں سے کوئی ایک بننے کی کوشش کرے۔

فرق کو جانئے

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن خیر کی باتیں سننے سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ جنت تک پہنچ جائے (صفحہ ۹)

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے۔ پس وہ جہاں اسے پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے (والکلمة الحكمة ضالة المومن، فحيث وجدها فهو احق بها) جامع الاصول فی احادیث الرسول ۹/۸

یہاں حکمت کی بات سے مراد صرف وہ بات نہیں ہے جو قرآن اور حدیث میں ہو بلکہ ہر وہ صحیح بات ہے جو کسی جگہ پائی جائے۔ اس سے مراد دراصل دانش مندی (Wisdom) کی بات ہے۔ اور دانش مندی کی بات کسی بھی شخص کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ حتی کہ ایک جاہل اور عام آدمی کے ذریعہ بھی۔ دانش مندی کی بات دراصل فطرت کی بات ہوتی ہے۔ اور اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لیے دانش مندی کی ہر بات اسلام کی اپنی ہی بات ہے۔ اور مومن کو اسے خود اپنی چیز سمجھ کر لے لینا چاہیے۔

اس کی وضاحت کے لیے یہاں ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔ ایک عیسائی عالم نے خدا سے دعا کی تو اس نے اپنی دعا میں یہ الفاظ کہے۔ اے خدا مجھے وہ طاقت دے کہ میں جس چیز کو بدل سکتا ہوں اس کو بدلوں اور وہ تحمل دے کہ میں اس چیز کے ساتھ رہ سکوں جس کو میں بدل نہیں سکتا اور وہ دانش مندی کہ میں فرق کو جانوں :

Oh God give me the strength to change the things which I can, and the serenity to live with things I cannot change, and the wisdom to see the difference.

یہ بات اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی عیسائی یا غیر عیسائی کی بات نہیں ہے بلکہ وہ فطرت کی بات ہے۔ اور اسلام چوں کہ دینِ فطرت ہے اس لیے دانش کی ہر بات خود اسلام کی بات ہے مومن کو چاہیے کہ دانش کی ہر بات کو خود اپنی بات سمجھ کر قبول کرلے۔

خاموش منصوبہ

ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ایک بار ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک مہم پر جا رہے تھے۔ راستہ میں کچھ لوگ بلند آواز سے اللہ اکبر پکارنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ اے لوگو، خاموشی کا طریقہ اختیار کرو۔ تم جس خدا کو پکار رہے ہو وہ بہرا یا غائب نہیں ہے۔ وہ تمہارے قریب ہے اور سب کچھ سنتا اور جانتا ہے (بخاری و مسلم)

اسی طرح ۹ ھ میں جب آپ اپنے دس ہزار ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے تو آپ نے مکمل خاموشی اور رازداری کا طریقہ اختیار فرمایا جس کی تفصیلات سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس مہم کے دوران آپ نے جو طریقہ اختیار فرمایا وہ آپ کی اس دعا کے الفاظ میں واضح طور پر جھلک رہا ہے۔ آپ نے دعا کرتے ہوئے کہا۔ اے اللہ، میری کوئی خبر قریش کو اس وقت تک پہنچنے نہ دے جب تک میں ان کی بستیوں میں داخل نہ ہو جاؤں۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ پیغمبر کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی مقصد کو حاصل کرنا ہو تو اس کی ساری منصوبہ بندی رازدری کے ساتھ ہونی چاہئے۔ فریق ثانی کے خلاف اقدام اس طرح کیا جانا چاہئے کہ اس کو صرف اس وقت خبر ہو جب کہ واقعہ عملاً ہو چکا ہو۔

ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ رازداری سے مدد لو۔ یہ بے حد اہم ہدایت ہے۔ رازدری ایک مددگار ہتھیار ہے۔ جو لوگ اس پر امن ہتھیار کو استعمال کریں وہ ہمیشہ اپنے منصوبہ کی تکمیل میں کامیاب رہیں گے۔

یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ ایک لفظ میں اس کو خاموش منصوبہ کہا جا سکتا ہے۔ یعنی شور و غل کے طریقہ سے مکمل پرہیز کرتے ہوئے فریق ثانی تک اس طرح پہنچنا کہ پیشگی طور پر اس کو اس کی اطلاع نہ مل سکے۔ اور اس کے لئے جوابی تیاری کرنا ممکن نہ رہے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔

ترتیب وتدریج

صحیح البخاری (کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن) میں حضرت عائشہ رضی کی ایک روایت ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ اسلام میں پہلے جنّت وجہنم والی آیتیں اتریں۔ جب لوگوں کے اندر قبولیت کا مادہ پیدا ہوگیا تو اس کے بعد حرام و حلال کے احکام اترے۔ اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ شراب چھوڑ دو اور زنا چھوڑ دو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم تو کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے، ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے (لقالوا لاندع الخمر ابداً ولاندع الزنا ابداً) فتح الباری ۸/۶۵۵

احکام کو جاری کرنے کی یہ ترتیب صرف دور اول کے لیے نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ترتیب وتدریج صرف ابتدائی دور کے لیے تھی جب کہ قرآن اتر رہا تھا، اب جبکہ قرآن پورا اتر چکا تو اب وہ بیک وقت پورا نافذ بھی کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ احکام کے اجراء اور نفاذ کا تعلق معاشرہ کی ایمانی اور اخلاقی حالت سے ہے۔ جب بھی لوگوں میں ایمانی اور اخلاقی کمزوری پائی جائے گی تو دوبارہ وہی ترتیب مطلوب ہو جائے گی جو دور اول میں مطلوب تھی۔

مورخین اسلام نے خلیفۂ عادل حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے بارہ میں لکھا ہے کہ خلیفہ ہو جانے کے باوجود انھوں نے سارے شرعی احکام بیک بار نافذ نہیں کیے۔ ان کے نوجوان صاحبزادہ عبد الملک نے ایک دن کہا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ تمام شرعی احکام کو نافذ نہیں کر رہے ہیں۔ اب آپ اس قوم کے خلیفہ ہیں، تمام شرعی احکام کو نافذ کر کے آپ موجودہ تمام ظلم وفساد کو ختم کر دیجئے۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا:

لاتعجل یابنی، فان الله ذم الخمر فی القرآن مرتین وحرمها فی الثالثة۔ وانی اخاف ان احمل الحق علی الناس جملة فیدفعونه جملة ویکون من ذا فتنة۔

(المجلة ۱۸ - ۲۴ فروری ۱۹۹۶، صفحہ ۳۵)

اے میرے بیٹے، جلدی نہ کرو۔ کیوں کہ اللہ نے شراب کی دو بار مذمت کی اور پھر تیسری بار اس کو حرام کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں حق کو بیک وقت لوگوں کے اوپر لاد دوں تو وہ اس کو بیک وقت اتار پھینکیں گے۔ اور پھر ایک نیا فتنہ پیدا ہو جائے گا۔

عمر بن عبدالعزیز کے اس جواب پر ان کے صاحبزادہ عبدالملک نے یہ نہیں کہا کہ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب کہ قرآن اتر رہا تھا۔ اب جب کہ پورا قرآن نازل ہو چکا ہے تو اب بعد کے زمانہ کے لیے یہ ترتیب نہیں ہے۔ اب ہمارے پاس مکمل شریعت ہے، اور اب ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم سیاسی طاقت کو استعمال کر کے پوری شریعت کو مکمل طور پر نافذ کر دیں۔ اب ہم اس کے حصے بخرے نہیں کر سکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ترتیب ہی ابدی طور پر اس کے نفاذ کی ترتیب بھی ہے۔ اگلی نسلوں میں ہمیں دوبارہ یہ دیکھنا ہے کہ لوگوں کی ایمانی طاقت کیا ہے۔ لوگوں کی قبولیت کا کیا حال ہے۔ سماجی اور سیاسی حالات کیسے ہیں۔ اور پھر حقیقی صورت حال کا جائزہ لے کر اس کے مطابق تدریجی طور پر شرعی احکام کو نافذ کرنا ہے۔

اسی کا نام اسلامی حکمت ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ نظری اور عملی پہلوؤں میں فرق کیا جائے۔ اسلام کے عملی احکام کو بالترتیب اتنا ہی نافذ کیا جائے جتنا کہ لوگوں کے اندر قبولیت کا مادہ پایا جا رہا ہے، اور بقیہ اجزاء شریعت کے سلسلے میں ترغیب و تبلیغ کی مہم جاری رکھی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قوانین کے نفاذ کا معاملہ ۵۰ فی صد حکومت سے تعلق رکھتا ہے، اور بقیہ ۵۰ فی صد زیر نفاذ انسانوں سے۔ کوئی قانون کسی معاشرہ میں اسی وقت نافذ ہوتا ہے جب کہ خود معاشرہ کے اندر اس کے حق میں ایک درجہ کی آمادگی پیدا ہو چکی ہو۔ معاشرہ میں موافق فضا پیدا کیے بغیر اس کے اندر قانون کا نفاذ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ زمین تیار کیے بغیر اس سے ہری بھری فصل حاصل کرنا۔

حکمت کی بات

قال ابن عباس : ما انتفعت بشئ بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم انتفاعی بکلمات کتبھن الیّ امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ قال : کتب الیّ : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم . اما بعد : فان المرء یفرح بادراک مالم یکن لیفوتہ ۔ ویغتم بفوت مالم یکن لیدرکہ ۔ فاذا آتاک اللہ من الدنیا شیئاً فلا تکثرن بہ فرحًا . و اذا منعک منھا فلا تکثرن علیہ حزنا . ولیکن ھمک لما بعد الموت . والسلام

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جس کلام سے مجھ کو سب سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا وہ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ایک خط تھا ۔ انھوں نے مجھے لکھا :
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ آدمی ایک ایسی چیز کو پاکر خوش ہوتا ہے جس کو وہ کھونے والا نہ تھا ۔ اور ایک ایسی چیز کو کھو کر غمگین ہوتا ہے جس کو وہ پانے والا نہ تھا ۔ پس جب اللہ تم کو دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز دے تو تم اس کو پاکر بہت زیادہ خوش نہ ہو ۔ اور جب اللہ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز تم سے روکے تو تم اس پر بہت زیادہ غمگین نہ ہو ۔ اور تمہاری فکر اس چیز کے لیے ہونا چاہیے جو موت کے بعد ہے ۔ والسلام

کیوں ایسا ہے کہ لوگ کوئی چیز پاتے ہیں تو اس پر ناز کرنے لگتے ہیں اور اگر وہ کوئی چیز کھوتے ہیں تو غم اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ پانے کو کامیابی سمجھتے ہیں اور کھونے کو محرومی ۔ حالانکہ اس دنیا میں نہ تو پانا کامیابی ہے اور نہ کھونا محرومی ۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں پانا اور کھونا دونوں امتحان کے لیے ہوتا ہے ۔ اللہ تعالےٰ ہر آدمی کو جانچنا چاہتا ہے ۔ اسی مصلحت کے تحت وہ کبھی کسی کو ایک چیز دیتا ہے اور کبھی کسی سے کوئی چیز چھین لیتا ہے ۔ دونوں ہی کا مقصد آزمائش ہے ۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کا بندہ پاکر کیسا بنتا ہے اور کھو کر اس کا کیا حال ہوتا ہے ۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو پانے پر فخر و ناز کرنا بھی اس کو اتنا ہی بے معنی معلوم ہوگا جتنا کھونے پر آہ و فغاں کرنا ۔

فہمِ دین

۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ کو ۱۰ فلسطینی عرب ہمارے دفتر (نئی دہلی) میں آئے۔ ان کے قائد شیخ کمال الخطیب تھے جو فلسطین کی اسلامک موومنٹ کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ بقیہ نوجوان وہ تھے جو دہلی کی مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پورے ملک میں زیر تعلیم فلسطینی نوجوانوں کا سالانہ مخیّم (کیمپ) بنگلور میں اسی سال دسمبر میں ہوا۔ یہ لوگ اس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے ان میں سے ایک استاد جہاد محمد تھے وہ ریسرچ کے تحت دہلی میں مقیم ہیں۔ ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے : 6846964

یہ سب نوجوان انتہا پسند فلسطینی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کہ تشدد کے ذریعہ فلسطین کے مسئلہ کو حل کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجئے۔ میں نے کہا کہ نہ صرف فلسطین بلکہ کشمیر، الجزائر اور اس قسم کے دوسرے تمام مقامات کے لیے میری ایک ہی نصیحت ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تمام لوگ تشدد کے طریقہ کو مکمل طور پر ختم کر دیں اور صرف امن کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی تحریک چلائیں۔ وہ کسی بھی حال میں اور کسی بھی عذر کو لے کر متشددانہ طریقہ نہ اختیار کریں۔

میں نے کہا کہ آپ کو میرا یہ مشورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی روشنی میں ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ کی یہ روایت آئی ہے کہ : ما خُيّر رسول الله صلى الله عليه وسلم بين أمرين إلا أخذ أيسرهما (فتح الباری ۶/۶۵۴) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کسی معاملہ میں دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان طریقہ کا انتخاب فرماتے۔

میں نے کہا کہ آپ اور آپ جیسے دوسرے لوگ آزادیٔ وطن یا جہاد اسلام کے نام سے جو تحریک چلا رہے ہیں اس میں باعتبار اسلوب آپ کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ ایک، پُرتشدد طریقہ اور دوسرا پُرامن طریقہ۔ بروقت آپ لوگوں نے اپنی تحریک کے لیے پرتشدد طریقہ کو اختیار کر رکھا ہے۔ مذکورہ روایت کے مطابق یہ سنتِ رسولؐ کے خلاف ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں آپ اختیار ایسر (اختیار اسہل) کے طریقہ کو اپنائیں۔ یعنی تشدد کے طریقہ کو

چھوڑ کر پر امن جدوجہد کے اصول پر اپنی تحریک چلائیں۔

ایک فلسطینی نوجوان نے کہا کہ صحیح بخاری کی اس روایت میں آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ مَالَمْ یَکُنْ اِثْمًا (جب تک کہ وہ گناہ نہ ہو)۔ اس وقت فلسطین اور دوسرے اس قسم کے مقامات پر حکمراں طبقہ لوگوں کو قتل کر رہا ہے اور ان کی اقتصادیات کو تباہ کر رہا ہے پھر اس سے بڑا اثم اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس اثم عظیم کی موجودگی میں کیسے اختیار ایسر کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ خود حدیث کے الفاظ کے مطابق اس اثم کی موجودگی میں ہمیں امن کے سہل طریقہ کو چھوڑ کر تشدد کے مشکل طریقہ کو اختیار کرنا چاہیے۔

میں نے کہا کہ مالم یکن اثمًا کا یہ مطلب نہیں۔ پوری حدیث اس طرح ہے کہ مالم یکن اثمًا، فان کان اثمًا کان ابعد الناس منہ (جب تک کہ وہ اثم نہ ہو۔ اور اگر وہ اثم ہو تو آپ اس سے بہت زیادہ دور رہتے تھے) یہاں "وہ" سے مراد فریق ثانی کی روش نہیں ہے۔ بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریقہ ہے۔ اس کا تعلق فعلِ غیر سے نہیں ہے بلکہ فعلِ رسولؐ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی صورت حال کے مقابلہ کے لیے جب آپ کو دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہو تو آپؐ ہمیشہ آسان طریقہ کے ذریعہ سے فریق ثانی کا مقابلہ کرنے کی کوشش فرماتے۔ بشرطیکہ اختیار کیا جانے والا یہ طریقہ اثم نہ ہو۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ ایک شخص کو پیاس لگی ہوئی ہے، اپنی پیاس بجھانے کے لیے اس کے سامنے دو صورتیں ہیں۔ ایک طرف وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پاس شراب کی بوتل رکھی ہوئی ہے۔ دوسری طرف اس کے علم میں آتا ہے کہ اس علاقہ میں پانی کا ایک چشمہ ہے مگر وہ پہاڑ کے اوپر واقع ہے۔ اس مثال میں شراب پی کر اپنی پیاس بجھانا بظاہر آسان ہے اور چل کر پانی تک پہنچنا بظاہر مشکل۔ مگر یہاں شریعت کا حکم ہو گا کہ وہ آدمی آسان ہونے کے باوجود شراب سے اپنی پیاس نہ بجھائے بلکہ سفر کر کے چشمہ تک پہنچے اور اس کے پانی سے اپنی پیاس بجھائے۔

ابن حجر العسقلانی نے حدیث کے مذکورہ حصہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ای مالم یکن الاسہل مقتضیاً للاثم فانہ حینئذٍ یختار الاشد (فتح الباری ۶/۶۶۵) یعنی جب

تک آسان طریقہ کسی اثم کا مقتضی نہ ہو اور جب وہ طریقہ اثم کا مقتضی ہو تو آپ مشکل طریقہ کا انتخاب فرماتے۔

سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری عمر نبوت میں اس اصول کو اختیار فرمایا کہ جہاں آسان طریقہ اور مشکل طریقہ، دو میں سے ایک کا انتخاب کرنے کا موقع ہو تو آپ نے ہمیشہ آسان کا انتخاب فرمایا۔

مثلاً مکہ میں بیت اللہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ اب اس معاملہ میں آپ کو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ ایک انتخاب تھا —— بیت اللہ میں داخل ہو کر بتوں کو توڑنا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انتخاب یہ تھا کہ پر امن طور پر یہ تبلیغ کی جائے کہ اے لوگو، بت پرستی کو چھوڑو اور ایک خدا کی عبادت کرو۔ ان دونوں میں بت شکنی کا طریقہ واضح طور پر مشکل تھا اور پر امن تبلیغ کا طریقہ اس کے مقابلہ میں واضح طور پر آسان۔ چنانچہ آپ نے مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کو لے لیا۔

اسی طرح ہجرت کے موقع پر آپ کے سامنے دو میں سے ایک کا انتخاب تھا۔ ایک یہ کہ مکہ والوں کے ظلم کے خلاف مسلح لڑائی چھیڑیں، اور دوسرے یہ کہ اپنے اصحاب کے ساتھ خاموش طور پر مکہ سے مدینہ چلے جائیں۔ یہاں بھی آپ نے مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کا انتخاب فرمایا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ مشرک قبائل بارہ ہزار کی تعداد میں مسلح ہو کر مدینہ کی طرف بڑھ رہے ہیں، آپ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ نوجوان مسلمانوں کی رائے یہ تھی کہ ان کے خلاف جنگ کی تیاری کی جائے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت سلمان فارسیؓ نے بتایا کہ ایران میں جب اس قسم کی صورت حال پیش آتی ہے تو اپنے اور دشمنوں کے درمیان خندق کھود کر مسلح ٹکراؤ کو روک دیا جاتا ہے۔ اس وقت آپ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ کو اختیار فرمایا جو دو ممکن صورتوں میں سے آسان صورت کے ہم معنی تھا۔

اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر آپؐ کے سامنے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اپنے تقریباً پندرہ سو اصحاب کو لے کر قریش سے مسلح ٹکراؤ کریں۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انتخاب یہ تھا کہ قریش سے صلح کر کے جنگ کو ٹال دیا جائے اور اپنی طاقت کو پر امن تبلیغ کی طرف موڑ دیا جائے۔ یہاں بھی آپ نے وہی طریقہ اختیار فرمایا جو مشکل کے مقابلہ میں آسان کا انتخاب لینے کے ہم معنی تھا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے صرف عربی جاننا کافی نہیں۔ مذکورہ تمام افراد عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ مگر مذکورہ حدیث کو وہ نہ سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان جاننے کے ساتھ آدمی کے اندر سنجیدگی ضروری ہے جس کو قرآن میں تقویٰ کہا گیا ہے (البقرہ ۲۸۲) اگر سنجیدگی نہ ہو تو صرف عربی زبان کو جاننا قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

قرآن کے مطابق، تقویٰ علم صحیح کا ذریعہ ہے (واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ) آدمی کے اندر اگر تقویٰ کی صفت نہ ہو تو خارجی معلومات کا کوئی بھی ذخیرہ اس کا بدل نہیں بن سکتا۔ تقویٰ عالم کے لیے ایک خدائی لگام کی مانند ہے۔ یہ لگام اس کو اِدھر اُدھر منحرف ہونے سے بچاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کا مفہوم متعین کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مفہوم اپنی خواہشات اور اپنے تعصبات کے تحت مقرر کیا جائے۔ جو لوگ اس قسم کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ بظاہر ایک آیت یا ایک حدیث کا حوالہ دیں گے۔ مگر اس آیت اور اس حدیث میں وہ خود اپنے آپ کو پڑھ رہے ہوں گے نہ کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی بات کو۔ ایسے لوگ اپنے جذبات و خیالات میں اتنا زیادہ گم ہوتے ہیں کہ ان کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ آیت یا حدیث کو بے لاگ انداز میں سمجھ سکیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی پوری طرح خالی الذہن ہو کر قرآن و حدیث کو پڑھے، وہ کھلے ذہن کے تحت یہ جاننے کی کوشش کرے کہ خود آیت یا حدیث کے الفاظ سے کیا مفہوم نکل رہا ہے ایسے ہی لوگ اس کے صحیح مفہوم تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

اس معاملہ میں تقویٰ کا رول یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر احتیاط کا مزاج بناتا ہے، خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ آیت یا حدیث کا ٹھیک وہی مفہوم لے جو واقعی طور پر اس سے نکلتا ہے نہ کہ کوئی خود ساختہ مفہوم جو آدمی کے اپنے دماغ میں تو ضرور ہے، مگر آیت کے الفاظ میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

شریعت کا حکم

اسلامی شریعت کا ایک متفقہ مسئلہ ہے : المشقة تجلب التيسير (مشقت آسانی کا موجب ہوتی ہے۔) یعنی جب کسی شرعی حکم پر عمل کرنا مشقت کا باعث ہو تو ایسے حالات میں خود شرعی حکم کو نرم کر دیا جاتا ہے، نہ یہ کہ حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر قیمت پر شریعت کی تعمیل پر اصرار کیا جائے۔

مثال کے طور پر ایک مسلمان پر حج کی عبادت فرض ہو چکی ہے، مگر اس کے لئے حج کے سفر کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ کسی وجہ سے خطرناک ہو گیا ہے تو ایسی حالت میں یہ حکم نہیں دیا جائے گا کہ تم جان و مال کا خطرہ مول لے کر حج کے لئے نکلو، بلکہ خود حج کا فریضہ اس کے اوپر سے ساقط ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک شخص مرض میں مبتلا ہے۔ نماز کا وقت آیا اور اس پر نماز کی ادائیگی فرض ہو گئی لیکن اندیشہ ہے کہ اگر وہ پانی سے وضو کرے گا تو اس کا مرض بڑھ جائے گا۔ ایسی حالت میں اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم جان پر کھیل کر وضو کرو۔ بلکہ اس سے کہا جائے گا کہ تم مٹی سے تیمم کر کے اپنی نماز ادا کر لو۔ اسی طرح ایک شخص بھوکا ہے اور وہ ایسے حالات میں ہے کہ وہاں خنزیر کے گوشت کے سوا کوئی اور چیز اس کے لئے قابل حصول نہیں۔ اس وقت اس سے شریعت کا مطالبہ یہ نہیں ہو گا کہ خواہ تم بھوک سے مر جاؤ مگر حرام گوشت کا کوئی ٹکڑا اپنے منہ میں مت ڈالو۔ اس کے برعکس ایسے مضطر شخص کے لئے خنزیر کے گوشت کو کھانا جائز قرار دیدیا جائے گا۔ وغیرہ۔

شریعت کا ہر حکم استطاعت کے ساتھ مشروط ہے (التغابن ۱۶) اسی کو حدیث میں ان الفاظ میں فرمایا کہ: اذا امرتكم بامر فأتوا منه ما استطعتم (بخاری و مسلم) یعنی جب میں تم کو کوئی حکم دوں تو اس میں سے جتنا تمہارے بس میں ہو اتنا کرو۔

یہ شریعت کا ایک نہایت اہم اصول ہے اور اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے علماء اس اصول کو صرف جزئی مشقتوں پر منطبق کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں شاید کوئی بھی عالم نہیں جو اس شرعی اصول کو بڑی بڑی مشقتوں کے معاملہ میں چسپاں کرتا ہو۔

موجودہ زمانہ میں اس کوتاہی کا بے پناہ نقصان مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں تقریباً ہر مسلم علاقہ میں "سیاسی انقلاب" کے نام سے تحریکیں چلائی جارہی ہیں۔ ان تحریکوں کا براہ راست ٹکراؤ حکومت وقت سے ہوتا ہے۔ حکومت وقت ان تحریکوں کو اپنے لئے سیاسی خطرہ سمجھ کر ان پر پابندی لگاتی ہے۔ اس کے بعد تحریکوں کے علمبردار تشدد پر اتر آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت اپنی طاقت کو استعمال کرکے ان تحریکوں کو کچلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ واقعہ آج دنیا کے تقریباً ہر حصہ میں مختلف صورتوں میں پیش آرہا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے صرف ایک ہی کام کر رہے ہیں، اور وہ شکایت اور احتجاج ہے۔ وہ تحریک چلانے والے لوگوں کو کچھ نہیں کہتے۔ البتہ حکمرانوں کو اسلام دشمن قرار دے کر رات دن وہ ان کی مذمت میں مشغول ہیں۔

یہ طریقہ واضح طور پر اسلامی شریعت کے خلاف ہے۔ جب شریعت یہ کہتی ہے کہ جس حکم پر عمل کرنا مشقت کا باعث ہو رہا ہو وہ عمل مسلمانوں سے رفع کر دیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مذکورہ نوعیت کی تباہ کن سیاست کا مطلب اپنے آپ کو ایک ایسے حکم کا مکلف بنانا ہے جس کا مکلف شریعت نے ان کو نہیں کیا۔

جب یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ مشقت کے موقع پر شریعت حکم کو آسان کر دیتی ہے تو یہی اصول اس سیاسی معاملہ میں بھی اپنایا جائے گا جس طرح وہ عبادت اور اکل وشرب کے معاملہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس حکم کا تعلق جس طرح عبادت سے ہے اسی طرح جہاد سے بھی ہے۔

آج اگرچہ ہر ملک میں یہ صورت حال ہے کہ حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ کرنے میں مشقت پیش آرہی ہے، مگر عین اسی وقت ہر ملک میں غیر سیاسی میدان میں کام کرنے کے مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ مثلاً تعلیم وتربیت، معاشی تعمیر، اصلاح معاشرہ، دعوت وتبلیغ، وغیرہ۔ اس طرح کے بہت سے نہایت قیمتی کام ہیں جو غیر سیاسی میدان میں کئے جا سکتے ہیں۔ اور ان کو کرنے میں کسی مشقت کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ مسلمانوں کو تباہ کن ٹکراؤ کے راستہ پر لے جارہے ہیں اور ان کو تعمیر کے میدان میں کھلے مواقع کے استعمال کی طرف راغب نہیں کرتے وہ یقیناً شریعت سے انحراف کر رہے ہیں نہ کہ شریعت کی تعمیل۔

انجام پر غور کرنا

جاء رجل الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال : یارسول اللّٰہ اوصنی ، فقال : امستوص انت ۔ فقال نعم ۔ قال علیہ الصلوٰۃ والسلام : اذا ھممت بامر فتدبر عاقبتہ ۔ فان کان رشداً فامضہ وان کان غیا فانتہ عنہ

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول ، مجھے نصیحت کیجئے ۔ آپ نے فرمایا ، کیا تم واقعۃً نصیحت لینا چاہتے ہو اس نے کہا ۔ ہاں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو اس کے انجام پر غور کرو ۔ اگر اس میں بھلائی ہو تو اس کو کرو ۔ اور اگر اس میں برائی ہو تو اس سے رک جاؤ ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر کام کو اس کے انجام کے اعتبار سے دیکھنا چاہیے ۔ جو چیز باعتبار انجام ٹھیک ہو اس کو کرنا اور جو چیز باعتبار انجام ٹھیک نہ ہو اس کو نہ کرنا ، یہ اسلام کا طریقہ ہے اور یہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو سکھایا ہے ۔

عام طور پر لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ چیزوں کو محض ان کی ظاہری صورت (Face value) کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اور بس فوراً اس میں کود پڑتے ہیں ۔ مگر یہ سراسر غیر اسلامی طریقہ ہے ۔ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ چیزوں کو ان کی حقیقت کے اعتبار دیکھا جائے نہ کہ محض ظاہر کے اعتبار سے ۔

جب بھی کوئی معاملہ سامنے آئے تو اقدام کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لیا جائے ۔ خاص طور پر یہ غور کیا جائے کہ اگر اقدام کیا جاتا ہے تو دوسروں کا ردعمل کیا ہوگا ۔ کن طاقتوں سے مقابلہ پیش آئے گا ۔ کن مسائل سے نمٹ کر اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا ۔ اقدام کے نفسیاتی ، سماجی اور سیاسی اثرات کیا ہوں گے ۔ تمام ضروری پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد صرف اس وقت اقدام کیا جائے جب کہ یہ یقین ہو جائے کہ یہ اقدام مفید اور صحیح نتیجہ پر پہونچنے والا ہے ۔

اقدام صرف وہ ہے جو نتیجہ خیز ہو ۔ جو اقدام نتیجہ خیز نہ ہو ، وہ اقدام نہیں ، خودکشی ہے ۔ ایسے اقدام سے پرہیز کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خودکشی سے پرہیز کرنا ۔

تالیف قلب

قرآن کی سورہ نمبر ۹ میں بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ (صدقات) کے خرچ کی مدیں کیا کیا ہیں اور وہ کن لوگوں کو دی جائیں گی۔ ان مستحقین میں سے ایک قسم وہ ہے جن کو قرآن میں مؤلفۃ القلوب کہا گیا ہے (التوبۃ ۶۰)۔ یعنی وہ لوگ جن کی دلجوئی کرنا مقصود ہو۔ اس سے مراد وہ افراد ہیں جن کو اسلام کی طرف راغب کرنا ہو یا وہ اسلام قبول کرنے کے باوجود کمزور ہوں اور انہیں ایمان پر مستحکم کرنے کے لئے مالی دلجوئی کی ضرورت ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں دونوں قسم کے لوگوں کو اس مقصد کے لیے یہ عطیات دئے۔ مثلاً نومسلموں میں اقرع بن حابس کو، اور غیر مسلموں میں صفوان بن امیہ کو، وغیرہ۔

بعد کو عباسی خلافت کے زمانہ میں جب اسلامی فقہ کی تدوین ہوئی تو بیشتر علماء اس کے قائل ہو گئے کہ اسلام کے عزت اور غلبہ کے بعد اب مؤلفۃ القلوب کی مد ساقط اور منقطع ہو چکی ہے۔ مفسر القرطبی نے لکھا ہے کہ: **انقطع هذا الصنف بعز الإسلام و ظهوره** (**الجامع لأحكام القرآن**، ۸/۱۸۱)۔

تالیفِ قلب کا یہ مسئلہ کسی بھی کتاب کے متعلق ابواب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً قاضی محمد ثناء اللہ العثمانی نے یہ بتاتے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں مؤلفۃ القلوب کو ترغیب کے لیے خمس یا زکوۃ میں سے عطیات دئے، لکھتے ہیں: **و أما اليوم فقد أعز الله تعالیٰ الإسلام و له الحمد و أغناه عن أن يتألف عليه رجال فلا يعطى مشرك تالفا بحال و قد قال بهذا كثير من أهل العلم أن المؤلفة منقطعة و سهمهم ساقط** (**التفسير المظهري**، ۴/۲۳۴) یعنی جہاں تک آج کا تعلق ہے، تو اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت و طاقت دے دی ہے اور اسلام کو اس سے مستغنی کر دیا ہے کہ کسی کی تالیف قلب کی جائے۔ پس کسی بھی مشرک کو کسی بھی حال میں تالیف قلب کے لئے کچھ نہیں دیا جائے گا۔ اور اکثر اہل علم کا یہی قول ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی مد منقطع ہے اور ان کا حصہ ساقط ہو چکا ہے۔ (نیز ملاحظہ ہو، فتح القدیر للشوکانی ۲/۳۷۴)

بعد کے زمانہ کے اکثر علماء کا مسلک یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد

تالیف قلب کی یہ مد باقی نہ رہی۔ گویا کہ اب مالِ زکوۃ کی صرف سات مدیں ہیں نہ کہ قرآن کے بیان کے مطابق، آٹھ مدیں۔ ان لوگوں کے نزدیک تالیفِ قلب کی حکمت ضعف ہے۔ یعنی اسلام جب ضعیف تھا تو اپنے ضعف کی مالی تلافی کے لیے زکوۃ میں یہ مد مقرر کی گئی۔ مگر اسلام جب طاقتور ہو گیا تو اس قسم کی مالی دلجوئی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس بنا پر بعد کو یہ مد ساقط یا موقوف ہو گئی۔ فقہاء میں امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا یہ مسلک کلیتاً ہے اور دوسرے علماء کا کسی قدر گنجائش کے ساتھ۔ مثلاً یہ کہ اب نومسلم کو دیا جا سکتا ہے مگر کسی غیر مسلم کو نہیں دیا جائے گا۔ ان کے نزدیک نومسلم لوگ فقراء مسلمین کے حکم میں داخل ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تالیف قلب کا حکم نہ تو ساقط ہوا ہے اور نہ یہ حکم ضعفِ اسلام کی بنا پر تھا۔ یہ حکم مصلحتِ دعوت کی بنا پر ہے نہ کہ ضعف اسلام کی بنا پر۔

اسلامی دعوت میں اصل انحصار دلیل پر ہوتا ہے۔ داعی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دلیل کی قوت سے مدعو کو مطمئن کرے اور اُس کے اندر ذہنی تبدیلی لائے۔ مگر اس دعوتی عمل میں کچھ چیزوں کی ضرورت بطور معاون ہوتی ہے۔ مثلاً نرم گفتاری، اعلیٰ اخلاق، مدعو کے ساتھ تقریب کا معاملہ کرنا۔ چنانچہ تقریب دعوت کی اسی مصلحت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد تقریباً سولہ ماہ تک یہود کے قبلہ کو اپنا قبلہ بنائے رکھا۔ (تفسیر القرطبی، ۱۵۰/۲)

تالیفِ قلب کی انہی صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ مال یا تحفہ کے ذریعہ ان کی دلجوئی کی جائے۔ اس مقصد کے لئے دوسرے اموال کے علاوہ زکوۃ کی رقم بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ مال زکوۃ کے خرچ کی یہ مد ابدی ہے، وہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک دعوت کا عمل لوگوں کے درمیان جاری ہو، خواہ مسلمان، سیاسی اعتبار سے، طاقت کی حالت میں ہوں یا ضعف کی حالت میں۔

تالیفِ قلب (دلجوئی) کا تعلق صرف زکوۃ کے مال سے نہیں ہے۔ اس کو زکوۃ کی ۸ مدوں میں سے ایک مد قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ مدعو گروہ کی آخری حد تک رعایت کرو۔ حتیٰ کہ ان کی دلجوئی کے لئے اگر زکوۃ کے اموال سے دینا ہو تو اُس میں سے بھی انہیں دو۔

تالیفِ قلب آدابِ دعوت کا ایک عام اصول ہے۔ اس کا تعلق ہر اس پہلو سے ہے جو مدعو کے دل میں اسلام کے لئے نرم گوشہ (soft corner) پیدا کرنے والا ہو۔ قرآن وسنت میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ کا فرعون سے نرم زبان میں کلام کرنا (طٰہٰ ۴۴)، پیغمبروں کا اپنی مخاطب قوم سے یہ کہنا کہ ہم تو تمہاری ایذاؤں پر صبر ہی کریں گے (ابراہیم ۱۲)۔ مخالف لوگوں سے

موعظت حسنہ (النحل ۱۲۵)، وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی تو آپ نے بنو ہاشم کے لوگوں کو اپنے گھر پر بلایا تا کہ انہیں توحید کا پیغام دیں۔ اس موقع پر آپ نے پہلے ان کی تواضع کی اور انہیں دودھ پلایا۔ جب وہ اس سے فارغ ہو گئے تو اس کے بعد آپ نے انہیں نبوت کا پیغام دیا۔ یہ بھی مدعو کے حق میں تالیفِ قلب کی ایک صورت تھی۔ (مسند احمد، الجزء الاول، صفحہ ۱۵۹)

تالیف قلب دراصل ایک جامع حکم ہے جس کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک بدو مدینہ کی مسجد نبوی میں آیا۔ اُس نے مسجد کے اندر پیشاب کر دیا۔ لوگ اس کو مارنے کے لیے دوڑے تو آپ نے لوگوں کو منع کر دیا اور بدو کو زجر و توبیخ کے بغیر واپس کر دیا۔ یہ بھی تالیفِ قلب کی ایک صورت تھی۔

اسی طرح قبیلۂ دوس کے طفیل بن عمرو الدوسی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد وہ اپنی قوم کی طرف واپس گئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی۔ مگر قوم نے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ ان کو ستایا اور سرکشی کا معاملہ کیا۔ وہ دوبارہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور قبیلہ کی شکایت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ دوس کے حق میں دعا کی اور طفیل بن عمرو الدوسی سے کہا کہ تم اپنی قوم کی طرف واپس جاؤ، اس کو اسلام کی طرف دعوت دو اور اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو (ارجع الی قومک فادعهم وارفق بهم)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت بھی مدعو کے حق میں تالیفِ قلب کی ایک مثال ہے۔ (سیرت ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۴۰۹)

جو لوگ مؤلفۃ القلوب کے حصہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منقطع یا منسوخ مانتے ہیں ان کی اس رائے کی ایک خاص بنیاد حضرت عمر فاروق کا ایک واقعہ ہے۔ ابن ہمام کی روایت ہے کہ عیینہ اور اقرع خلیفہ ابوبکر صدیق کے پاس آئے اور ایک زمین کی مانگ کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے پہلے تالیف قلب کے طور پر کچھ مال دیا تھا۔ ان کی مانگ پر ان کے لیے حضرت ابوبکر نے ایک تحریر لکھ کر دی۔ حالانکہ یہ دونوں مدینہ کے صاحب ثروت افراد تھے۔

یہ دونوں جب باہر آئے تو ان کی ملاقات حضرت عمر فاروق سے ہوئی۔ حضرت عمر نے تحریر کو لے کر پھاڑ دیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اس کے بعد یہ معاملہ خلیفہ ابوبکر صدیقؓ کے سامنے آیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چیز تم کو تالیف قلب کے لیے دی تھی۔ اب اللہ نے اسلام کو طاقتور بنا دیا ہے اور اس کو تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کی

اس رائے سے اتفاق کیا۔ (التفسیر المظہری ۴/۲۳۶)۔

اس واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تالیفِ قلب کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تالیفِ قلب کے لیے جو مال دیا جاتا ہے وہ مؤلفۃ القلوب کے مطالبہ پر نہیں دیا جاتا بلکہ حاکم کی اپنی صوابدید پر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ دونوں اشخاص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی فیصلہ کے تحت کچھ مال دیا تھا نہ کہ ان کے مطالبہ کی بنیاد پر۔ اس کے بعد جب حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ آیا تو ان دونوں صاحبان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ کا غلط استعمال کرتے ہوئے خود اپنی طرف سے یہ مانگ کی کہ ہم کو فلاں زمین عطیہ میں دی جائے۔ یہ ایک قسم کا استحصال (exploitation) تھا۔ حضرت عمر فاروق نے معاملہ کی اس نوعیت کو سمجھا اور درمیان میں پڑ کر دونوں صاحبان کو اس سے روک دیا کہ وہ مسلمانوں کے اموال کو غلط طور پر حاصل کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ تالیف قلب اسلام کا ایک مستقل اصول ہے۔ وہ اپنی مختلف صورتوں میں ہر حال میں جاری رہتا ہے خواہ امن کے حالات ہوں یا جنگ کے حالات، اور خواہ اہل اسلام بے اقتدار ہوں یا اقتدار کی حالت میں ہوں، کسی بھی حال میں تالیفِ قلب کا حکم ساقط یا موقوف نہیں ہوتا۔

دعوت الی اللہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، خیر خواہی کا ایک عمل ہے (الاعراف ۷۹)۔ یہ دراصل انسانیت کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ ہے جو ایک مومن کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اللہ کی رحمت کے سایے میں لانے کی کوشش کرے۔ اسی خیر خواہی کی بنا پر مومن یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی بات اس طرح مؤثر انداز میں کہے کہ وہ سننے والے کے دل میں اُتر جائے (النساء ۶۳)۔ یہی جذبہ داعی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کی زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کرے تاکہ پیغام رسانی کا ماحول بگڑنے نہ پائے (ابراہیم ۱۲)، وغیرہ۔

اس قسم کی مختلف چیزیں گویا آداب دعوت سے تعلق رکھتی ہیں۔ دعوت کے انہی آداب میں سے ایک متعین چیز وہ ہے جس کو تالیفِ قلب کہا جاتا ہے، یعنی مدعو کی دل جوئی اور اس کی رعایت۔ جس طرح ایک سچا تاجر اپنے گاہک کی آخری حد تک رعایت کرتا ہے تاکہ اس کے ساتھ مستحکم تجارتی تعلقات قائم ہوں۔ اسی طرح داعی ہر ممکن طریقہ سے اپنے مدعو کی دل جوئی کرتا ہے تاکہ وہ اس کے دعوتی پیغام کی طرف پوری طرح راغب ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تالیفِ قلب دعوت وتبلیغ کا مستقل اصول ہے، کسی بھی حال میں اور کسی بھی صورت میں اس کو ساقط نہیں کیا جاسکتا۔

کام کا صحیح طریقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ کار کیا تھا، اس سوال کا جواب حضرت عائشہ کی ایک روایت میں ملتا ہے: ما خیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین أمرین إلا اختار ایسرھما۔ (صحیح البخاری، کتاب الحدود، باب اقامۃ الحدود)۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دو امر میں سے ایک امر کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کا انتخاب فرماتے تھے۔

حدیث میں اَیسر کا لفظ ہے۔ اس کی تشریح شارحینِ حدیث نے عام طور پر اَسہل کے لفظ سے کی ہے (فتح الباری ٦/ ٦٦٥) یعنی زیادہ سہل۔ مگر اَسہل (سہل تر) کے لفظ سے اُس کی اصل حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ پیغمبر اسلام اور دوسرے تمام پیغمبر، قرآن کے بیان کے مطابق، اولو العزم پیغمبر (الاحقاف ۳۵) تھے۔ کوئی پیغمبر کبھی سہل پسند نہیں ہوتا۔ سہل پسندی پیغمبر کے مزاج کے خلاف ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس حدیث میں اَیسر کا لفظ زیادہ قابل عمل کے معنٰی میں ہے، نہ کہ سادہ طور پر محض سہل کے معنٰی میں۔

حضرت عائشہ کی اس روایت کا مفہوم اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی سیرت کی روشنی میں متعین کیا جائے تو اس سے پوری حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو اس روایت میں اَیسر سے مراد قابل حصول نقشۂ کار (available framework) ہے۔ ہر صورت حال میں دو عملی طریقہ ممکن ہوتا ہے۔ ایک وہ طریقہ جو بروقت موجود نقشہ ہی میں قابلِ عمل ہو۔ اور دوسرا طریقہ وہ جس کا تقاضا یہ ہو کہ پہلے موجود نقشہ کو بدلا جائے، اُس کے بعد ہی اپنا مطلوب عمل شروع کیا جا سکتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اُس نقشۂ کار میں اپنا عمل جاری کیا جو بروقت آپ کے لیے ممکن اور قابل حصول تھا۔ اس پیغمبرانہ طریقِ کار کی ایک مثال یہ ہے کہ قدیم مکہ میں آپ کو دین توحید کی تبلیغ کا کام کرنا تھا۔ اب اس کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ کعبہ کے موجود اجتماع گاہ کو استعمال کیا جائے جہاں بتوں کی پوجا کے لیے لوگ پہلے سے اکٹھا ہوا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ آپ اس سے

الگ اپنا کوئی نیا مقام اجتماع بنائیں۔ دوسرا اور نیا اجتماع گاہ بنانا اس وقت سخت مشکل کام تھا۔ اس کے برعکس کعبہ کا صحن ایک بنے بنائے اجتماع گاہ کی صورت میں موجود تھا۔ پیغمبر اسلام نے بتوں کی موجودگی کے ناپسندیدہ پہلو کو وقتی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس موجود نقشۂ کار کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں اپنے دعوتی خطاب کا مستقل سلسلہ شروع کر دیا۔

کام کا یہی وہ عملی طریقہ ہے جس کو مذکورہ حدیث میں اختیار ایسر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں قابلِ حصول نقشۂ کار (available framework) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے اس پیغمبرانہ حکمت کو نہیں سمجھا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ وہ اُیسر اور اُعسر میں فرق نہ کر سکے۔ اُن کے لیے قابلِ حصول نقشۂ کار موجود تھا مگر اپنی بے خبری کی بنا پر وہ نا قابلِ حصول نقشۂ کار میں اپنی عملی سرگرمیاں دکھاتے رہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق، اس کا نتیجہ صرف یک طرفہ تباہی ہو سکتا تھا اور وہی اُن کے حصہ میں پیش آیا۔

برصغیر ہند میں اس کی ایک مثال انگریزوں کے خلاف علماء ہند کی پُرتشدد تحریک ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ علماء کی یہ پُرتشدد تحریک ساٹھ سالہ قربانیوں کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ اس کے برعکس مہاتما گاندھی کی انہی انگریزوں کے خلاف پُرامن تحریک صرف پچیس سال میں اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوگئی۔ اس فرق کا واحد سبب یہ تھا کہ مہاتما گاندھی کی پُرامن جدوجہد قابلِ حصول نقشۂ کار کے دائرہ میں تھی، جب کہ علماء ہند کی پُرتشدد جدوجہد ناقابلِ حصول نقشۂ کار کے دائرہ میں۔

اس معاملہ کی دوسری مثال الإخوان المسلمون کی تحریک ہے۔ انہوں نے مصر میں شاہ فاروق (وفات ۱۹۶۵) اور صدر جمال عبدالناصر (وفات ۱۹۷۰) کو مغرب نواز اور اسلام دشمن قرار دے کر اُن کے خلاف پُرتشدد تحریک چلائی۔ مگر غیر معمولی قربانیوں کے باوجود اخوانیوں کے حصہ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ البتہ مصر ایک تباہ شدہ ملک ہو کر رہ گیا۔ مزید یہ کہ اسی اخوانی فکر کے لوگ اپنے ملک میں سیاسی دار و گیر سے بھاگ کر بڑی تعداد میں امریکہ گئے۔ اب وہ وہاں مختلف قسم کے اسلامی ادارے

بڑے پیمانہ پر چلا رہے ہیں۔ اور پُر فخر طور پر وہاں اپنے کارنامے بیان کرتے ہیں۔

الاِخوان المسلمون مصر میں کیوں ناکام رہے اور امریکہ میں خود اپنے دعویٰ کے مطابق، وہ کیوں کامیاب ہیں۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ انہوں نے مصر میں پُر تشدد نقشۂ کار کے مطابق کام کرنا چاہا جو وہاں اُن کے لیے قابل حصول ہی نہ تھا۔ اس کے برعکس امریکہ میں وہ پرامن طریقِ کار کے مطابق کام کر رہے ہیں جو وہاں کے حالات میں اُن کے لیے پوری طرح قابلِ حصول ہے۔

تاہم الاِخوان المسلمون کو نہ مصر میں اُن کے کام پر کوئی کریڈٹ دیا جا سکتا ہے اور نہ امریکہ میں اُن کے کام پر۔ مصر میں اُن کا کام صرف سیاسی نادانی کے خانہ میں لکھا جائے گا۔ اور امریکہ میں وہ اپنے کام پر دوہرا معیار (ڈبل اسٹینڈرڈ) اختیار کرنے والے قرار پائیں گے، اِلّا یہ کہ وہ کھلےلفظوں میں یہ اعلان کریں کہ مصر میں اُن کی پالیسی سراسر غلطی اور نادانی کی پالیسی تھی۔ اعتراف کے بعد غلطی ایک نیکی بن جاتی ہے اور اعتراف کے بغیر غلطی صرف غلطی رہتی ہے۔

جماعت اسلامی کا معاملہ بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ جماعت اسلامی اور اُس کے بانی نے پاکستان میں زبردست سیاسی ہنگامہ برپا کیا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ پاکستان میں وہاں کے سیکولر حکمرانوں نے سیکولر نظام قائم کر رکھا ہے۔ جب تک اس سیکولر نظام کو توڑا نہ جائے یہاں کوئی قابلِ ذکر اسلامی کام کرنا ممکن نہیں۔ جماعت اسلامی اور اُس کے بانی کی ٹکراؤ کی اس سیاست کا کوئی مثبت نتیجہ پاکستان کو نہیں ملا۔ بلکہ برعکس طور پر پاکستان ایک تباہ شدہ ملک بن کر رہ گیا۔

اب اسی جماعت اسلامی کی فکر کو ماننے والے لوگ نہایت اطمینان کے ساتھ انڈیا کے سیکولر نظام کے تحت کام کر رہے ہیں۔ وہ پُر فخر طور پر یہاں اپنے اسلامی کارنامے بیان کرتے ہیں۔ مگر جماعت اسلامی کا معاملہ بھی وہی ہے جو الاِخوان المسلمون کا معاملہ ہے۔ جماعت اسلامی کے لوگوں نے پاکستان میں جو کچھ کیا اُس پر اُنہیں صرف سیاسی نادانی کا کریڈٹ دیا جائے گا۔ اسی طرح انڈیا کی جماعت اسلامی کے لوگ انڈیا میں اپنے اعلان کے مطابق، جو کارنامے انجام دے رہے ہیں اُس پر بھی وہ کوئی کریڈٹ نہیں پا سکتے۔ اِلّا یہ کہ وہ کھلے طور پر یہ اعلان کریں کہ اُن کے بانی کا نظریہ سیکولرزم یا

سیکولر نظام کے بارے میں سراسر غلط تھا اور زمانہ سے بے خبری پر مبنی تھا۔ اس کھلے اعلان کے بغیر یقینی طور پر وہ کسی مثبت انعام کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ غلطی کے اعلان کے بغیر انڈیا میں اُن کی پالیسی دوہرا معیار (ڈبل اسٹینڈرڈ) کی پالیسی قرار پائے گی۔ اور غلطی کے اعتراف کے بعد اُن کی یہ پالیسی موجبِ ثواب توبہ کی حیثیت اختیار کر لے گی۔

قابلِ حصول نقشۂ کار (available framework) کی جو بات یہاں لکھی گئی، وہ فرد اور جماعت دونوں کے لیے یکساں طور پر نہایت اہم ہے۔ حدیث کی زبان میں وہ اختیار اَیسر کی پالیسی ہے، اور فطرت کی زبان میں وہ حقیقت پسندی کی پالیسی۔ یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔ اس طریقہ کو اختیار کیے بغیر اس دنیا میں نہ کوئی فرد کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل کر سکتا ہے اور نہ کوئی جماعت۔ یہ ایک ایسا اٹل قانون ہے جس میں کسی کے لیے بھی کوئی استثناء نہیں۔

مستقبل پر نظر

ایک غزوہ میں ایسا ہوا کہ مسلمانوں نے نہ صرف دشمن فوج کے مَردوں کو قتل کیا بلکہ ان کے کچھ بچوں کو بھی مار ڈالا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ سخت ناراض ہوئے۔ آپ نے فرمایا: لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ آج وہ حد سے گزر گیے اور بچوں کو قتل کر ڈالا۔ یہ سن کر ایک شخص نے کہا کہ یہ مقتول بچے کیا مشرکین کے بچے نہ تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے بہترین لوگ مشرکین کی اولاد ہی تو ہیں (انما خیارکم ابناء المشرکین، احمد، نسائی)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کی نظر ہمیشہ مستقبل پر ہوتی ہے۔ وہ حال سے اوپر اٹھ کر آگے کی طرف دیکھتا ہے۔ حتی کہ حال کی ناموافق باتوں پر اس امید میں صبر کرتا ہے کہ آئندہ نئے امکانات پیدا ہوں گے اور آج کا ناموافق کل کے موافق میں تبدیل ہو جائے گا۔

دنیا کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں امکانات کی کوئی حد نہیں۔ آج جو شخص انکار کر رہا ہے کل وہ اقرار کرنے والا بن سکتا ہے۔ آج جو شخص بظاہر دشمن بنا ہوا ہے اس میں آئندہ ایسی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کرے اور آپ کا دوست اور ساتھی بن جائے۔ حتی کہ باپ کا رویہ اگر مایوس کن ہو تو مومن اس کے بیٹے سے امید قائم کر لیتا ہے کہ شاید وہ بڑا ہو کر حق کا اعتراف کرنے والا بن جائے۔

یہ دنیا موافق امکانات سے بھری ہوئی ہے۔ مگر موافق امکانات کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کے لیے بلند حوصلگی اور عالی ظرفی درکار ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی دشمن اور دوست کی اصطلاحوں سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ وہ نفرت اور محبت کے جذبات سے بلند ہو کر رائے قائم کرے۔ اس بلند ہمتی کے بغیر ان امکانات کو استعمال کرنا ہرگز ممکن نہیں۔

ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے، اور دوسرا اس کا باطن۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چیز اپنے ظاہر کے اعتبار سے کچھ ہوتی ہے اور باطن کے اعتبار سے کچھ اور۔

عام انسان چیزوں کو صرف ان کے ظاہر کی حد تک دیکھتے ہیں۔ مومن وہ ہے جو چیزوں کو ان کے اندرونی امکانات کے اعتبار سے دیکھنے لگے۔

غلط فہمی

بعض اخبارات ہر روز کوئی خاص قول نقل کرتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک ٹائمس آف انڈیا بھی ہے جو روزانہ اپنے اڈیٹوریل کے اوپر کوئی نہ کوئی قول درج کرتا ہے۔ اخبار مذکور کی اشاعت ۱۶ جولائی ۱۹۸۸ کو میں نے کھولا تو اس میں حسب ذیل فقرہ چھپا ہوا تھا:

Beware of novel affairs, for surely
all innovation is error (Muhammad)

یہ ایک حدیث رسول کا انگریزی ترجمہ ہے۔ مگر اپنی موجودہ شکل میں وہ ناقص ہے اور سخت غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس انگریزی فقرہ کا اردو ترجمہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا: نئی باتوں سے بچو، کیوں کہ ہر جدّت یقیناً غلطی ہے۔ کوئی شخص صرف اس ترجمہ کو پڑھے تو وہ سمجھے گا کہ پیغمبر اسلام نئی چیز یا نئی ایجاد کے مخالف تھے۔ حالاں کہ مذکورہ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔

یہ ایک لمبی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جو احمد، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ امورِ دین میں تم لوگ میری سنت پر اور خلفاء راشدین کی سنت پر قائم رہنا، اس سے کسی حال میں نہ ہٹنا۔ یہ نصیحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الاُمُورِ فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَکُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ

اور تم نئی بات نکالنے سے بچو، کیوں کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا کا فقرہ اسی حدیث کا انگریزی ترجمہ ہے۔ مگر اس حدیث میں جس بدعت سے روکا گیا ہے وہ دین میں نئی بات نکالنا ہے نہ کہ عام ضرورت کی چیزوں میں نئی بات نکالنا۔ مثلاً کوئی شخص اذان کے بدلے نقارہ بجائے تو یہ بدعت ہے۔ لیکن اذان کی آواز کو تیز کرنے کے لیے لاؤڈ اسپیکر استعمال کیا جائے تو وہ بدعت نہیں۔ حج کو قمری مہینہ کے بجائے شمسی مہینہ میں ادا کیا جائے تو یہ بدعت ہے۔ لیکن اگر حج کے سفر کے لیے اونٹ کے بجائے ہوائی جہاز استعمال کیا جائے تو یہ بدعت نہیں۔

قصوروار کون

ایک شخص نے سانڈ کو چھیڑا۔ اس کے بعد سانڈ نے اس کو اپنی سینگ سے مارا۔ ایسی حالت میں صرف یہ نہیں کہا جائے گا کہ سانڈ نے آدمی کو مارا۔ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ سانڈ نے آدمی کو مارا اور آدمی نے اپنے آپ کو سانڈ سے مروایا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے:

الترمذی، ابن ماجہ اور البیہقی نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا ینبغی للمؤمن أن یذل نفسه، قالوا و کیف یذل نفسه، قال: یتعرض من البلاء لما لا یطیق** (مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۱۷۷) یعنی کسی مومن کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ لوگوں نے کہا کہ کوئی شخص کیسے اپنے آپ کو ذلیل کرے گا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ایک ایسی مصیبت مول لے جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو۔

یہ حدیث افراد کے لئے بھی ہے اور قوموں کے لئے بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی فرد یا قوم کسی بڑی طاقت کو چھیڑے یا اس کو غصہ دلائے اور اس کے بعد یہ طاقت اس کو کچل ڈالے تو اس فرد یا قوم کے لئے یہ مظلومیت کا معاملہ نہیں ہوگا بلکہ وہ حماقت کا معاملہ ہوگا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی خود سے ایک مصیبت میں پڑتا ہے اور پھر وہ کسی دوسرے کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ مگر ایسا کرنا درست نہیں۔ جو مصیبت اپنی نادانی کی بنا پر پیش آئے اس کے لئے آپ دوسرے کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ جس تباہی کا سبب خود اپنا غلط اقدام ہو، اس کا قصوروار دوسرے کو ٹھہرانا ایک ایسی کوشش ہے جو شریعت کے نزدیک بھی قابل رد ہے اور عقل کے نزدیک بھی قابل رد۔

فطرت کا یہی وہ اصول ہے جس کو ایک عوامی مثل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے ——— آ بیل مجھے مار۔ موجودہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں بیل بھی ہے اور انسان بھی۔ ہم تخلیق کے اس نقشہ کو بدل نہیں سکتے۔ ہمارے لئے ممکن صورت صرف یہ ہے کہ ہم پھول کی طرح کانٹے کے ساتھ زندگی گزارنے کا ہنر سیکھ لیں۔

اسلامی انقلاب میں عمومی تائید

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ کا ایک واقعہ حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ ایک غزوہ (جنگ) میں ایک شخص نے حصہ لیا اور زبردست جنگی کارنامہ انجام دے کر جنگ کو جیتنے میں مدد دی۔ لیکن جنگ کے آخر میں پیغمبر اسلام ﷺ نے اعلان فرمایا کہ یہ شخص اہل جنت میں سے نہیں ہے بلکہ اہل نار میں سے ہے۔

جن لوگوں نے اس جنگ میں اس کے بہادرانہ کارنامے دیکھے تھے، انہیں آپ کے اس ارشاد پر تعجب ہوا۔ مگر جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس آدمی نے بہادرانہ قتال تو ضرور کیا تھا مگر آخر میں اس نے خود اپنی تلوار سے اپنے کو ہلاک کرلیا۔ گویا کہ اس کا معاملہ خودکشی کا معاملہ تھا، نہ کہ شہادت کا معاملہ۔

اس واقعہ کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے حضرت بلال سے فرمایا کہ اے بلال، اٹھو اور یہ اعلان کردو کہ جنت میں صرف وہی شخص جائے گا جو مؤمن ہو اور اللہ بے شک اس دین کی مدد فاجر آدمی سے بھی کرے گا (**لایدخل الجنة الا مومن، وان اللہ لیوید ھذاالدین بالرجل الفاجر**) فتح الباری ۱۱/۷۰۵۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے اس ارشاد سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام نے انسانی زندگی میں جو ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا چاہا تھا، اس کا آغاز اگرچہ مخلص اہل ایمان کریں گے مگر اس کی آخری تکمیل نسل در نسل کے تاریخی عمل کے ذریعہ ہوگی۔ اس تاریخی عمل میں نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی مؤثر طور پر اپنا کردار ادا کریں گے۔ پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد آپ کے بعد کی تاریخ میں مسلسل واقعہ بنتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آئندہ آفاق و انفس میں ایسی حقیقتیں ظاہر ہوں گی جو اسلام کی صداقت کو خالص علمی سطح پر ثابت شدہ بنا دیں (حٰم السجدہ ۵۳)

موجودہ زمانہ میں سائنسی تحقیق کے بعد جو دریافتیں ہوئی ہیں، انہوں نے اس پیشین گوئی کو حرف بحرف ایک ثابت شدہ حقیقت بنا دیا ہے۔ یہ جدید دریافتیں غیر مسلم قوموں کے ذریعہ ظہور میں

آئی ہیں۔ مسلم افراد کا حصہ ان میں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔

مذکورہ واقعہ ایک اعتبار سے ایک انسان کا واقعہ ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ ایک اصول کو بتاتا ہے۔ وہ اصول یہ کہ جہاں تک آخرت کے انعام یا جنّت میں داخلہ کا تعلق ہے، وہ صرف مخلص اہل ایمان کے حصہ میں آئے گا۔ گہرے اخلاص اور سچے ایمان کے بغیر کسی شخص کو آخرت کی ابدی جنّت ملنے والی نہیں ہے۔

لیکن جہاں تک دنیوی اعتبار سے اسلام کی تاریخ کا تعلق ہے، اس معاملہ میں ایسے افراد کا بھی حصہ ہوگا جو اخلاص اور ایمان کی شرط پر پورے نہ اترتے ہوں۔ دنیوی اعتبار سے اسلام کا جو تاریخی قلعہ بننے والا ہے، اس کی تعمیر میں بے شمار لوگ براہ راست یا بالواسطہ طور پر حصّہ لیں گے۔ ایسے لوگوں کو خدا دنیا کی کچھ چیزیں بطور معاوضہ دے سکتا ہے، مگر آخرت کا خصوصی انعام ایسے لوگوں کے لیے مقدّر نہیں۔

دعوت

دعوتی ذمہ داری

پیغمبر اسلام ﷺ کی حیثیت داعی کی تھی، آپ کی تبعیت میں آپ کی امت کی حیثیت بھی داعی کی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے رسول، کہو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، سمجھ بوجھ کر، میں بھی اور وہ لوگ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے (**قل ھٰذہ سبیلی ادعوا الی اللّٰہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی**) یوسف ۱۰۸

رسول اللہ ﷺ پیغمبر ہونے کے ساتھ پیغمبر آخر الزماں بھی تھے۔ آپ آخری پیغمبر تھے۔ اس اعتبار سے آپ کی دعوتی ذمہ داری قیامت تک وسیع تھی۔ آپ کو قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کو توحید کی حقیقت سے باخبر کرنا تھا۔ مگر ایک عمر کو پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی۔ اس لئے سوال ہے کہ اب یہ ذمہ داری کس کے اوپر ہے۔ اب یہ ذمہ داری امت محمدی پر ہے۔ امت محمدی کو آپ کی نیابت میں قیامت تک یہ فریضہ ادا کرنا ہے۔ حدیث میں ہے: **مالی اُمسِكُ بِحُجَزِکم عن النار، الا وَاِنَّ ربِّی داعِیَ وانہ سائلی ھل بلغت عبادی. فاقول رب قد بلغت. ألا فلیبلغ شاھدکم غائبکم (حیاۃ الصحابہ ۱/۷۷)**

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں تم لوگوں کی کمر پکڑ کر تم کو آگ سے بچاؤں۔ سن لو کہ میرا رب مجھے بلائے گا اور بے شک وہ مجھ سے سوال کرے گا۔ کیا تم نے میرے بندوں تک میرا پیغام پہنچا دیا۔ میں کہوں گا کہ ہاں میرے رب، میں نے پہنچا دیا۔ سن لو، تمہارا حاضر تمہارے غائب تک پہنچا دے۔

اس حدیث کے مطابق، رسول اللہ ﷺ گویا اپنی امت کے ایک ایک فرد کو ہدایت دے رہے ہیں کہ میرے بعد تم قیامت تک میرے دعوتی مشن کو جاری رکھو، دوسرے لفظوں میں یہ کہ مجھے یہ موقع دو کہ میں اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ کہہ سکوں کہ میں نے قیامت تک کے تمام لوگوں پر اپنی دعوتی ذمہ داری پوری کردی، اپنی حیات میں براہِ راست طور پر، اور اپنی حیات کے بعد بالواسطہ طور پر۔

علمی جہاد

رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حدیث کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، آپ نے فرمایا کہ میری امت میں برابر ایک گروہ موجود رہے گا جو حق کے لئے قتال کرے گا۔ اس حدیث میں بظاہر قتال کا لفظ ہے۔ مگر امام بخاری (۲۵۶۔ ۱۹۴ھ) نے اس کو جنگ کے معنیٰ میں نہیں لیا ہے بلکہ علمی جہاد کے معنٰی میں لیا ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے جس باب کے تحت نقل کیا ہے اس کا عنوان (ترجمۂ باب) انہوں نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے:

بابُ قولِ النبی صلی الله علیه وسلم لاتزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق یقاتلون و هم اهل العلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے بیان میں کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہتے ہوئے قتال کرے گا، اور اس سے مراد علم والے ہیں۔ (کتاب الاعتصام)۔ امام بخاری کے اس ترجمۂ باب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حدیث میں ''قتال'' کو اس کے لفظی معنیٰ میں نہیں لے رہے ہیں۔ بلکہ حقیقی معنیٰ میں لے رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ اس سے مراد علمی مجاہدین ہیں، یعنی وہ لوگ جو علم کی راہ سے اللہ کے دین کی خدمت کریں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مستقل اور مسلسل جاری رہنے والی چیز علمی جہاد ہی ہے۔ قتال مسلسل جاری رہنے والی چیز نہیں۔ چنانچہ ابوبکر الجصاص رازی حنفی (م ۳۷۰ھ) نے لکھا ہے کہ علمی جہاد اصل ہے اور جسمانی یا عسکری جہاد صرف ایک شاخ ہے (**فجهاد العلم اصل و جهاد النفس فرع**، احکام القرآن، جلد ۳، صفحہ ۱۱۹)

علمی جہاد کی سب سے بڑی شکل یہ ہے کہ دلائل کے ذریعہ اسلام کی حجت لوگوں کے اوپر قائم کی جائے۔ اس کے خلاف علمی اعتراضات کو اعلیٰ علمی سطح پر رد کیا جائے۔ اسلام کو ایک فکری اور نظریاتی قوت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے لایا جائے۔

اجنبی دین

امام مسلم بن الحجاج نے اپنی "صحیح" میں کتاب الایمان کے تحت ایک باب ان الفاظ میں قائم کیا ہے: بابُ بیانِ ان الاسلام بدأ غریبًا وسیعود غریبًا وانّہ یأرِزُ بین المسجدَین۔ اس باب کے ذیل میں انھوں نے تین روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے:

عن ابی ھُریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدأ الاسلامُ غریبًا وسیعودُ کما بدأ غریبًا فطوبیٰ للغُرباءِ۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام اجنبی کی حیثیت سے شروع ہوا اور پھر اسی اجنبی حالت کی طرف لوٹ جائے گا جیسا کہ شروع ہوا تھا۔ پس خیرو سعادت ہے اجنبیوں کے لیے۔

اسلام ساتویں صدی کے عرب میں بنو اسماعیل کے درمیان آیا۔ بنو اسماعیل اصلاً ملتِ ابراہیمی سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان کے اور حضرت ابراہیم کے درمیان ڈھائی ہزار سال کا فاصلہ تھا۔ لمبی مدت کے نتیجہ میں ان کے اندر دینی بگاڑ آچکا تھا، وہ دینِ ابراہیم کے نام سے صرف دینِ آباء کو جانتے تھے۔ اس بنا پر ابتداءً ان کے لیے پیغمبر اسلام کے پیغام کو سمجھنا مشکل بنا رہا۔

حدیث کے مطابق، خود ملتِ مسلمہ کی یہی حالت اس وقت ہو جائے گی جب کہ وہ زوال کا شکار ہو جائے۔ جب کہ وہ اسلام کی اسپرٹ کو کھو دے اور ایک خود ساختہ اسلام اس کے درمیان باقی رہے۔

امت پر جب یہ وقت آتا ہے تو وہ دین کے نام سے صرف دینِ اکابر کو جانتی ہے اور دینِ خدا اس کے لیے اجنبی چیز ہو جاتا ہے۔ قومی خواہشوں سے مطابقت کرنے والا دین اس کو دین نظر آتا ہے اور اصولوں پر مبنی دین اس کے لیے ناقابلِ فہم چیز بن جاتا ہے۔ ظواہرِ دین کی دھوم مچانے کو ایسے لوگ کام سمجھتے ہیں اور حقیقتِ دین کی بات انھیں اپنے لیے نامانوس دکھائی دیتی ہے۔ ایسے ماحول میں جو لوگ قرنِ اوّل والا دین اختیار کریں وہ دوبارہ لوگوں کو اجنبی دکھائی دینے لگتے ہیں۔

دین کی نصرت کرنے والے

عن ابی الولید عبادة بن الصامت رضی الله عنه قال : بایعنا رسول الله صلی الله علیه وسلم على السمع والطاعة فی العسر والیسر والمنشط والمکره وعلى اثرة علینا وعلى ان لا ننازع الامر اهله الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من الله فیه برهان وعلى ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی الله لومة لائم ۔ (متفق علیه)

حضرت عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اس پر کہ ہم سنیں گے اور مانیں گے تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی ۔ پسند میں بھی اور ناپسند میں بھی۔ اور اس پر کہ ہمارے اوپر (دوسروں کو) ترجیح دی جائے ۔ اور اس پر کہ ہم صاحب حکم سے حکم میں نزاع نہ کریں گے الا یہ کہ تم کھلم کھلا کفر دیکھو جس کے لیے تمہارے پاس خدا کی طرف سے برہان ہو ۔ اور یہ کہ ہم حق کے ساتھ بولیں گے خواہ ہم جہاں ہوں ۔ ہم اللہ کے معاملہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے ۔

"بیعت" کے لفظی معنی بیچنے کے ہیں ۔ اس سے مراد وہ عہد ہے جو ایک فرد اجتماعی ذمہ دار کے ساتھ اجتماعیت پر قائم رہنے کے لیے کرتا ہے ۔ عہدِ اجتماعیت کو بیعت سے تعبیر کرنا اس کی شدت کو بتا رہا ہے ۔ گویا بیعت سے وابستہ ہونے کے بعد فرد اپنی ذات کو اجتماعیت کے ہاتھ بیچ دیتا ہے ۔ اس کے بعد اس کی ذات اپنی نہیں رہتی بلکہ اجتماعی ادارہ کی ہو جاتی ہے ۔

مذکورہ بیعت مدینہ کے مسلمانوں سے لی گئی جن کو انصار کہا جاتا ہے ۔ یعنی خدا کے دین کی مدد کرنے والے ۔ اس وقت اسلام کا قافلہ بالکل لٹی ہوئی حالت میں تھا ۔ ایسے نازک وقت میں مدینہ کے اہلِ ایمان نے اس کی غیر مشروط مدد کرنے کا عہد کیا اور پھر ساری زندگی اس پر قائم رہے ۔ انھوں نے نصرتِ دین کو اس کے آخری تقاضوں کی حد تک انجام دیا اسی لیے وہ خصوصی طور پر "انصار" کہے گئے ۔

مدینہ کے مسلمانوں سے جن الفاظ میں نصرت دین کی بیعت لی گئی اس پر غور کیجیے ۔ اس میں تمام وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے لوگ "بیعت" توڑ دیتے ہیں ، جن کو عذر بنا کر وہ اجتماعیت سے الگ ہو جاتے ہیں

ایسی چیز(۱) پر سمع وطاعت کی پابندی کا اقرار کرانے کا مطلب یہ ہوا کہ ــــــــــ ساتھ نہ دینے والے حالات میں بھی ساتھ دو۔ وہ مواقع جن کے پیش آنے پر عام آدمی بدک جاتا ہے ان کے پیش آنے کے بعد بھی دینی قافلہ سے جڑے رہو۔ جن شکایتوں کو عذر بنا کر لوگ الگ ہو جاتے ہیں ان شکایتوں کے باوجود اتحاد و تعاون کو نہ چھوڑو۔

وہ لوگ جن کا حال یہ ہو کہ آسانی میں ساتھ دیں اور مشکل کے وقت ساتھ نہ دیں۔ وہ اس وقت تک ٹھیک رہیں جب تک معاملہ ان کی پسند کے مطابق ہو اور جب معاملہ ان کی پسند کے خلاف ہو تو بگڑ کر الگ ہو جائیں۔ جو ہمیشہ اپنے آپ کو اگلی نشست پر دیکھنا چاہیں اور پچھلی نشست پر بیٹھنا انھیں گوارا نہ ہو۔ جو عہدوں کی ایسی تقسیم کو قبول نہ کریں جس میں خود ان کی ذات کو اعلیٰ عہدہ نہ دیا گیا ہو۔ ایسے لوگ کبھی دین کی نصرت کی توفیق نہیں پاتے۔ ایسے لوگ صرف اپنی تاریخ بناتے ہیں۔ دین کی تاریخ بنانا ان کے لیے مقدر نہیں۔

ایسا ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے خیال کے مطابق ناانصافی محسوس کرے۔ وہ ایک چیز کو دیکھے اور بطور خود یہ سمجھے کہ یہ حق کے خلاف ہو رہا ہے۔ ایسے مواقع پر وہ اظہار خیال کر سکتا ہے۔ وہ سنجیدہ انداز میں ناانصافی کو بیان کر سکتا ہے۔ مگر ناانصافی کے نام پر اجتماعیت سے کٹنا کسی کے لیے جائز نہیں۔ فرد کو صرف "قول" کا حق ہے، اس سے آگے اسے کوئی حق حاصل نہیں۔

بیعت میں مزید یہ کہلایا گیا ہے کہ قافلۂ اسلام کے امیر کی اطاعت سے تم صرف اس وقت نکل سکتے ہو جب کہ تم اس کے اندر علانیہ کفر کا مشاہدہ کرو۔ اب اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ایسے کفر کا واقعہ شاذ ہی کبھی پیش آتا ہے تو الشاذ کالمعدوم کے اصول پر اس کا مطلب عملاً یہ قرار پاتا ہے کہ تم کبھی بھی امیر کی اطاعت سے نہ نکلو۔ تم کسی حال میں بھی اس کی نافرمانی نہ کرو۔

اجتماعی زندگی فرد کی موت پر قائم ہوتی ہے۔ بہت سے افراد جب یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ اجتماعیت کی خاطر اپنی رائے کو قربان کریں گے۔ وہ اپنے آپ کو حذف کر کے اجتماعیت کا ساتھ دیں گے، اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی حقیقی اجتماعیت وجود میں آسکے۔

ایسے ہی لوگ اسلام کو زندہ کرتے ہیں۔ جن کے اندر یہ صفات نہ ہوں وہ صرف اسلام کو برباد کریں گے، وہ اس کے زندہ کرنے والے نہیں بن سکتے۔

بے فائدہ علم

قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم : انا من غیر الدجال اخوف علیکم من الدجال. فقیل وما ھو یا رسول اللّٰہ ۔ فقال علماء السوء (رواہ احمد من حدیث ابی ذر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ میں تمہارے بارہ میں دجال سے بھی زیادہ دوسروں سے ڈرتا ہوں۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول یہ دوسرے لوگ کون ہیں ۔ فرمایا کہ برے علماء ۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم : من ازداد علماً ولم یزدد ھدیً لم یزدد من اللّٰہ الا بُعداً (رواہ ابو منصور الدیلمی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جو شخص علم میں بڑھ جائے مگر وہ ہدایت میں نہ بڑھے وہ اللہ سے صرف دوری میں بڑھے گا ۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم : اشد الناس عذاباً یوم القیامۃ عالم لم ینفعہ اللّٰہ بعلمہ (رواہ ابو داؤد الطیالسی وسعید من منصور وابن عدی فی الکامل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب اس عالم کا ہوگا جس کو اللہ نے اس کے علم سے فائدہ نہیں پہونچایا ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : مررت لیلۃ اُسری بی باقوام تقرض شفاھھم بمقارض من نار۔ فقلت من انتم۔ قالوا کنا نامر بالخیر ولا ناتیہ وننھی عن الشر وناتیہ (رواہ ابن حبان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : معراج کی رات میرا گزر ایسے لوگوں سے ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچی سے کاٹے جا رہے تھے ۔ میں نے کہا کہ تم کون لوگ ہو ۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھلائی کی تلقین کرتے تھے مگر خود بھلائی پر عمل نہیں کرتے تھے اور ہم برائی سے روکتے تھے مگر ہم خود برائی سے نہیں رکتے تھے ۔

وکان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: اللّٰھم انی اعوذ بک من علم لا ینفع وقلب لا یخشع وعمل لا یرفع ودعاء لا یسمع (رواہ الحاکم من حدیث ابن مسعود)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے : اے اللہ، میں تجھ سے ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جو ڈرتا نہ ہو اور ایسے عمل سے جو تیری طرف اٹھایا نہ جائے اور ایسی دعا سے جو سنی نہ جائے ۔

کراہتِ حق

قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر کہا گیا ہے کہ ہم نے لوگوں کے پاس حق بھیجا۔ مگر اکثر لوگ حق سے بیزار رہے (المومنون ۷۰، الزخرف ۷۸) قتادہ کہتے ہیں کہ ہم سے بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی۔ آپ نے اس سے کہا کہ اسلام قبول کر۔ آدمی نے کہا کہ آپ مجھ کو ایک ایسی چیز کی طرف بلاتے ہیں جو مجھے پسند نہیں۔ آپ نے فرمایا اگر تمہیں پسند نہ ہو تب بھی (قال قتادة : ذکر لنا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لقی رجلاً فقال : اسلم۔ فقال الرجل انک لتدعونی الی امرٍ انا لہ کارہ۔ فقال نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : وان کنتَ کارھاً)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے لیے عمل کے دو راستے ہیں۔ ایک، اتباع حق۔ اور دوسرے، اتباع اہواء (المومنون ۷۱) حق پر چلنے کے لیے آدمی کو سوچ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ اہواء (خواہشات) کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر سے اپنے آپ اٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معاملہ میں آدمی ابتدائی طور پر خواہشات کے راستہ پر چل پڑتا ہے۔ اور حق پر چلنے کے لیے خواہشات کو دبانا اور نفس کے تقاضوں پر صبر کرنا ضروری ہے۔

ایسی حالت میں اگر کوئی ایسی تحریک اٹھے جو لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہو تو اس کا ساتھ دینے کے لیے لوگوں کو کسی محنت یا قربانی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیوں کہ یہ تو وہی راستہ ہوتا ہے جس پر لوگ عملاً پہلے ہی سے قائم ہوتے ہیں۔ ایسی تحریک کے ساتھ چلنے کے لیے لوگوں کو اپنا راستہ بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی تحریکوں کے گرد بہت جلد لوگوں کی بھیڑ اکھٹا ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس جب حق کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو وہ گویا راستہ بدلنے کی دعوت ہوتی ہے۔ اس کو ماننا یہ تقاضا کرتا ہے کہ آدمی اپنی سوچ کو بدلے۔ اپنے جذبات پر روک لگا کر اس کو ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف موڑ دے۔ مزید یہ کہ حق کی دعوت کو ماننا لوگوں کے لیے عزت اور ساکھ کا سوال بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ حالتِ موجودہ میں حق کو ماننا دوسرے لفظوں میں یہ کہنے کے ہم معنی ہوتا ہے کہ " میں غلطی پر تھا "

یہی وجہ ہے کہ جب بھی بے آمیز حق کی دعوت اٹھتی ہے تو اکثر لوگ اس کو ماننے میں کراہت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے

دینی تعلیم کا مقصد

حدیث میں آیا ہے کہ علم کو حاصل کرنا فرض ہے (ان طلب العلم فریضۃ) علم کی اسی اہمیت کی بنا پر اہل اسلام نے ہر دور میں دینی تعلیم کے ادارے قائم کیے۔ ان تعلیمی اداروں کی نوعیت کیا ہے، اس کو بتانے کے لیے قرآن کی حسب ذیل آیت بلاشبہہ ایک رہنما آیت ہے :

وما کان المومنون لینفروا کافۃ، فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقہوا فی الدین ولینذروا قومہم اذا رجعوا الیہم لعلہم یحذرون۔ (التوبہ ۱۲۲)

اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں، تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ پرہیز کرنے والے بنتے۔

القرطبی نے لکھا ہے کہ طلب علم کے وجوب کے لیے یہ آیت اصل کی حیثیت رکھتی ہے (ھذہ الآیۃ اصل فی وجوب طلب العلم) اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم دین سے مراد حقیقۃً تفقہ فی الدین ہے۔ تعلیم دین کو جانچنے کا قرآنی معیار صرف ایک ہے۔ اور وہ خود قرآن کے لفظ میں، تفقہ ہے۔

القرطبی نے لیتفقہوا کی تشریح یتبصّروا کے لفظ سے کی ہے۔ یعنی تفقہ کا مطلب ہے بصیرت حاصل کرنا۔ الراغب الاصفہانی نے لکھا ہے کہ فقہ کا مطلب علم شاہد سے علم غائب تک پہنچنا ہے، اس طرح فقہ زیادہ خاص ہے علم سے (الفقہ ھو التوصل الی علم غائب بعلم شاھد فھو اخص من العلم) فقہ حاصل کیا کا مطلب ہوتا ہے فہم حاصل کیا (فَقِھَہ ای فہمہ) لسان العرب میں ہے کہ فقہ اصل میں فہم کو کہتے ہیں (الفقہ فی الاصل الفہم)

اس سے معلوم ہوا کہ دینی مدارس کا اصل نشانہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ یہ ہونا چاہیے کہ جو لوگ یہاں تعلیم و تربیت حاصل کر کے نکلیں وہ تفقہ فی الدین کی صلاحیت کے حامل ہوں۔ تفقہ سے مراد جزئیات دین کی مہارت نہیں ہے، بلکہ تفقہ سے مراد اساسات دین میں فہم و بصیرت ہے۔ خاص طور پر یہ صلاحیت کہ آدمی ظاہری معلومات کے ذریعہ باطنی حقائق تک پہنچنے کے قابل ہو جائے۔

اسلوب عصر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے جو رسول بھی بھیجا اس کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان سے بیان کر دے (وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لہم ، ابراہیم ۴)

پیغمبر، اور پیغمبر کے بعد اس کی تبعیت میں داعی ، لسانِ قوم میں کلام کرتا ہے۔ اس اندازِ کلام کی اہمیت دعوت کے اعتبار سے بھی ہے اور تربیت کے اعتبار سے بھی۔ جو لوگ دین کے دائرہ سے باہر ہیں، ان کے لیے لسانِ عصر میں کلام کرنے کی ضرورت اس لیے ہے تاکہ وہ اس کو پوری طرح سمجھیں اور ان کے اوپر خدا کے دین کی حجت تمام ہو سکے۔ اگر لسانِ غیر قوم یا لسانِ غیر عصر میں کلام کیا جائے تو دعوت پہونچانے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان پر حجت تمام کر دی گئی ہے۔

جو لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہیں، ان کے لیے لسانِ قوم یا زمانہ میں رائج اسلوب کی اہمیت تربیت کے اعتبار سے ہے۔ کوئی بات جب تک مخاطب کی اپنی زبان یا اس کے اپنے قابلِ فہم اسلوب میں نہ کہی جائے وہ اس کے ذہن کا جزء نہیں بنتی ، وہ اس کے اندر شعوری انقلاب بن کر داخل نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: الید العلیا خیر من الید السفلیٰ (اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے) اگر آپ اس حدیث کا صرف ترجمہ کر دیں یا روایتی طور پر صرف یہ بتا دیں کہ صدقہ دینے والا ہاتھ صدقہ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے تو وہ اتنی شدت کے ساتھ سننے والے کے ذہن میں جگہ نہیں بنا سکتا جیسا کہ فی الواقع اس سے مطلوب ہے۔

لیکن اگر آپ اس کو جدید زبان میں اس طرح کہیے کہ اس حدیث میں دینے والے گروہ (Giver group) اور لینے والے گروہ (Taker group) کا فرق بتایا گیا ہے، تو آج کا انسان فوراً اس کی معنوی اہمیت کو سمجھ لے گا۔ کیوں کہ یہ آج کی زبان ہے، اور کسی بات کو جب آج کی زبان میں کہہ دیا جائے تو وہ آج کے ذہن میں پوری طرح اتر جاتی ہے۔ وہ اس کے شعوری فکر کا جزء بن کر اس کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔

ہدایت کا قانون

صحیح البخاری (کتاب التفسیر) میں سورہ القصص کے تحت یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے۔ آپ نے دیکھا کہ ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ بن المغیرہ وہاں موجود ہیں۔ آپ نے ابو طالب سے کہا کہ اے چچا، لاالٰہ الا اللہ کہہ دیجئے، تاکہ اس کلمہ کی بنا پر میں اللہ کے یہاں آپ کے لیے حجت کرسکوں۔

ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ نے ابو طالب سے کہا، کیا تم عبد المطلب کے دین کو چھوڑ دو گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار ابو طالب کے سامنے اپنی بات کہتے رہے اور وہ دونوں بار بار اپنی بات دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں ابو طالب نے کہا کہ عبد المطلب کے دین پر۔ اور انھوں نے لاالٰہ الا اللہ کہنے سے انکار کیا (حتّی قال ابوطالب آخرَ ما کلّمَھُم: علیٰ مِلّۃِ عبدالمطّلب وابیٰ ان یقولَ لاالٰہ الا اللّٰہ)

روایت کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے ابوطالب کے بارہ میں آیت اتاری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ تم جس کو چاہو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے۔ بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کو ہدایت دیتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں (القصص ۵۶)

اس سے وہ قانون معلوم ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے مقرر کیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ دعوت خواہ کتنے ہی زیادہ طاقت ور دلیلوں کے ساتھ بیان کر دی جائے، بہر حال شبہہ کا ایک عنصر (element of doubt) پھر بھی اس میں موجود رہے گا۔ دلیل کی کوئی بھی مقدار شبہہ کے اس عنصر کو ختم نہیں کرسکتی۔ حتی کہ پیغمبر کی شخصیت اور اس کے برتر دلائل بھی ایسا نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی دعوت سے شبہہ کے اس عنصر کا خاتمہ کر دیں۔

شبہہ کے اس پردہ کو پھاڑنا مدعو کا کام ہے، وہ داعی کا کام نہیں۔ یہ اللہ کی سنت ہے، اور اللہ کی سنت کبھی بدلتی نہیں۔ یہ ہر حال میں انسان کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ شبہہ کے اس پردہ کو پھاڑے تاکہ وہ اس حقیقت کو بے نقاب کو دیکھ سکے۔ شبہہ کا پردہ پھاڑنے کے اس امتحان میں جو شخص پورا اترے، وہ اللہ کے قانون کے مطابق ہدایت کو پالے گا۔ اور جو شخص شبہہ کے اس پردہ کو پھاڑنے میں ناکام رہے، وہ ہدایت کو پانے میں بھی ناکام رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ذریعہ ابوطالب کے سامنے دعوت پوری طرح آچکی تھی۔ مگر شبہہ کا ایک عنصر پھر بھی ان کے لیے باقی تھا۔ وہ یہ کہ کیا یہ میرا بھتیجا اور عبد اللہ کا بیٹا حق پر ہے اور سارے اکابر قوم، بشمول عبد المطلب غلطی پر تھے۔ ابوطالب شبہہ کا یہ پردہ پھاڑ نہ سکے، اس لیے وہ ہدایت کو قبول کرنے سے بھی محروم رہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جنت ایک خدائی سودا ہے، اور وہ بہت مہنگا سودا ہے (الا ان سلعة الله غالية الا ان سلعة الله الجنة)

جو شخص جنت کے اس مہنگے سودے کا خریدار بننا چاہے، اس کو اس کی مطلوبہ قیمت دینی پڑے گی۔ اس قیمت کی ادائیگی کے بغیر وہ جنت کا مالک نہیں بن سکتا۔ وہ قیمت یہی "شبہہ کے عنصر" کو عبور کرنا ہے، وہ شبہہ کے اسی پردہ کو پھاڑنا ہے۔ اسی نازک عمل کی ادائیگی پر آدمی کو دنیا میں ہدایت ملتی ہے اور آخرت میں ابدی جنت۔

جنت ان نفیس اور لطیف روحوں کی آبادی ہے جو تمام ظاہری بڑائیوں سے گزر کر خدا کی چھپی ہوئی بڑائی کو پالیں۔ جو جوہر کی بنیاد پر چیزوں کو پہچاننے کا ثبوت دیں۔ جو ہنگامہ کی دنیا سے نکل کر خاموشی کی بزم میں پہنچ سکیں۔ جو ظواہر سے آگے بڑھ کر حقائق کو دیکھ سکیں۔ جو "اکابر" کے گنبدوں سے اوپر اٹھ کر سچائی کو وہاں دریافت کرلیں جہاں وہ بے گنبد حالت میں ظاہر کی گئی ہے۔

جنت بینا انسانوں کے لیے ہے، وہ اندھے انسانوں کے لیے نہیں۔ وہ اصحاب معرفت کے لیے ہے، وہ ظاہر پرستوں کے لیے نہیں۔ وہ ارباب اکتشاف کے لیے ہے، وہ جامد مقلدوں کے لیے نہیں۔ جنت ربانی لوگوں کے لیے ہے، اور بلاشبہہ ربانی لوگوں ہی کو جنت میں داخلہ دیا جائے گا۔

سب سے بڑی قربانی

عبداللہ بن وابصہ العبسی اپنے باپ سے اپنے دادا کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موسم میں ہماری قیام گاہ پر منیٰ میں آئے۔ ہم جمرۂ اولیٰ پر مسجد الخیف کے قریب ٹھہرے ہوئے تھے۔ آپ اپنے اونٹ پر تھے اور اپنے پیچھے زید بن حارثہ کو بٹھائے ہوئے تھے۔ آپ نے ہم کو توحید کی طرف دعوت دی۔ خدا کی قسم، ہم نے آپ کو کوئی جواب نہیں دیا اور ہم نے اچھا نہیں کیا۔ ہم آپ کے بارے میں سن چکے تھے اور یہ بھی سن چکے تھے کہ آپ حج کے موسم میں لوگوں کو اپنے دین کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ ہمارے پاس کھڑے ہو کر ہمیں دعوت دیتے رہے اور ہم چپ چاپ سنتے رہے۔ اس وقت ہمارے ساتھ میسرہ بن مسروق العبسی بھی تھے۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہم اس آدمی کی تصدیق کریں اور اس کو لے جا کر اپنے قافلہ کے بیچ ٹھہرائیں تو یہ بڑا اہم فیصلہ ہوگا۔ خدا کی قسم، اس کا دین غالب ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ وہ ہر جگہ پہنچ جائے گا۔ قبیلہ کے لوگوں نے کہا کہ اس کو چھوڑو، تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جس کو ہم میں سے کوئی ماننے والا نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات سن کر میسرہ کے بارے میں پُر امید ہو گئے۔ آپ نے ان سے مزید گفتگو کی۔ میسرہ نے جواب دیا کہ آپ کا کلام کتنا اچھا اور کتنا روشن کلام ہے۔ لیکن اگر میں اس کو مان لوں تو میری قوم میری مخالف ہو جائے گی۔ اور آدمی ہمیشہ اپنی قوم کے ساتھ ہوتا ہے۔ کیوں کہ قوم اگر مدد نہ کرے تو دشمنوں سے مدد کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔ ۱/ ۹۳۔

سب سے بڑی قربانی یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی قوم کی روش کے خلاف ایک روش اختیار کرے۔ وہ اپنی قوم کے عام مزاج کے خلاف کام کرے۔ وہ ایسی بات کہے جو قوم کے وقار سے ٹکراتی ہو۔ وہ ایسی پالیسی کی تبلیغ کرے جو قومی پالیسی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ ایسا آدمی اپنی قوم سے کٹ جاتا ہے۔ وہ خود اپنوں کے درمیان اجنبی بن کر رہ جاتا ہے۔

حق غالب رہا

اسلام خدا کا آخری دین ہے۔ آخری دین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے لئے خدا نے یہ مقدر کر دیا ہے کہ وہ قیامت تک ایک محفوظ اور زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی رہے۔ ہر چیلنج اس کے لئے زندگی کا ایک نیا موقع ثابت ہو۔ ہر چیلنج اس کے لئے ایک اسٹپنگ اسٹون بن جائے۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے۔ **الاسلام یعلو ولا یعلیٰ** (صحیح البخاری، کتاب الجنائز) تاہم اسلام کا یہ علو فکری اور تاریخی معنی میں ہے، وہ سیاست اور اقتدار کے معنی میں نہیں ہے۔ سیاسی اقتدار، خدا کے قانون کے مطابق بدلتا رہتا ہے (آل عمران ۱۴۰)۔ مگر فکری اور نظریاتی سربلندی جو اسلام کو عطا ہوئی ہے اس میں کبھی کوئی فرق آنے والا نہیں۔ یہ اسلام کی ایک ابدی صفت ہے نہ کہ کوئی وقتی صفت۔

قرآن میں اس حقیقت کو پیغمبر اسلام کی نسبت سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ـــــ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے، اور اللہ اس پر نگراں ہونے کے لئے کافی ہے۔ (الفتح ۲۸) خدا کا یہ فیصلہ اس حد تک حتمی ہے کہ قرآن کے مطابق، اسلام کے مخالفین اگر اس کے خلاف کوئی شر کھڑا کریں تو وہ شر بھی اسلام کے لئے خیر بن جائے گا (النور ۱۱)

اسلام کے اس مستقبل کو یقینی بنانے کے لئے خدا نے تاریخ انسانی کو ایک ایسے رخ پر ڈال دیا کہ وہ ہمیشہ وہی کورس اختیار کرے جو اسلام کی موافقت میں جانے والا ہو۔ **وکفی باللہ شهیدا** (الفتح ۲۸) کا مطلب یہی ہے۔ حتی کہ اس معاملہ کو یقینی بنانے کے لئے خدا نے یہ غیر معمولی فیصلہ فرما دیا کہ نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم بھی اس موافقِ اسلام تاریخی عمل (Historical Process) میں اپنا مثبت حصہ ادا کرتے رہیں۔ یہ حقیقت صحیح البخاری کی ایک روایت میں اس طرح آئی ہے: **ان اللہ لیؤید هذا الدین بالرجل الفاجر** (فتح الباری ۲۰۸/۶)

اسلام کی یہ صفت کوئی پراسرار چیز نہیں۔ اس کو معلوم اسباب کے تحت سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ اسلام کا ایک محفوظ دین ہونا ہے۔ اسلام کے محفوظ مذہب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عین حقائق فطرت کے مطابق ہے۔ اسلام کا حقائق فطرت کے مطابق ہونا اس کے اندر یہ خصوصیت پیدا کرتا ہے کہ وہ ہر زمانہ میں اپنی برتر صداقت کو باقی رکھے۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں بعد کے زمانے میں بگاڑ آ گیا۔ اس بگاڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مذاہب نے حقائق فطرت کے ساتھ اپنی مطابقت کھودی۔ اور نتیجۃً وہ صرف وقتی صداقت بن کر رہ گئے نہ کہ ابدی صداقت۔ اس کے برعکس اسلام اپنی اصل ابتدائی حالت پر باقی ہے۔ اس لئے حقائق فطرت کے ساتھ اس کی مطابقت بھی باقی ہے۔ اسلام کی یہی امتیازی صفت ہے جس نے اس کے اندر ابدیت کی قدر (eternal value) پیدا کر دی۔ اپنی اس صفت کی بنا پر اسلام اسی طرح ابدی صداقت بن گیا جس طرح فطرت کے قوانین ابدی صداقت بنے ہوئے ہیں۔

اسلام کے حق میں خدا کا یہ فیصلہ پچھلے چودہ سو سال کے درمیان بار بار واقعہ بنتا رہا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر اس کے چند تاریخی حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اسلام ۶۱۰ عیسوی میں مکہ میں شروع ہوا جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی بار وحی نازل ہوئی۔ اس وقت اسلام عددی اعتبار سے ایک فی دنیا کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج اہل اسلام کی تعداد ساری دنیا میں ایک بلین سے بھی زیادہ ہے۔ پہلے دور میں اسلام کو جو چیلنج پیش آیا وہ اتنا بڑا تھا کہ اس کو انٹرنیشنل چیلنج کہا جا سکتا ہے۔ ایک طرف عرب کے تمام قبائل اسلام کو آغاز ہی میں مٹا دینے پر تل گئے۔ دوسری طرف عرب کے باہر اس وقت کی دنیا کے دو سب سے بڑے ایمپائر، رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر اسلام کے دشمن بن گئے۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ صرف ربع صدی کے اندر پورے عرب کو اسلامائز کر لیا گیا اور اس کے بعد اگلی ربع صدی میں اسلام رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کو ہمیشہ کے لئے توڑ کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔ یہ واقعہ اتنا زیادہ انوکھا تھا کہ ایک غیر مسلم مورخ نے اس کا

اعتراف ان غیر معمولی الفاظ میں کیا ہے کہ:

The expansion of Islam was the most miraculous of all miracles.

اسلام کی تیز رفتار توسیع تمام معجزوں سے زیادہ بڑا معجزہ تھا۔

۲۔ دوسری مثال اس عظیم پولیٹیکل چیلنج کی ہے جو منگول قبائل کی طرف سے پیش آیا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں وہ طوفان کی طرح اٹھے۔ انھوں نے بغداد کی خلافت کو تباہ کر دیا۔ انھوں نے سمرقند سے لے کر حلب تک تمام مسجدوں کو ڈھا دیا۔ ان کا یہ غلبہ اتنا زبردست تھا کہ کچھ لوگ یہ کہنے لگے کہ اگر تم یہ سنو کہ تاتاری شکست کھا گئے تو اس پر یقین نہ کرنا (اذا قیل لك أن التتر انهزموا فلا تصدق)۔

اس وقت اسلام کی نظریاتی طاقت ظاہر ہوئی۔ مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں نے اٹھ کر تاتاریوں کے درمیان خاموش دعوتی کام شروع کر دیا۔ انھوں نے تلوار کے چیلنج کا مقابلہ اسلام کی نظریاتی طاقت سے کیا، اس کا معجزاتی نتیجہ نکلا۔ پچاس سال سے بھی کم مدت میں پوری تصویر بدل گئی۔ منگول کی اکثریت اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگئی۔ قرآن کے یہ الفاظ تاریخ بن گئے کہ: فاذا الذی بینک و بینه عداوة کأنه ولی حمیم (۴۱:۳۴)

ایک غیر مسلم مورخ نے اس واقعہ کو A dazzling victory for the faith of Mohammad کا نام دیا ہے۔ وہ مزید ریمارک دیتا ہے کہ:

The religion of muslims had conquered where there arms had failed.

مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو گئے تھے۔

ایک اور غیر مسلم مورخ نے اس واقعہ کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ — فاتح نے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا:

The conquerors have accepted the religion of the conquered.

۳۔ اسلام کے خلاف تیسرا بڑا چیلنج وہ تھا جس کو نظریاتی چیلنج (آئیڈیالوجیکل چیلنج) کہا جا سکتا

ہے۔ یہ وہ چیلنج ہے جو کمیونزم کی طرف سے پیش آیا۔ کمیونزم (اشتراکیت) انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپ سے ابھرا اور تقریباً سو سال تک پوری دنیا میں لوگوں کے ذہنوں پر چھایا رہا۔ ۱۹۱۷ میں روسی اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد جب سوویت یونین بنا تو اس نے عالمی سپر پاور کی حیثیت حاصل کر لی۔ وہ بظاہر ناقابل شکست نظریہ بن گیا۔

مگر واللہ غالب علی أمرہ (یوسف ۲۱) کے مطابق خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا۔ اور ۱۹۹۱ میں سوویت ایمپائر ہاؤس آف کارڈس (تاش کے پتوں کے محل) کی طرح ڈھ پڑا۔ اس طرح کمیونسٹ ایمپائر کا آخری انجام صرف یہ ہوا کہ وہ عالمی سطح پر ایک ایسا نظریاتی خلا (ideological vacuum) چھوڑے جس کو دوبارہ صرف اسلام ہی پر کر سکتا ہو۔

۴۔ اسلام کے خلاف چوتھا چیلنج جدید سائنس کے ظہور کے بعد پیش آیا۔ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں جب سائنسی دریافتیں بڑھیں اور فطرت کے چھپے ہوئے قوانین معلوم ہوئے تو جدید ملحدین نے یہ کہہ کر خدا کا انکار کر دیا کہ کائنات کی توجیہ کے نام پر خدا کو مانا جاتا تھا۔ اب ہم نے فطرت کا قانون دریافت کر لیا ہے، اس لئے اب خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ جولین ہکسلے (۱۸۸۷۔۱۹۷۵) نے جدید الحاد کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ واقعات اگر فطری اسباب کے تحت ظہور میں آتے ہیں تو وہ فوق الفطری اسباب کا نتیجہ نہیں ہو سکتے:

"If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes."

اسلام کے مذہبی سسٹم کی پوری بنیاد ایک خدا کے تصور پر قائم ہے۔ اس لئے الحاد کا یہ جدید ایڈیشن اسلام کے خلاف بظاہر زبردست چیلنج تھا۔ لیکن دوبارہ خدا کا فیصلہ تاریخ میں ظاہر ہوا۔ خود مغربی دنیا میں ٹاپ کے سائنس داں اس متھ کو توڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے، مثلاً سر جیمس جینس (۱۸۷۷۔۱۹۴۶) اور سر آرتھر اڈنگٹن (۱۸۸۲۔۱۹۴۴) وغیرہ۔

ان سائنس دانوں نے سائنسی دلائل کے ذریعہ اس حقیقت کو بتایا کہ جدید ملحدین کی یہ بات

محض ایک مغالطہ ہے کیوں کہ خدا کی نسبت سے اصل مسئلہ توجیہ کا ہے جب کہ نیچر محض ایک واقعہ ہے نہ کہ کوئی توجیہ:

Nature is a fact, not an explanation.

انھوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ نیچر مخلوق ہے، وہ خالق نہیں۔ نیچر توجیہ نہیں کرتی وہ خود اپنے لئے توجیہہ کی محتاج ہے:

Nature does not explain, she herself is in need of an explanation

۵۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے لئے فکری اور نظریاتی غلبہ کو ابدی طور پر مقدر کر دیا گیا ہے۔ اسلام کے خلاف ہر چیلنج opportunity in disguise ہے۔ قرآن میں اس حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کی گیا ہے کہ ہر عسر کے ساتھ یسر ہے (الانشراح)۔ گویا اسلام کو خدا نے ایک ایسی ناقابل تسخیر طاقت بنا دیا ہے جو اپنے ہر مائنس کو پلس میں تبدیل کر سکے۔ اس حقیقت کو ایک برٹش مورخ پروفیسر کلٹ نے پیغمبر اسلام کے ریفرینس میں اس طرح بیان کیا:

He faced adversity with the determination to wring success out of failure.

انھوں نے مشکلات کا مقابلہ اس عزم کے ساتھ کیا کہ وہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں۔

نصیحت پذیری

کسی انسان کو جب حق کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اس کی سوچ ایمانی سوچ بن جاتی ہے تو فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ انسان بن جاتا ہے۔ اسی ایمانی سنجیدگی کا ایک پہلو وہ ہے جس کو نصیحت پذیری کہا جاسکتا ہے۔ قرآن میں اس کے لیے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً تذکّر (الزمر ۹) اعتبار (المؤمنون ۲۱) توسم (الحجر ۷۵)، وغیرہ۔ اسی طرح حدیث میں بھی اسی قسم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً وصمتی فکرا ونظری عبرۃً (مشکاۃ المصابیح ۳/ ۱۴۷۲) یعنی میری خاموشی سوچ کی خاموشی ہو اور میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو۔

ایمان یا حق کی معرفت بھی بذات خود اسی نوعیت کی ایک چیز ہے۔ ایمانی معرفت کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی مخلوقات پر غور کر کے خالق کو دریافت کرے۔ وہ دیکھنے والی دنیا کے اندر غیب کی دنیا کو پالے۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ آیات (خارجی نشانیوں) کے ذریعہ داخلی حقیقتوں کو جان لے۔ وہ بصارت کے ساتھ بصیرت کی استعداد حاصل کرلے۔

تدبر و تفکر مومن کا عام مزاج ہوتا ہے۔ اُس کا یہ مزاج ہمیشہ اور ہر جگہ قائم رہتا ہے۔ یہ مزاج اُس کو دائمی طور پر اللہ کی یاد کرنے والا بنا دیتا ہے۔ وہ ہر دن ایسی باتیں دریافت کرتا رہتا ہے جو اُس کے ایمان و یقین میں اضافہ کرنے والی ہوں۔ دوسرے لوگ ظواہر میں صرف ظواہر کو دیکھتے ہیں، مگر مومن اپنے اس مزاج کی بنا پر ظواہر میں حقائق کو دریافت کر لیتا ہے۔ تدبر اور تفکر کے اس عمل کے لیے کسی تنہائی یا مخصوص مقام کی ضرورت نہیں۔ یہ عمل مومن کے دماغ میں ہر لمحہ جاری رہتا ہے، حتی کہ دنیا کے بھرے ہوئے ہنگاموں میں بھی وہ اُس سے منقطع نہیں ہوتا۔

نصیحت پذیری مومن کی روحانی خوراک ہے۔ مومن کے لیے مادی غذا اگر جسمانی تقویت کا ذریعہ ہے تو عبرت و نصیحت اُس کے لیے روحانی غذا کی حیثیت رکھتی ہے۔ مادی غذا کے بغیر جسم صحت مند نہیں رہ سکتا، اسی طرح فکری غذا کے بغیر روحانیت کا ارتقاء ممکن نہیں۔

جس طرح تقویٰ مومن کی ایک صفت ہے اسی طرح نصیحت پذیری بھی مومن کی ایک صفت ہے۔قرآن میں اس کو اعتبار (الحشر ۲) کہا گیا ہے۔یعنی آدمی جو چیز دیکھے یا سنے یا پڑھے، اس سے وہ سبق لے وہ ظاہری چیزوں میں چھپے ہوئے اندرونی پہلو کو جاننے لگے۔

یہ نصیحت پذیری مومن کی غذا ہے اس کے ذریعہ مومن کا ایمان زیادہ سے زیادہ شعوری ایمان بنتا ہے مومن کے ایمانی احساسات میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔اس سے مومن کو وہ خصوصی چیز ملتی ہے جس کو قرآن میں اضافۂ ایمان کہا گیا ہے۔نصیحت پذیری کے ذریعہ مومن اپنے ایمان کو بڑھاتا رہتا ہے۔یہاں تک کہ اس کی شخصیت اعلیٰ ایمانی درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔وہ نفسیاتی اعتبار سے فرشتوں کے ہم سطح بن جاتا ہے۔

شدت پسندی نہیں

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا تشددوا علی أنفسکم فیشدد علیکم، فإنَّ قوما شددوا علی أنفسهم فشدَّد الله علیهم، فتلك بقایاهم فی الصوامع والدیار** (سنن أبی داوٗد، کتاب الأدب، باب فی الحسد) یعنی تم اپنے آپ پر سختی نہ کرو ورنہ تمہارے اوپر سختی کی جائے گی۔ کیوں کہ ایک قوم نے اپنے آپ پر سختی کی۔ پھر اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ تو انہی لوگوں کے باقیات ہیں گرجوں میں اور خانقاہوں میں۔

اس حدیث میں تشدد سے مراد محدود طور پر صرف مذہبی تشدد یا انتہا پسندانہ رہبانیت نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق انسانی زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ جس معاملہ میں بھی اعتدال کا طریقہ چھوڑ کر شدت کا طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ سب اس حدیث کے حکم میں شامل ہوگا۔

اعتقادی شدت پسندی یہ ہے کہ جزئی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کی تکفیر اور تفسیق کی جانے لگے۔ اسی طرح عبادتی شدت پسندی یہ ہے کہ فروعی مسالک کی بنیاد پر الگ الگ مسجدیں بنائی جائیں اور اس کو امت میں تفریق کی حد تک پہنچا دیا جائے۔ اسی طرح معاملاتی شدت پسندی یہ ہے کہ رخصت کو کم تر سمجھ کر ہر معاملہ کو عزیمت کا سوال بنا دیا جائے۔

شدت پسند آدمی اپنے آپ میں جیتا ہے۔ وہ صرف اپنی امنگوں کو جانتا ہے۔ اس بنا پر اس کی حیثیت اس انسان جیسی ہو جاتی ہے جو سڑک کو خالی سمجھ کر اس کے اوپر اپنی گاڑی دوڑانے لگے۔ ایسا آدمی کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز اعتدال پسندی ہے، نہ کہ شدت پسندی۔ شدت پسندی گویا خدا کے تخلیقی نقشہ کے خلاف جینے کی کوشش کرنا ہے اور اعتدال پسندی خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔ شدت پسندی اپنی ذات کے اعتبار سے تواضع کے خلاف ہے اور دوسروں کے اعتبار سے رعایتِ انسانی کے خلاف۔ اور یہ دونوں چیزیں بلاشبہہ اسلام میں مطلوب نہیں۔

شدت پسندی اللہ کو پسند نہیں۔ جو لوگ شدت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں اُن کا انجام یہ

ہوتا ہے کہ متشددانہ طریقہ اُن کی روایات میں شامل ہو کر اُن کے دین کا جزء بن جاتا ہے۔ اس طرح اُن کی بعد کی نسلیں مجبور ہو جاتی ہیں کہ وہ اُن کی پیروی کریں۔ کیوں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اُن کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ معیار سے کم تر درجہ کی دین داری اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اس شدت پسندی کا تعلق محدود طور پر صرف رہبانیت سے نہیں ہے بلکہ اُس کا تعلق ہر دینی شعبہ سے ہے۔ مثلاً قومی اور سیاسی حقوق کی جدوجہد کے لیے دو ممکن طریقے ہیں۔ ایک پُر امن جدوجہد، اور دوسری پُر تشدد جدوجہد۔ اس معاملہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ پُر امن اور غیر متشددانہ طریقِ کار کے ذریعہ اپنے مقصد کے حصول کی جدوجہد کی جائے۔ اس کے برعکس اگر متشددانہ طریقِ کار کا انداز اختیار کیا جائے تو اس کا بیک وقت دو نقصان ہوگا۔ ایک یہ کہ قوم کو غیر ضروری سختیاں برداشت کرنی پڑیں گی۔ دوسرے یہ کہ جب ایک بار متشددانہ طریقِ کار کی روایت قائم ہو جائے گی تو اُسی کو جدوجہد کے اعلیٰ معیار کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ متشددانہ طریقِ کار کو بے نتیجہ سمجھتے ہوئے بھی لوگ اس پر قائم رہیں گے، کیوں کہ اس سے ہٹنے کے بعد لوگوں کو محسوس ہوگا کہ انہوں نے خود دین کے مطلوب معیار کو چھوڑ دیا۔ اُنہوں نے عزیمت کے بجائے رخصت کا راستہ اختیار کر لیا۔ اُنہوں نے اقدام کے بجائے پسپائی کو اپنا طریقہ بنا لیا۔

شدت پسندی ہی کی ایک صورت وہ ہے جس کو انتہا پسندی (extremism) کہا جاتا ہے۔ انتہا پسندی یہ ہے کہ آدمی حقائق اور امکانات کو نظر انداز کر کے اپنے عمل کا نقشہ بنائے۔ وہ عقل کے بجائے اپنے جذبات کی رہنمائی میں چلنے لگے۔ وہ دور اندیشی کے بجائے عجلت پسندی کی روش اختیار کر لے۔ وہ تدریج کے بجائے چھلانگ کے ذریعہ اپنا سفر طے کرنا چاہے۔

ایسا آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ شوق کو اپنے آگے رکھ دیتا ہے اور دور اندیشی کو اپنے پیچھے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ ہر ایک کی ایک حد ہے، خواہ وہ کوئی فرد ہو یا کوئی گروہ۔ حد کو نظر انداز کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص جلتے ہوئے انگارے کی گرمی کا اندازہ کرنے کے لیے اُس کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یا پتھر کو توڑنے کے لیے اپنے سر کو ہتھوڑا بنا لے۔ اس قسم کا ہر فعل حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اور حد سے تجاوز کرنے والے لوگ اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

آداب کلام

حکمت کلام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیراً او لیصمت)

لابرویر (Jean de La Bruyere) ایک فرانسیسی مصنف ہے۔ وہ ۱۶۴۵ میں پیدا ہوا اور ۱۶۹۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے یہی بات ان لفظوں میں کہی کہ یہ بڑی بدبختی کی بات ہے کہ آدمی کے اندر نہ اتنی سمجھ ہو کہ وہ اچھا بولے، اور نہ اتنی قوت فیصلہ ہو کہ وہ چپ رہے:

It is a great misery not to have enough wit to speak well, nor enough judgement to keep quiet.

بولنے کی صلاحیت ناقابل بیان حد تک ایک عظیم صلاحیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔ بولنے کی صلاحیت کو اگر درست طور پر استعمال کیا جائے تو وہ نعمت ہے، اور اگر بولنے کی صلاحیت کا بے جا استعمال کیا جائے تو وہ اتنی ہی بڑی مصیبت بن جاتی ہے۔

بولنے کی صلاحیت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ آدمی بولنے سے پہلے سوچے۔ خود کہنے سے پہلے وہ دوسروں کی سنے۔ جو لفظ بھی وہ منھ سے نکالے یہ سوچ کر نکالے کہ اس کو اپنے بولے ہوئے ایک ایک لفظ کا جواب اللہ تعالیٰ کے یہاں دینا ہے، جس کے پاس بولنے کے لیے ہو، اس کے باوجود وہ چپ رہنے کو پسند کرے۔ جو ذمہ داری کے احساس کے تحت بولے نہ کہ شوق گفتگو کے جذبہ کے تحت۔

اس کے برعکس بولنے کی صلاحیت کا غلط استعمال یہ ہے کہ آدمی سوچے بغیر بولے۔ اس کو صرف سنانے کا شوق ہو، سننے سے اسے کوئی دل چسپی نہ ہو۔ معاملات کو گہرائی کے ساتھ سمجھے بغیر وہ معاملات پر تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ اس کا بولنا خودنمائی کے لیے ہو نہ کہ اظہار حقیقت کے لیے۔

بولنا سب سے بڑا ثواب ہے، اور بولنا سب سے بڑا گناہ بھی۔ جو آدمی اس حقیقت کو جان لے، اس کا بولنا بھی بامعنی ہوگا اور اس کا چپ رہنا بھی بامعنی۔

اسلوب کلام

عن ابن مسعودٍ انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلّم قال لقومٍ یتخلفون عن الجمعةِ : لقد ھممتُ ان آمُرَ رجلاً یصلّی بالنّاسِ ثُمّ اُحرّقَ علیٰ رجالٍ یتخلّفون عن الجمعة بیوتَھُم ۔

(مسلم بحوالہ مشکاۃ ۱/ ۴۳۵)

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی بابت فرمایا جو جمعہ کی نماز میں نہیں آتے کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں کسی شخص سے کہوں کہ وہ نماز پڑھائے اور پھر میں جاکر ان لوگوں کے گھروں کو جلادوں جو جمعہ میں پیچھے رہ جاتے ہیں ۔

اس حدیث کے ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے جو لوگ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں نہ آئیں ان کے گھروں میں آگ لگا کر ان کو ان کے گھر کے سمیت جلا دینا چاہیے ۔ مگر ایسے لوگوں کے ساتھ اس قسم کی کارروائی نہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور نہ آپ کے بعد اسلام کی لمبی تاریخ میں کبھی ایسا کیا گیا اور نہ علمار نے کبھی یہ فتویٰ دیا کہ تارکِ جمعہ کے گھر میں آگ لگا کر اس کو جلا دو ۔

اس کی وجہ کیا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ کبھی ظاہری مفہوم کے اعتبار سے بولے نہیں جاتے بلکہ وہ شدتِ احساس کو بتانے کے لیے بولے جاتے ہیں ۔ ان الفاظ کو ان کے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے لینا چاہیے نہ کہ محض ظاہری الفاظ کے اعتبار سے ۔

ہر کلام اصلاً کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بولا جاتا ہے ۔ مگر اسی کے ساتھ ہر کلام کا ایک اسلوب ہوتا ہے اور یہ اسلوب متکلّم کے احساس کا مظہر ہوتا ہے ۔ اگر آدمی کسی بات سے شدید طور پر متاثر ہو تو اس کے احساس کی جھلک اس کے بولے ہوئے الفاظ میں بھی آجائے گی ۔ اس نکتہ کو ملحوظ رکھے بغیر کسی کلام کی اصل نوعیت کو سمجھا نہیں جاسکتا ۔

سننے والا اگر سنجیدہ ہو تو متکلم کی بات کو سمجھنے میں اسے کوئی زحمت پیش نہیں آئے گی ۔ مگر جو لوگ سنجیدہ اور محتاط نہ ہوں وہ ہر کلام کا الٹا مطلب نکال سکتے ہیں ، خواہ وہ اللہ اور رسول کا کلام کیوں نہ ہو ۔

کلام کی دو قسمیں

عن عبد اللہ بن عمر، قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللہ علیہ وسلم: لا تُکثروا الکلامَ بغیرِ ذکرِ اللّٰہ۔ فان کثرۃ الکلام بغیر ذکرِ اللّٰہ قَسْوَۃٌ لِلقلبِ۔ و ان ابعدَ الناسِ من اللّٰہِ القلبُ القاسِی۔

(رواہ الترمذی)

حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کرو۔ کیوں کہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام کرنا دل کی قساوت کی وجہ سے ہوتا ہے اور جس دل میں قساوت ہو وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ سے دور ہوتا ہے۔

اس حدیث میں ''ذکر'' سے مراد معروف معنوں میں کلماتِ ذکر نہیں ہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بات کرتے ہوئے بار بار ذکر کے کلمات کو اپنی زبان سے دہراتے رہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بات کو یادِ خداوندی کی کیفیت سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کو یادِ خداوندی کی روح سے بھرا ہوا ہونا چاہیے۔

قساوت کے معنی سختی کے ہیں۔ ارض قاسیہ اس زمین کو کہتے ہیں جو بنجر ہو اور جس میں کچھ نہ اُگے۔ جب یہ لفظ دل کے لیے بولا جائے تو اس کا مطلب ہوگا سخت دل، ایسا دل جو بے حس ہو گیا ہو۔ جن لوگوں کے دلوں میں سختی آجائے، جن کے اندر حساسیت باقی نہ رہے، ان کا کلام ایک قسم کی لسانی ورزش ہوتا ہے۔ ایسے کلام میں تواضع اور خشیت کی روح باقی نہیں رہتی۔ وہ بے حس مشین کی طرح بولتے ہیں نہ کہ اس انسان کی طرح جو خدا کی عظمت وجلال میں غرق ہو کر بول رہا ہو۔

اس کے برعکس جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہو، جس کو آخرت کی جواب دہی کے احساس نے گھُلا رکھا ہو، وہ جب بولے گا تو اس کے لفظ لفظ میں اس کی قلبی کیفیت کا رنگ جھلک رہا ہوگا۔ اس کا کلام ایک سنجیدہ انسان کا کلام ہوگا۔ اس کے لہجہ میں دردمندی ہوگی۔ اس کی باتوں میں گہرائی ہوگی۔ اس کی ہر بات میں خدا اور آخرت کی فکر شامل ہوگی۔

بے حس آدمی کے الفاظ انسانی ڈکشنری سے ماخوذ ہوتے ہیں، حساس آدمی کے الفاظ خدائی معرفت سے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں کلام میں وہی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو فرق زمین وآسمان کے درمیان ہے۔

زبان کا استعمال

عربی کا ایک مقولہ ہے: عییّ صامت خیر من عییّ ناطق (خاموش عاجز بولنے والے عاجز سے بہتر ہے) یعنی ایک آدمی کو بولنا نہیں آتا اس بنا پر وہ چپ رہا، تو ایسا شخص اس آدمی سے بہتر ہے جس کے اندر بولنے کا سلیقہ نہ تھا اس کے باوجود وہ بولا اور بات کو بگاڑ دیا۔

اس حقیقت کو حدیث میں زیادہ بہتر طور پر اس طرح کہا گیا ہے کہ ـــــ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ بولے تو درست بات بولے ورنہ چپ رہے (**من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت**) صحیح البخاری، کتاب الادب۔

بولنا اپنی ذمہ داری کا اظہار ہے۔ سچا بولنے والا وہ ہے جس کے ذمہ داری کے احساس نے اس کو بولنے پر مجبور کیا ہو۔ جس بولنے میں اس قسم کا جذبہ شامل نہ ہو وہ حقیقی معنوں میں بولنا نہیں ہے بلکہ خدا کی دی ہوئی صفت نطق کا بے جا استعمال ہے۔ اسلام میں جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان میں سے ایک اصراف ہے۔ یعنی خدا کی دی ہوئی چیزوں میں سے کسی چیز کو غیر ضروری طور پر خرچ کرنا۔ نطق بھی خدا کی ایک نعمت ہے۔ نطق کی صلاحیت کا مصرفانہ استعمال ایک ایسا فعل ہے جس پر خدا کے یہاں سخت پکڑ کا اندیشہ ہے۔

اس قسم کے استعمال پر خدا کی طرف سے پکڑ کا اندیشہ ہے نہ کہ انعام کی امید۔ آدمی کو اگر واقعۃً احساس ہو کہ نطق کی عظیم صلاحیت جو اس کو دی گئی ہے۔ وہ ایک مقصد خاص کے تحت دی گئی ہے اور وہ مقصد خاص یہ ہے کہ آدمی اپنی اس صلاحیت کو امر حق کے اظہار میں صرف کرے تو کبھی وہ غیر ذمہ دارانہ گفتگو کی غلطی نہیں کر سکتا۔ وہ بولے گا تو وہی بات بولے گا جو بولنے کے قابل ہے۔ اور اگر اس کے پاس بولنے کے قابل کوئی بات نہ ہو تو وہ چپ رہے گا، نہ کہ غیر ضروری طور پر بے فائدہ کلام کرنے لگے۔ بولنا اگر کام ہے تو چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ خدا کے یہاں اگر بولنے پر اجر ہے تو خدا اس انسان کو بھی اجر دے گا جس کے احساس ذمہ درای نے اس کو بولنے سے روک دیا۔

زبان جنت بھی ہے اور جہنم بھی

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: انّ العبدَ لیتکلّم بالکلمۃِ من رضوانِ اللہ تعالیٰ ما یُلقِی لھا بالاً یرفعُہ اللہ بھا درجاتٍ، وانّ العبدَ لیتکلّمُ بالکلمۃِ من سَخَطِ اللہ تعالیٰ لا یُلقِی لھا بالاً یھوی بھا فی جھنم (بخاری، کتاب الرقاق)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بندہ اللہ کی رضا کی ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اس کی وجہ سے اللہ اس کے درجات بہت بلند کر دیتا ہے۔ اسی طرح بندہ اللہ کی ناراضگی کی ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اس کی وجہ سے وہ جہنم میں جا گرتا ہے۔

ایک معاملہ میں دو قسم کے کلام کی ایک مثال وہ ہے جو غزوۂ بنی مصطلق (۶ ھ) کے موقع پر پیش آئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ ایک اتفاقی سبب سے وہ قافلہ سے بچھڑ گئیں اور بعد کو صفوان بن معطل کے ساتھ مدینہ آئیں۔ اس طرح کے واقعات قدیم صحرائی زندگی میں غیر معولی نہ تھے۔ مگر اس سادہ سے واقعہ کو عبد اللہ بن ابی نے، جو رسول اللہ کو بدنام کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتا تھا، غلط رنگ دیا اور حضرت عائشہ کو صفوان کے ساتھ ملوث کر کے آپ کی عزت و عصمت پر حملے کئے۔ قرآن میں ہے کہ اس کی وجہ سے عبد اللہ بن ابی عذاب عظیم کا مستحق ہو گیا (نور ۱۱)

اس واقعہ کی بے ضرر توجیہہ بھی ہو سکتی تھی۔ مگر اس نے اس واقعہ سے افک (جھوٹ) کی غذا لی۔ اس نے کہا: "عائشہ رضی کا قافلہ سے بچھڑنا اور پھر ایک غیر مرد کے اونٹ میں بیٹھ کر واپس آنا محض اتفاقیہ نہیں ہو سکتا"، اس قسم کی کوئی بات جو کسی پاک دامن خاتون کے کردار کو مشتبہ کرے اللہ کی نظر میں جرم عظیم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا ایک جملہ بھی آدمی کو جہنم میں گرا دینے کے لئے کافی ہے۔

ایسے مواقع پر صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس سے ظن خیر کی غذا لے۔ وہ اپنی آبرو پر دوسرے کی آبرو کو قیاس کرے۔ اس کی ایک مثال حضرت ابو ایوب (خالد بن زید انصاری) کا واقعہ ہے۔ جب یہ قصہ پھیلا تو ان کی بیوی نے کہا: اے ابو ایوب، کیا آپ نے نہیں سنا کہ عائشہ کے بارے میں لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں۔ مگر وہ جھوٹ ہے۔ اے ام ایوب، کیا تم ایسا کرو گی۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم نہیں، میں کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ ابو ایوب انصاری نے کہا: پھر عائشہ خدا کی قسم تم سے بہتر ہیں (ان ابا ایوب قالت لہ امرأتہ ام ایوب۔ یا ابا ایوب، الا تسمع ما یقول الناس فی عائشۃ۔ قال بلی وذلک الکذب۔ اکنت یا امّ ایوب

فاعلة۔ قالت لا واللہ ماکنتُ لا فعلہ ۔ قال فعائشۃ واللہ خیر منک ، سیرت ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۳۴۷)

قرآن میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

لولا اذ سمعتموہ ظن المومنون والمومنات	ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مسلمان مردوں
بانفسھم خیرا وقالوا ھذا افک مبین	اور مسلمان عورتوں نے اپنے لوگوں کی بابت اچھا گمان کیا ہوتا
(نور ۱۲)	اور کہتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا بہتان ہے ۔

جب کسی کے متعلق کوئی بات سامنے آئے تو ہمیشہ اس کو اچھے مفہوم میں لینے کی کوشش کرنا چاہئے ۔ انسانی زندگی کا معاملہ ایک بے حد پیچیدہ معاملہ ہے ۔ کسی انسانی واقعہ کو بخوبی طور پر سمجھنے کے لئے بہت سی چیزوں کے بارے میں قطعی معلومات ضروری ہیں جو عام طور پر ایک آدمی کو حاصل نہیں ہوتیں ۔ کسی انسانی واقعہ کے بہت سے اجزاء ہوتے ہیں ۔ ایک ہی واقعہ کو ناکافی معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو کچھ نظر آتا ہے اور کافی معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو کچھ ۔ بیشتر حالات میں کسی شخص کے سامنے واقعہ کے تمام اجزاء نہیں ہوتے ۔ یہی وجہ ہے کہ جلد رائے قائم کرنے والا اکثر غلط رائے قائم کرتا ہے ۔ پھر کوئی آدمی کیوں غیر ضروری طور پر اپنے کو آزمائش میں ڈالے ۔ وہ کیوں ایسی بات کہے جس کو وہ سچائی کی عدالت میں صحیح ثابت نہ کر سکتا ہو ۔

اسلامی معاشرہ خدا سے ڈرنے والوں کا معاشرہ ہوتا ہے ۔ ایسے معاشرہ میں ہر آدمی کی زبان پر اللہ کے ڈر کی لگام لگی ہوئی ہوتی ہے ۔ اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہوں وہ دوسرے کے بارے میں کبھی بدخواہی کا کلمہ نہیں کہہ سکتے ۔ جو آدمی اس پر یقین رکھتا ہو کہ بالآخر سارے معاملات خدا کے یہاں پیش ہونے والے ہیں وہ دوسرے کے بارے میں کوئی بات زبان سے نکالتے ہوئے فوراً یہ سوچتا ہے کہ میری بات اگر خدا کے یہاں بے دلیل ٹھہرے تو میں کیا کروں گا ۔ ایسا آدمی دوسروں کے ساتھ کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کرتا جو اس کو خدا کے یہاں بے قیمت کر دینے والا ہو ۔ کسی آدمی کے ساتھ برا سلوک کرتے ہوئے وہ اس طرح ڈرنے لگتا ہے جیسے اس آدمی کے ساتھ خود خدا کھڑا ہوا ہو ۔

خدا سے ڈرنے والا آدمی نہ صرف یہ کہ دوسرے کے خلاف کوئی بات کہنے میں بے حد محتاط ہوتا ہے بلکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص ایک مسلمان کو بے آبرو کر رہا ہے تو وہ اس مسلمان کی طرف سے مدافعت کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے ۔ وہ مظلوم کے حق میں غیر جانب دار نہیں رہتا بلکہ وہ اس کا طرف دار بن جاتا ہے ۔ وہ اپنے آپ کو اپنے بھائی کی عزت و آبرو کا محافظ سمجھتا ہے ۔ وہ جب کسی کو دیکھتا ہے کہ وہ دوسرے کی بے آبروئی کر رہا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے ـــــ ھٰذا افک مبین

غیبت کا کفارہ

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ تم اس کے حق میں بخشش کی دعا کرو جس کی تم نے غیبت کی ہے۔ تم یہ کہو کہ اے اللہ، تو مجھ کو اور اس کو بخش دے (**إن من كفارة الغيبة أن تستغفر لمن اغتبته تقول اللهم اغفر لنا وله**) البیہقی۔

اجتماعی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی زبان سے دوسرے کے لئے کچھ برے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ جو غیبت کی تعریف میں آتے ہیں، جس کو اگر صاحب معاملہ سنے تو اس کو سخت تکلیف ہوگی۔ غیبت کو خدا کے دین میں گناہ بتایا گیا ہے۔ ایسی حالت میں وہ شخص کیا کرے جس کی زبان سے اپنے بھائی کے لئے غیبت والے الفاظ نکل گئے ہیں۔ اس نے اپنے بھائی کے حق میں اس کی غیر موجودگی میں ایسے کلمات کہہ دئے ہیں کہ اگر وہ اس کو سنے تو اس کے دل کو تکلیف پہنچے گی۔

اس کا حل دین میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی اس کے حق میں دعا کرے جس کے خلاف غیبت کے الفاظ اس کی زبان سے نکل گئے ہیں۔ وہ اپنے لئے خدا سے بھلائی مانگے اور اپنے بھائی کے لئے بھی خدا سے بھلائی کی درخواست کرے۔ وہ اپنی اصلاح کا طالب بھی ہو اور اپنے بھائی کی اصلاح کا طالب بھی۔ اس قسم کی دعا سادہ طور پر کچھ الفاظ بولنے کا نام نہیں۔ وہ اس شخص کے حق میں خیر خواہی کا اظہار ہے جس کے خلاف غیبت کا فعل ہوا تھا۔ غیبت اپنی حقیقت کے اعتبار سے نفرت اور بدخواہی کا عمل ہے۔ اگر کسی سے اس قسم کا عمل سرزد ہو جائے تو آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے دل سے نفرت اور بدخواہی کے جذبات کو نکالے اور اس کی جگہ متعلق شخص کے حق میں محبت اور خیر خواہی کے جذبات پیدا کرے۔ اسی محبت اور خیر خواہی کا ایک اعلے اظہار وہ ہے جس کو اس حدیث میں دعا کہا گیا ہے۔

جس سماج میں غیبت عام ہو جائے وہ سماج نفرت اور بے اعتمادی کا سماج بن جائے گا۔ کسی سماج کو اس بگاڑ سے بچانے کی تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ اسپرٹ پیدا کی جائے کہ جب کبھی ان کی زبان سے غیبت کے الفاظ نکل جائیں تو اس کے بعد وہ نیک دعاؤں سے دوبارہ اس برائی کو دھو دیں۔

نرم انداز

امام بخاری نے حضرت جابر بن عبداللہ کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس آدمی پر رحم کرے جو خریدنے اور بیچنے اور تقاضا کرنے کے وقت نرمی برتتا ہے (رحم اللہ رجلاً سمحاً اذا باع واذا اشتری واذا اقتضی، مشکاۃ المصابیح، الجزء الثانی، صفحہ ۸۵۰)

اس حدیث میں اصلاً آخرت کا معاملہ بتایا گیا ہے۔ یعنی جو تاجر ایسا کرے کہ وہ لوگوں کے ساتھ خرید و فروخت کے وقت نرمی کا معاملہ کرے۔ کسی کے ذمہ اس کا بقایا ہو تو نرمی اور شرافت کے ساتھ اس کا تقاضا کرے تو آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ رحم کا معاملہ فرمائے گا۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص لین دین میں لوگوں سے درگذر کا سلوک کرتا تھا۔ جب آخرت میں اس کا معاملہ پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندے سے درگذر کرو، کیوں کہ میں اس قسم کے سلوک کا زیادہ حق رکھتا ہوں (فقال اللہ تعالیٰ انا احق بذا منك، تجاوزوا عن عبدی)

تاہم اسلام میں دنیا اور آخرت الگ الگ نہیں ہیں۔ جو چیز آخرت کے اعتبار سے مفید ہے، اسی میں دنیا کا فائدہ بھی پوری طرح رکھ دیا گیا ہے۔

ایک بار میں نے ایک کامیاب دکاندار سے پوچھا کہ کاروبار میں کامیابی کے لیے کیا چیز ضروری ہے۔ اس نے جواب دیا: نرم بات۔ یہ عین وہی چیز ہے جو حدیث میں بتائی گئی ہے۔

اگر دنیا میں صرف کوئی ایک دکاندار ہوتا تو اس کو نرمی کا انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس کو اجارہ داری حاصل رہتی اور ہر شخص اپنی ضرورت سے مجبور ہوتا کہ ہر حال میں اسی سے سودا خریدے۔ مگر دنیا میں بے شمار دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ اب ایک شخص جس کی جیب میں قیمت ہے، وہ آپ ہی سے خریداری کیوں کرے گا۔ یہاں آپ کو یہ کرنا ہے کہ گاہک کی ضرورت کا مال دینے کے ساتھ اس کو اپنے نرم اخلاق سے خوش کریں۔ حتیٰ کہ اگر وہ کسی وجہ سے سخت رویہ اختیار کرے تب بھی آپ اس کے ساتھ نرم سلوک کرنا نہ چھوڑیں۔

موجودہ دنیا میں تجارتی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔ نرم انداز آدمی کو کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور سخت انداز ناکامی کی طرف۔

ایک حدیث

عن ابی ھُرَیرۃَ رضی اللّٰہ عنہ اَنّہٗ سَمِعَ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول : اِنَّ العبدَ لیتکلّم بالکلمۃِ مایَتَبَیَّنُ فیھا یَزِلُّ بھا الی النّارِ ابعدَ مما بین المشرقِ والمغربِ۔

(متفق علیہ)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ بندہ بے سوچے سمجھے بات کہتا ہے، اس کی وجہ سے وہ جہنم میں گر کر اس سے بھی زیادہ دور چلا جاتا ہے جتنا مشرق اور مغرب میں فاصلہ ہے۔

تَبَیَّنَ یَتَبَیَّنُ کے معنی عربی زبان میں غور کرنے کے ہیں۔ یعنی بولنے سے پہلے یہ سوچنا کہ آدمی جو کچھ کہنے جا رہا ہے وہ ٹھیک ہے یا بے ٹھیک۔ اس حدیث کے مطابق بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو بظاہر آدمی معمولی سمجھتا ہے مگر وہ اتنی سنگین ہوتی ہیں کہ آدمی کو جہنم میں گرانے کا سبب بن جاتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کچھ باتیں پر اسرار طور پر بری ہیں۔ یعنی بظاہر ان کا برا ہونا آدمی کو معلوم نہیں ہوتا۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ اللہ کے یہاں بری قرار پا جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر بری بات کا برا ہونا لوگوں کو معلوم ہے۔ البتہ جو بات لوگوں کو معلوم نہیں ہے وہ یہ کہ ایک بری بات جس طرح ایک ایسے شخص کے حق میں بولنا غلط ہے جو ہماری اچھی فہرست میں شامل ہو، اسی طرح اس شخص کے لیے بھی اس کو بولنا غلط ہے جو ہماری بری فہرست میں چلا جائے۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ جس آدمی سے وہ خوش ہوں اس کے بارے میں بولنا ہو تو وہ سوچے سمجھے الفاظ اپنی زبان سے نکالتے ہیں۔ مگر جس شخص سے ان کو شکایت ہو جائے یا جس کو وہ کسی وجہ سے حقیر سمجھ لیں اس کے بارہ میں وہ کسی احتیاط کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ایسے شخص کے معاملہ میں وہ بلا تحقیق کوئی بھی برا لفظ بول دیں گے۔ ایسے شخص پر وہ کوئی بھی بے بنیاد الزام لگا دیں گے اور یہ نہیں سوچیں گے کہ دلیل اور ثبوت کے بغیر کسی شخص پر الزام لگانا کسی بھی حال میں کسی کے لیے جائز نہیں۔ خواہ وہ لوگوں کی نظر میں کتنا ہی بڑا بزرگ کیوں نہ ہو۔ خواہ بظاہر اس نے دین یا دنیا کے کتنے ہی بڑے کارنامے انجام دیے ہوں۔

بھلی بات

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ بولے تو بھلی بات بولے، ورنہ چپ رہے (**من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیراً او لیصمت**)۔

دنیا کا اکثر بگاڑ کسی غلط بول کا نتیجہ ہوتا ہے اسی طرح دنیا کا اکثر بناؤ کسی اچھے بول کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک بول سے لوگوں میں محبت بڑھتی ہے اور دوسرا بول لوگوں میں نفرت پھیلانے کا سبب بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں سنجیدہ اور ذمہ دار آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان و قلم کو استعمال کرنے میں بے حد احتیاط کرے۔

زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کچھ لکھنا یا بولنا چاہتا ہے مگر لکھنا یا بولنا اسی انسان کے لئے جائز ہے جو مذکورہ پیغمبرانہ ہدایت پر عمل کرے۔ جو شخص اس ہدایت پر عمل نہ کر سکے اس کے لئے لکھنا اور بولنا سرے سے جائز ہی نہیں۔

اس معاملہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کے پاس کہنے کے لئے ایک ایسی بات ہے جو دوسروں کے بارے میں اچھا گمان پیدا کرنے والی ہے۔ جس کی اشاعت سے لوگوں کے درمیان محبت کی فضا پیدا ہونے کی امید ہے۔ جو واضح طور پر ایک ایسی بات ہے جس سے لوگوں کے اندر مثبت ذہن یا تعمیری شوق پیدا ہونے والا ہے۔ اس قسم کی بات بلاشبہ ایک بھلی بات ہے اور اس کو کہنے پر خدا کی طرف سے کوئی پابندی نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ جو بات لکھنے یا کہنے جا رہے ہیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک منفی بات ہے۔ اندیشہ ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے اندر بدگمانیاں پیدا ہوں۔ لوگوں کے اندر اشتعال بھڑکے۔ لوگ ایک دوسرے کے خلاف نفرت کرنے لگیں۔ انسانیت دوست اور دشمن میں تقسیم ہو جائے۔ ایسی صورت میں آپ کے اوپر لازم ہے کہ آپ چپ رہیں، نہ کہ بول کر انسانیت کے مسائل میں اضافہ کا سبب بن جائیں۔

معنی نہ کہ الفاظ

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ قال : من جلس فی مجلس فکثر فیہ لغطہ فقال قبل ان یقوم من مجلسہ: سبحانک اللّٰھم وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفرک واتوب الیک، الا غفر اللّٰہ لہ ما کان فی مجلسہ ذالک (ترمذی، نسائی)

حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : جو آدمی کسی مجلس میں بیٹھا۔ وہاں زور زور سے باتیں ہوئیں پھر اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اس نے کہا، اے اللہ تو پاک ہے اور تیری حمد ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ تو اس مجلس میں جو باتیں ہوئیں، اللہ ان کے لیے اسے معاف کر دیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان "الفاظ" کو زبان سے کہدینے کی وجہ سے اللہ اسے معاف کر دیتا ہے یہ معافی در اصل ادائگی معنی کی بنا پر ہوتی ہے نہ کہ محض ادائگی الفاظ کی بنا پر۔

یہ اس شخص کا حال بیان ہوا ہے جس کے دل میں اللہ کا ڈر موجود ہو۔ ایسا شخص جب کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اور وہاں کسی موضوع پر گفتگو ہوتی ہے تو گفتگو کے درمیان کبھی اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ زور زور سے بولتا ہے، وہ لوگوں سے غیر ضروری تکرار کرنے لگتا ہے۔

تاہم ابھی مجلس ختم نہیں ہوتی کہ اس کو احساس ہو جاتا ہے کہ میں نے غلط کیا۔ میں نے بے فائدہ کلام کیا۔ اس وقت اس کے دل میں شرمندگی کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اپنے اندر ہی اندر اپنا احتساب کرنے لگتا ہے۔ اس سے پہلے وہ بندوں سے مخاطب تھا۔ اب وہ اپنے رب سے مخاطب ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکل پڑتے ہیں جس کا ایک نمونہ اوپر کی حدیث میں نظر آتا ہے۔ حدیث کے یہ الفاظ حقیقتاً دعا کے معنی کو بتا رہے ہیں نہ کہ محض دعا کے الفاظ کو۔

خواتین

عورت کا درجہ

اسلام میں عورت کا درجہ کیا ہے، اس کا اندازہ ایک حدیث سے ہوتا ہے۔ امام بخاری نے حضرت عبد اللہ ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے: حضرت بریرہ کے شوہر ایک غلام تھے جن کا نام مغیث تھا۔ گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ مغیث اپنی بیوی کے پیچھے چل رہے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عباس، کیا تم کو اس پر تعجب نہیں کہ مغیث کو کتنی زیادہ محبت ہے بریرہ سے اور بریرہ کو کتنا زیادہ بغض ہے مغیث سے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے فرمایا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ تم مغیث کی طرف رجوع کرلو۔ بریرہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا آپ مجھے اس کا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں صرف سفارش کر رہا ہوں۔ بریرہ نے جواب دیا: تو مجھے اس کی ضرورت نہیں (لا حاجة لی فیه) فتح الباری ۹/۳۱۹۔

بریرہ نے اپنے شوہر مغیث سے تفریق کرالی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ کو مشورہ دیا کہ تم رجوع کرلو اور مغیث کے ساتھ زندگی گزارو مگر بریرہ نے آپ کے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا۔ اور مغیث سے رجوع پر راضی نہیں ہوئیں۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت کو کتنی زیادہ آزادی حاصل ہے۔ اس کے مطابق، عورت نہ صرف مرد کے برابر ہے بلکہ اس کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ خود پیغمبر اگر وحی کی بنیاد پر کوئی مطالبہ کرے تو وہ اس کو ماننے پر مجبور ہے، لیکن پیغمبر کے ذاتی مشورہ کو ماننا اس کے لیے ضروری نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں اس اعتبار سے عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ جو حقوق وفرائض مرد کے ہیں وہی حقوق وفرائض عورت کے بھی ہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ فطری سبب کی بنا پر ہے، نہ کہ دونوں جنسوں میں تفریق کی بنا پر۔ اس قسم کا فطری فرق جس طرح عورت اور مرد کے درمیان ہے اسی طرح وہ خود مرد اور مرد کے درمیان بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یہ فطرت کا معاملہ ہے، نہ کہ فرق کا معاملہ۔

بڑا کام

امام طبرانی (۳۶۰۔۲۶۰ھ) مشہور محدث ہیں۔ وہ شام میں پیدا ہوئے اور اصفہان میں وفات پائی۔ انھوں نے المعجم الکبیر میں ایک مفصل روایت عبداللہ بن عباسؓ کے واسطہ سے نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:

ثم جاء ته يعني النبي ﷺ امرأة، فقالت اني رسول النساء اليك، وما منهن امراة علمت او لم تعلم الا وهي تهوى مخرجي اليك، الله رب الرجال والنساء والاٰهن، وانت رسول الله الى الرجال والنساء كتب الله الجهاد على الرجال فان اصابوا اجروا، وان استشهدوا كانوا احياء عند ربّهم يرزقون، فما يعدل ذالك من اعمالهم من الطاعة؟ قال طاعة ازواجهن و المعرفة بحقوقهم، وقليل منكن من يفعله۔

پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی۔ اس نے کہا کہ میں عورتوں کی طرف سے بھیجی ہوئی آپ کے پاس آئی ہوں۔ اور ہر عورت خواہ وہ جانتی ہو یا نہ جانتی ہو، وہ چاہتی ہے کہ میں آپ سے مل کر معلوم کروں۔ اللہ مردوں کا رب بھی ہے اور عورتوں کا رب بھی۔ اور آپ مردوں کے پیغمبر بھی ہیں اور عورتوں کے پیغمبر بھی۔ اللہ نے مردوں کے لئے جہاد لکھا ہے۔ اگر وہ جہاد کریں تو اجر پائیں اور اگر شہید ہو جائیں تو وہ اپنے رب کے پاس زندہ رہیں اور رزق پائیں۔ پھر عورتوں کے لئے اس عمل کے برابر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ان کا عمل یہ ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی اطاعت کریں اور ان کے حقوق کو پہچانیں۔ لیکن تم میں بہت کم عورتیں ہیں جو ایسا کرتی ہیں۔

جنگ کے میدان میں لڑنا وہ کام ہے جو آدمی کو فوراً نمایاں کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس گھر کی چہار دیواری کے اندر روزمرّہ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنا ایک ایسا کام ہے جو کسی کے لئے شہرت کا باعث نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ پہلے کام کی طرف فوراً راغب ہو جاتے ہیں، مگر دوسرے کام میں وہ

اپنے آپ کو وقف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

کمزوری کی یہ قسم عورتوں میں بھی پائی جاتی ہے اور مردوں میں بھی۔ لوگ 'پرعظمت کاموں کی طرف دوڑتے ہیں۔ وہ اونچے اونچے منصوبوں پر تقریریں کرتے ہیں۔ مگر وہ کام جو بظاہر چھوٹے نظر آئیں، جن میں شہرت وعظمت کی چاشنی نہ ہو، ان کے بارہ میں وہ بے رغبت بنے رہتے ہیں۔ حالاں کہ اصل کام یہ ہے کہ آدمی اپنی قریبی ذمہ داری کو ادا کرے، خواہ وہ بظاہر کتنی ہی معمولی کیوں نہ دکھائی دیتی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے دو بڑے محاذ ہیں۔ ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ دونوں یکساں طور پر اہم ہیں۔ ان میں سے کوئی نہ کم ہے اور نہ زیادہ، نہ کوئی افضل ہے اور نہ کوئی غیر افضل۔ زندگی کی صحت مند تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ دونوں محاذوں پر حسن خوبی کے ساتھ عمل کیا جائے۔

خالق نے اسی تخلیقی نقشہ کے مطابق مرد کو خارجی کام کے لئے پیدا کیا ہے اور عورت کو داخلی کام کے لئے۔ خالق نے مرد کو وہ صفات دی ہیں جن کے ذریعہ وہ خارجی کام کو بہتر طور پر انجام دے۔ اسی طرح خالق نے عورت کو وہ مخصوص صفات دی ہیں جو داخلی کام کو بہتر طور پر انجام دینے کے لئے ضروری ہیں۔ جس طرح عمل میں تقسیم کا اصول ہے اسی طرح دونوں جنسوں کی فطری صلاحیت میں بھی تقسیم کے اصول کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

عمل میں تقسیم کا یہ اصول خود خالقِ فطرت نے قائم کیا ہے۔ وہ کسی سماج کا عائد کیا ہوا نہیں۔ ایسی حالت میں تقسیم کے اس نقشہ کو توڑنا سادہ طور پر صرف کسی سماجی روایت کو توڑنا نہیں ہے۔ وہ خود فطرت کے نقشہ کو توڑنا ہے۔ اور فطرت کے نقشہ کو توڑنے کی طاقت کسی میں بھی نہیں۔

ایسی حالت میں ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ فطرت کے نقشہ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے مطابق سماج کا نظام بنائیں، یعنی وہی اصول جس کو ہم نے اپنے دوسرے معاملات میں ہمیشہ سے اختیار کر رکھا ہے۔

نکاح کا معاملہ

عام طور پر مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی (نکاح میری سنت سے ہے، پس جو شخص میری سنت سے انحراف کرے تو وہ مجھ سے نہیں) یہ پورا جملہ اس صورت میں حدیث نہیں ہے۔ ابن ماجہ (کتاب النکاح) کی روایت کے مطابق، حدیث کے اصل الفاظ صرف یہ ہیں: النکاح من سنتی۔

البتہ ایک اور روایت میں بقیہ الفاظ آئے ہیں۔ ایک تفصیلی روایت میں آیا ہے کہ تین صحابیؓ نے آپ کی عبادات کے بارے میں حضرت عائشہ سے پوچھا۔ حضرت عائشہ نے آپ کی عبادات کے بارے میں جو بتایا وہ انہیں کم دکھائی دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ کے برابر نہیں اس لئے ہمیں زیادہ عمل کرنا چاہئے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ساری رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ کے لئے ازدواجی زندگی کو ترک کردوں گا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔ لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور عورتوں سے ازدواجی تعلق بھی قائم کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔ (فتح الباری ۶/۹)

جیسا کہ متن سے واضح ہے، حدیث میں فمن رغب عن سنتي کا تعلق تمام شرعی اعمال سے ہے نہ کہ مخصوص طور پر نکاح سے۔ دوسری بات یہ کہ اس حدیث کا تعلق سادہ طور پر صرف نکاح نہ کرنے سے نہیں ہے۔ بلکہ اعتقادی طور پر نکاح کو قابل ترک سمجھنے سے ہے۔ (فتح الباری ۸/۹)

اصل یہ ہے کہ نکاح کی حیثیت نماز کی طرح کسی لازمی فریضہ کی نہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ جو شخص نکاح نہ کرے وہ تارک صلاۃ کی طرح گنہگار ہو جائے۔ یا اس کا ایمان مکمل نہ ہو۔ اس معاملہ میں اصل مطلوب چیز باعفت زندگی ہے نہ کہ ہر حال میں اور لازمی طور پر نکاح کرنا۔ کوئی گروہ اگر اجتماعی طور پر نکاح کا طریقہ چھوڑ دے تو یہ یقیناً درست نہ ہوگا کیوں کہ ایسی صورت میں بقاء نسل خطرہ میں پڑ جائے گی۔ لیکن اگر

انفرادی طور پر کوئی شخص اپنے حالات کے اعتبار سے نکاح نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو ایسا کرنا اس کے لئے عین جائز ہو گا، بشرطیکہ وہ اپنی عفت کو محفوظ رکھے۔

تاریخ میں بہت سی ایسی دینی شخصیتیں پائی جاتی ہیں جنہوں نے نکاح نہیں کیا اور پوری زندگی غیر ازدواجی حالت میں گذار دی۔ پیغمبروں میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام اس کی ایک مثال ہیں۔ امت محمدی میں بھی کئی ایسے ممتاز بزرگ پائے جاتے ہیں جنہوں نے ساری عمر نکاح نہیں کیا، مثال کے طور پر امام نووی (وفات ۶۷۶) اور امام ابن تیمیہ (وفات ۷۲۸)۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں سید جمال الدین افغانی، وغیرہ۔ اگر نکاح مطلق طور پر مطلوب ہوتا اور نکاح سے اعراض دین سے اعراض کے ہم معنی ہوتا تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ مذکورہ قسم کی شخصیتیں نکاح کے بغیر زندگی گذاریں اور اسی حال میں دنیا سے چلی جائیں۔

فقہ کی زبان میں، نکاح حسن لذاتہ نہیں ہے بلکہ حسن لغیرہ ہے۔ یعنی وہ بذات خود مطلوب نہیں ہے بلکہ ایک اور ضرورت کے تحت مطلوب ہے اور وہ بقاء نسل ہے۔ چونکہ مرد اور عورت کے درمیان ازدواجی تعلق کے بغیر نسل انسانی کا باقی رہنا ممکن نہیں اس لئے نکاح کی حیثیت ایک اجتماعی فریضہ کی ہے۔ لیکن وہ ہر فرد پر لازم نہیں۔ کوئی فرد اگر اپنے ذاتی مصالح کی بنا پر غیر ازدواجی زندگی گذارنے کا فیصلہ کرے تو ایسا کرنا اس کے لئے عین جائز ہو گا۔ ایسی حالت میں شریعت اس سے پاکدامنی کا تقاضا کرے گی نہ کہ جبری ازدواج کا۔

نکاح کی دینی اہمیت اصلاً اس اعتبار سے ہے کہ وہ بقاء نسل کے مقصد کو حاصل کرنے کا جائز طریقہ ہے۔ مرد اور عورت اگر نکاح کے بغیر باہم ملیں تو اس کے ذریعہ سے بھی نسل انسانی کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ مگر یہ طریقہ اسلام میں قطعی طور پر حرام ہے۔ اسلام میں بقاء نسل مطلوب ہے مگر یہ بقاء نسل نکاح کی صورت میں ہونا چاہئے نہ کہ اس کے بغیر۔

بعض افراد ایسے ہو سکتے ہیں جو یہ محسوس کریں کہ اگر وہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے اپنے کو آزاد رکھیں تو وہ عفیف بھی رہیں گے اور اسی کے ساتھ اعلیٰ انسانی مقاصد کے لئے زیادہ خدمات انجام دے سکیں گے۔ ان افراد کے لئے ایسا کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مخصوص حالات میں باعث ثواب بھی ہے۔

صحابی کا عمل

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ یہاں ہم بخاری اور ترمذی کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

عن ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ قال۔ لقد نفعنی اللہُ بکلمۃ سمعتُھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایامَ الجمل بعدما کدتُ اَن الحقَ باصحاب الجمل فاُقاتِلَ معھم۔ قال لمّا بلغَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَنّ اھلَ فارسَ مَلّکوا علیھم بنت کسریٰ قال: لن یُفلحَ قوم ولّوا امرھم امرأۃً (رواہ البخاری)

وفی روایۃ الترمذی قال: عَصَمَنی اللہ عزوجل بشیءٍ سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ لما ھلك کسریٰ قال من استخلفوا۔ قالوا ابنتَہٗ۔ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لن یُفلِحَ قومٌ ولّوا امرھُم امرأۃً فلما قدمتْ عائشۃ، یعنی البصرۃ، ذکرتُ قولَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعَصَمَنِیَ اللہُ بہ۔

حضرت ابو بکرہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایک قول کے ذریعہ مجھ کو جنگ جمل کے زمانہ میں فائدہ پہونچایا۔ قریب تھا کہ میں اصحاب جمل سے مل جاؤں اور ان کے ساتھ جنگ کروں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچی کہ اہل فارس نے اپنے اوپر کسریٰ کی لڑکی کو حاکم بنایا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو عورت کو اپنے معاملہ کا حاکم بنائے۔

ترمذی کی روایت کے مطابق انھوں نے کہا کہ اللہ نے مجھے ایک چیز کے ذریعہ بچا لیا جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ جب کسریٰ کی موت ہوئی تو آپ نے پوچھا کہ انھوں نے کس کو اس کا جانشین بنایا۔ لوگوں نے کہا کہ اس کی لڑکی کو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو عورت کو اپنے معاملہ کا حاکم بنائے۔ راوی کہتے ہیں کہ جب عائشہ بصرہ آئیں تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو یاد کیا تو اللہ نے اس کے ذریعہ سے مجھ کو بچا لیا۔

حضرت عائشہ کی حیثیت ام المومنین کی تھی۔ اس کے باوجود جب عائشہ کی بات اور رسول کی بات میں ٹکراؤ ہوا تو صحابی نے عائشہ کو چھوڑ کر رسول کی بات کو پکڑ لیا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے "اکابر" کا ساتھ دیتے ہیں، خواہ ان کے اکابر کی روش قرآن وسنت کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہو۔

قولِ خیر

روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مرد یا عورت اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ وہ بہتر بات بولے ورنہ چپ رہے۔ من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلیقل خیرا او لیصمت (فتح الباری ۱۰/۴۶۰)

ابن حجر العسقلانی نے اس کی شرح کے تحت لکھا ہے کہ یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ کیونکہ وہ خیر وشر کے تمام پہلوؤں کے بارہ میں نہایت جامع رہنمائی دے رہی ہے (صفحہ ۴۶۱) اس حدیث رسول پر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو اس سے کلام کے تین درجے معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ معاملہ کے صرف مثبت پہلو کو بیان کیا جائے تاکہ لوگوں کو حوصلہ ملے۔

۲۔ منفی پہلو کا ذکر ہو تو اسی کے ساتھ مثبت پہلو کی نشان دہی بھی ضرور کی جائے۔

۳۔ جس آدمی کے پاس کہنے کے لئے صرف منفی پہلو ہو اس کو خاموشی اختیار کرنا چاہئے۔

اللہ پر ایمان آدمی سے کبر کا جذبہ چھین لیتا ہے۔ وہ سراپا تواضع میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ خدا ہی سب کچھ ہے اس کے مقابلہ میں میری کچھ حیثیت نہیں۔ اس طرح آخرت پر ایمان اس کے اندر محاسبہ خویش کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ موت سے پہلے خود ہی اپنے قول وعمل کی نگرانی کرنے لگتا ہے تاکہ وہ موت کے بعد کی سخت تر پکڑ سے بچ سکے۔

اللہ اور آخرت پر ایمان آدمی کو آخری حد تک سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ اور جو اپنی فکر میں پوری طرح سنجیدہ ہو جائے تو وہ بولے گا تو درست بات بولے گا ورنہ خاموش رہے گا۔

جس طرح بولنا ایک کام ہے اسی طرح چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ قول اگر ایک عمل ہے تو خاموشی بھی اسی طرح یکساں درجہ کا ایک عمل ہے۔ سچا انسان وہ ہے جو یہ جانے کہ کب بولنا ہے اور وہ کون سا موقع ہے جب کہ اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان بند کر لے۔ جو آدمی اس فرق کو نہ جانے وہ یا تو غیر سنجیدہ ہے یا غیر دانش مند۔

رسول کی سنت

عن عائشة ، قالت : ماخُیر رسول الله ﷺ بین امرین قطُ الا اخذ ایسر هما مالم یکن اثما، فان کا ن اثما کان ابعد الناس منه (متفق علیہ)

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کو اختیار کرتے جب تک کہ وہ گناہ نہ ہو۔ پس اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ سب سے زیادہ اس سے دور رہنے والے تھے۔

اس حدیث میں ''ایسر'' کا لفظ سادہ طور پر محض سہل کے معنی میں نہیں ہے۔ آپ کے حالات بتاتے ہیں کہ آپ سہولت پسندی سے بہت دور تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی قربانی اور جفاکشی کی اعلیٰ سطح پر گزاری۔ ایسی حالت میں اس حدیث کو سہولت پسندی کے معنی میں کیسے لیا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں ''ایسر'' کا لفظ زیادہ قابل عمل کے معنی میں ہے۔ حضرت عائشہ کی یہ روایت بتاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ممکن دائرہ میں کوشش کرنے کا تھا نہ کہ غیر ممکن دائرہ میں غیر ضروری طور پر اپنے وقت اور اپنی قوت کو ضائع کرنے کا۔

زندگی میں ہمیشہ دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک ہے ممکن سے آغاز، اور دوسرا ہے ناممکن سے آغاز۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ناممکن کو چھوڑ کر ممکن میں اپنی قوت صرف فرماتے تھے۔

مکہ کے ابتدائی سالوں میں ایک طریقہ کھلم کھلا تبلیغ کا تھا اور دوسرا خفیہ تبلیغ کا۔ آپ نے تین سال تک کھلم کھلا تبلیغ کو چھوڑ کر خفیہ تبلیغ کا طریقہ اختیار فرمایا۔ مکہ میں جب لوگوں نے مخالفت اور ایذا رسانی شروع کی تو ایک طریقہ جوابی کارروائی کا تھا اور دوسرا اعراض کا۔ آپ نے جوابی کارروائی کا طریقہ چھوڑ کر اعراض کا طریقہ اختیار فرمایا۔ مکی دور کے آخر میں لوگ آپ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ اب ایک طریقہ ان سے لڑنے کا تھا اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ مکہ کو چھوڑ دیا جائے۔ آپ نے لڑائی کو چھوڑ کر مکہ سے چلے جانے کا طریقہ اختیار فرمایا۔ ہجرت کے بعد آپ کے سامنے ایک طریقہ جنگ کو جاری

رکھنے کا تھا اور دوسرا طریقہ صلح کر لینے کا۔ آپ نے جنگ کے طریقہ کو چھوڑ کر یک طرفہ شرائط پر صلح کر لینے کا طریقہ اختیار فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں جو کامیابیاں حاصل کیں وہ اسی اصول کے ذریعہ حاصل کیں۔ آئندہ بھی جو لوگ کوئی کامیابی حاصل کرنا چاہیں انھیں بھی اسی سنت رسول کی پیروی کرنا چاہئے۔ اس کے سوا اس دنیا میں کامیابی کا کوئی اور طریقہ نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جب مکہ میں مخالفین سے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر ہجرت کا طریقہ اختیار فرمایا تو یہ اختیار ایسر کی ایک نہایت واضح مثال تھی۔ اس وقت آپ کے سامنے دو صورتیں تھیں۔ ایک تھی—— مکہ میں رہ کر اپنے دعوتی کام کو جاری رکھنا۔ اور دوسری صورت تھی—— مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جانا۔ پہلی صورت کا انتخاب گویا مشکل کا انتخاب (اختیار اعسر) کے ہم معنی تھا۔ اور دوسری صورت کا انتخاب آسان کا انتخاب (اختیار ایسر) کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ نے مشکل کو چھوڑ کر آسان کو اختیار فرمایا۔

اس اصول کو دوسرے لفظوں میں حکیمانہ تدبیر بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا کہ اسلامی دعوت کا کام بلا روک ٹوک جاری رہے۔ جب کہ اگر آپ پہلی صورت کا انتخاب فرماتے تو دعوت کا کام شاید معطل ہو جاتا۔ دعوت کے بجائے جنگ اور ٹکراؤ کا عمل شروع ہو جاتا۔ مشکل کا انتخاب صرف اس وقت کیا جائے گا جب کہ کوئی دوسرا چوائس نہ ہو۔ لیکن اگر مشکل اور آسان میں سے ایک لینا ہو تو مشکل کو چھوڑ کر آسان کو اختیار کیا جائے گا۔

کسی منصوبہ کی تکمیل کے لئے مذکورہ حکیمانہ تدبیر انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اگر اس حکمت کا لحاظ نہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ قربانیوں کی تاریخ بن جائے، مگر مثبت تعمیر کی تاریخ کبھی نہیں بن سکتی۔

اقتصادیات

خود کفیل زندگی

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان من الذنوب ذنوبا لا تکفرھا الصلاۃ ولا الصیام ولا الحج ولا العمرۃ ولکن یکفرھا الھم فی طلب المعیشۃ (رواہ ابن عساکر وابونعیم فی الحلیۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہوں میں کچھ گناہ ایسے ہیں جن کو نماز اور روزہ اور حج اور عمرہ دور نہیں کرتے ان کو دور کرنے والی چیز معاش کے حصول کی فکر کرنا ہے۔

اس حدیث میں گناہ سے مراد وہ نفسیاتی کمزوریاں ہیں جو اکثر معاشی ذرائع کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً بخل، حسد، تنگ ظرفی، وعدہ خلافی وغیرہ۔ انسانوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو حالات سے بے نیاز ہو کر اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دے سکیں۔ مگر ایسے لوگ ہمیشہ بہت کم پائے گئے ہیں۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ مال ان کے لئے اخلاقی مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ان کے پاس مال ہو تو وہ فیاضی کا ثبوت دیں گے اور اپنی مالی ذمہ داریوں کو بخوبی طور پر ادا کریں گے لیکن اگر وہ مال سے خالی ہو جائیں تو ان کا دل چھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ تعلقات میں اعلیٰ ظرفی کا ثبوت نہیں دے پاتے۔ ان کے ذمہ لوگوں کے جو مالی حقوق ہوں ان کی ادائگی میں ان سے کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔

کوئی شخص اپنے اندر اس قسم کی کمی پائے تو وہ روزہ اور نماز کی زیادتی سے اس کو ختم نہیں کر سکتا۔

ایک شخص جو مالی مشکلات سے دوچار ہو اس کے اندر چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ چڑچڑا پن ایک ایسی اخلاقی کمزوری ہے جو بہت سی دوسری اخلاقی کمزوریوں کو جنم دیتی ہے۔ اس لئے جب آدمی اپنے اندر اس قسم کی کیفیت محسوس کرے تو اس کو چاہئے کہ اللہ کے بھروسہ پر معاش کے حصول کی جدوجہد میں لگ جائے۔ معاشی فراغت حاصل ہوتے ہی اس کا چڑچڑا پن خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح جو شخص مالی مشکلات میں مبتلا ہو اس کے اندر پست ہمتی آجاتی ہے اور پست ہمتی بہت سی دوسری خرابیاں پیدا کرتی ہے۔ اس لئے جب آدمی اپنے اندر اس قسم کی علامت دیکھے تو اس کو چاہئے کہ معاش کی جدوجہد میں اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دے۔ معاش کے حصول کے بعد خود بخود ایسا ہوگا کہ اس کا پستی کا مزاج جاتا رہے گا۔ اسی طرح جو شخص مال کی کمی کے مسئلہ سے دوچار ہو اس کے اندر "دینے" سے زیادہ "لینے" کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے جو بہت سی دوسری خرابیوں کو اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس لئے جو شخص اپنے اندر اس قسم کی کمزوری دیکھے وہ اپنے کو اس قابل بنانے کی کوشش شروع کر دے کہ وہ لوگوں سے لئے بغیر اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ جب ایسا ہوگا تو خود بخود اس کی اصلاح ہو جائے گی۔

محنت کی روزی

صحیح البخاری، کتاب البیوع (باب کسبِ الرجلِ وعملہ بیدہ) کے تحت چند حدیثیں منقول ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث یہ ہے جس کو امام بخاری نے مِقدام رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے درج کیا ہے:

ما اکل احد طعاماً قطّ خیراً من ان یأکل من عمل یدہ وَاِنّ نبی اللّٰہ داؤد علیہ السلام کان یاکلُ مِن عَملِ یدہٖ

کسی آدمی نے کبھی اس سے اچھا کھانا نہیں کھایا کہ وہ اپنے ہاتھ کی کمائی کھائے۔ اور اللہ کے رسول داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔

"ہاتھ کی کمائی" سے مراد اپنی محنت کی کمائی ہے۔ اور محنت کی کمائی بلاشبہ تمام کمائیوں میں سب سے اچھی کمائی ہے۔ محنت کی کمائی اور بے محنت کی کمائی میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ اس کو انسانی زبان میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

بے محنت کمائی کیا ہے۔ مثلاً آپ کے والد آپ کے لئے بہت سی عمارتیں چھوڑ گئے ہیں جن کے کرایہ پر آپ آرام سے رہ رہے ہیں۔ بنک میں آپ کی کوئی بڑی رقم جمع ہے جس کا انٹرسٹ ہی آپ کے ماہانہ خرچ کے لئے کافی ہوجاتا ہے۔ آپ کو اتفاق سے کوئی ایسی گدی مل گئی ہے جس میں چندے، ہدیے اور تحفے تحائف آتے رہتے ہیں اور لوگ خود آکر آپ کو نذرانہ پیش کرتے رہتے۔ پٹرو ڈالر کا کوئی دہانہ آپ کو مل گیا ہے اور صرف کچھ خوبصورت الفاظ بول کر آپ بڑی بڑی رقمیں حاصل کر لیتے ہیں۔

اس قسم کی تمام کمائی بے محنت کی کمائی ہے۔ ایسی کمائی آدمی کے بدن کو تو موٹا کرتی ہے مگر اس کی روح کے لئے وہ قاتل ہے۔ ایسی ہر کمائی آدمی کی شخصیت کے ارتقاء کے لئے مستقل رکاوٹ ہے۔ ایسے آدمی میں اور خوبصورت حیوان میں کوئی فرق نہیں۔

محنت کی کمائی وہ ہے جس کے لئے آپ کو خود سوچنا پڑے۔ جس میں نفع کے ساتھ گھاٹے کا بھی اندیشہ ہو۔ جس کا حصول تمام تر آپ کی ذاتی جدوجہد پر منحصر ہو۔

ایک ہے دوسرے کی کمائی پر جینا۔ دوسرا ہے خود اپنی کمائی پر جینا۔ حدیث میں دوسرے کی کمائی پر جینے کو کمتر ذریعہ بتایا گیا ہے۔ زیادہ بہتر اور اعلیٰ ذریعہ یہ ہے کہ آدمی خود اپنی محنت کی کمائی پر جئے۔

توکل کی حقیقت

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپؐ سے توکل علی اللہ کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، میں اپنے اونٹ کو باندھوں اور پھر خدا پر توکل کروں یا اونٹ کو چھوڑ دوں اور پھر توکل کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اونٹ کو باندھو اور پھر خدا پر توکل کرو (یا رسول اللہ اعقلها و أتوکل أو اطلقها و أتوکل قال اعقلها وتوکل) الترمذی

یہاں یہ سوال ہے کہ اونٹ کو باندھنے کے بعد توکل کیوں۔ بظاہر توکل یہ ہونا چاہیے کہ آدمی اپنے معاملے کی تدبیر نہ کرے، اور یہ بھروسہ رکھے کہ خدا اس کے معاملے کو درست کر دے گا۔ جب آدمی خود ہی اپنے معاملے کی پوری تدبیر کر رہا ہو تو ایسی حالت میں بظاہر خدا پر بھروسہ ایک غیر ضروری امر دکھائی دیتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی کام کی تکمیل کے لیے ہمیشہ دو طرح کے عوامل ہوتے ہیں۔ ایک معلوم عوامل جو انسان کے اپنے بس میں ہوتے ہیں۔ دوسرے، غیر معلوم عوامل، جن کو انسان نہ جانتا ہے اور نہ ان کا اہتمام کر سکتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی واقعہ ہمیشہ ان دونوں قسم کے اسباب کی یکجائی اور موافقت سے انجام پاتا ہے — اگر ایک نوعیت کے عوامل موجود ہوں اور دوسری نوعیت کے عوامل موجود نہ ہوں تو اس دنیا میں کبھی کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آسکتا۔

مذکورہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے بس والے ظاہری اسباب کو استعمال کرنے میں کمی نہ کرے، وہ اپنی سمجھ اور اپنی طاقت کے مطابق اس کا پورا اہتمام کرے۔ اس اہتمام کے بعد وہ دعا کرے کہ خدایا، جو کچھ میرے بس میں تھا وہ میں نے کر دیا۔ اب جو کچھ میرے بس میں نہیں ہے ان کے لیے تو میری طرف سے کافی ہو جا، بقیہ اسباب جو تیرے اختیار میں ہیں ان کو بھی تو میری موافقت میں جمع کر دے۔ یہی مطلب ہے اس اسلامی مقولہ کا کہ —— (السعی منّی والاتمام من اللہ (کوشش میری طرف سے، اور اس کو تکمیل تک پہنچانا خدا کی طرف سے)

آدمی خواہ کتنا ہی کوشش کرے پھر بھی کچھ اسباب اس کے دائرہ سے باہر رہتے ہیں۔ آدمی اپنی کوشش میں صرف اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ یہ بقیہ اسباب خدا کی مدد سے اس کے موافق ہو جائیں۔

دولت کی بجلی

ایک شخص معمولی حیثیت کا تھا۔ پھر وہ ترقی کرکے دولت مند بن گیا۔ جب وہ معمولی حیثیت کا تھا تو زیادہ خوش رہتا تھا۔ دولت آنے کے بعد وہ پریشان رہنے لگا۔ اس کے ایک پرانے دوست نے پوچھا، یہ تمہارا کیا حال ہوگیا ہے۔ پہلے تم ہنستے بولتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ کافی وقت گزارتے تھے۔ اب تم اداس نظر آنے لگے ہو۔ اس نے جواب دیا "میرے اوپر دولت کی بجلی گر ہی ہے" دولت نے مجھ کو نئے نئے مسائل میں الجھا دیا ہے۔ پہلے ہمارے بچے ہمارے پاس تھے، ہم ان کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آج ہر بچہ ہم سے دور ہے۔ کوئی یورپ، امریکہ پڑھنے گیا ہوا ہے۔ کوئی دور کے کسی مقام پر ملازم ہے۔ جن بچوں کو پہلے ہم میاں بیوی دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آج ہم ان کے سایہ کے لیے بھی ترستے ہیں۔ بھیڑوں کا فارم ہے تو خیال لگا ہوا ہے کہ اتنی قیمتی بھیڑیں ہیں، پتہ نہیں ان کا کیا ہوا۔ ٹرک چل رہے ہیں تو اس کی فکر ہے کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہوگیا ہو۔ دکانیں ہیں تو ان کی پریشانی کہ ملازم کہیں گڑبڑ نہ کر رہے ہوں۔ غرض جتنی زیادہ دولت ہے اتنی ہی زیادہ فکر ہے۔ سیل ٹیکس، انکم ٹیکس اور طرح طرح کے قانونی جھگڑے اس کے علاوہ ہیں۔ زندگی لطف سے خالی ہو کر بس مسائل اور پیچیدگیوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ جو دولت آدمی کو سکون نہ دے بلکہ بے چین کر دے اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ —— وہ ایک بجلی ہے جو آدمی کے اوپر گر پڑی ہے۔

دولت کو صرف اپنی ذات پر خرچ کیا جائے تو وہ عذاب ہے مگر اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جائے تو وہ نعمت بن جائے گی:

عن ابی ذرؓ قال انتهيتُ الى النبی صلی اللہ علیه وسلم وهو جالس فی ظلّ الكعبة فلمّا رآنی قال: هم الاخسرون ورب الكعبة. فقلتُ فداك ابی واُمّی من هم۔ قال هم الاكثرون اموالاً اِلّا من، قال: هٰكذا وهٰكذا۔ من بين يديه ومن خلفه وعن يمينه وعن شماله وقليلٌ ما هم۔ (متفق علیه)

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ اس وقت کعبہ کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے جب مجھ کو دیکھا تو فرمایا کہ کعبہ کے رب کی قسم، وہ لوگ گھاٹے میں ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے باپ اور ماں آپ پر فدا ہوں، وہ کون لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ زیادہ مال والے، سوا اس کے جس کو مال ملے تو وہ اپنے آگے اور پیچھے، اپنے دائیں اور بائیں اس کو خرچ کرے۔ اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

مانگنا

جاء رجل من الانصار الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسألہ فقال النبی اما فی بیتك شئ قال بلیٰ، جلس (ای کساء غلیظ) نلبس بعضہ ونبسط بعضہ وقعب نشرب فیہ الماء۔ قال الرسول أئتنی بہما۔ فاتاہ بہما۔ فاخذ الرسول بیدہ وقال من یشتری ہٰذین۔قال رجل انا أخذہما بدرہم قال رسول اللہ من یزید علیٰ درہم۔قال رجل انا أخذہما بدرہمین۔فاعطاہما ایاہ واخذ الدرہمین فاعطاہما الانصاری وقال اشتر باحدہما طعاماً فانبذہ الی اہلك واشتر بالأخر قدوماً وائتنی بہ۔فاتاہ بہ فشد الرسول فیہ عوداً بیدہ ثم قال اذہب فلتحتطب وبع ولا ارینك خمسة عشر یوماً۔ ففعل وجاء وقد اصاب عشرة دراہم فاشتریٰ ببعضہما ثوباً وببعضہما طعاماً۔ فقال رسول اللہ، ہٰذا خیرلك من ان تجئ المسألة نکتة فی وجہك یوم القیامة۔

انصار میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور سوال کیا۔آپ نے فرمایا کیا تمہارے گھر میں کچھ نہیں۔اس نے کہا ہاں، ایک موٹا کپڑا ہے جس کا کچھ حصہ ہم اوڑھتے ہیں اور کچھ حصہ بچھاتے ہیں اور ایک بڑا پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں۔آپ نے فرمایا کہ دونوں چیزیں میرے پاس لے آؤ۔ وہ لے آیا۔آپ نے ان کو اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا کہ کون شخص ان دونوں کو خریدتا ہے۔ایک شخص نے کہا کہ میں ان کو ایک درہم میں خریدتا ہوں۔آپ نے فرمایا کہ کون ایک درہم پر اضافہ کرتا ہے۔ایک شخص نے کہا کہ میں ان کو دو درہم میں لیتا ہوں۔آپ نے دونوں چیزیں اسے دے دیں اور اس سے دو درہم لے کر انصاری کو دے دیا اور فرمایا کہ ان میں سے ایک درہم سے کھانے کی چیز خریدو اور اسے اپنے گھر والوں کو دیدو اور دوسرے درہم سے کلہاڑی خریدو اور اس کو میرے پاس لے آؤ۔ وہ آدمی کلہاڑی لے کر آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے اس میں لکڑی کا دستہ لگایا پھر فرمایا کہ جاؤ اور لکڑی کاٹو اور بیچو اور میں تم کو پندرہ دن تک نہ دیکھوں۔آدمی نے ایسا ہی کیا۔پھر وہ آیا اور اس نے دس درہم کمایا تھا۔اس نے اس کے ایک حصہ سے کپڑا خریدا اور ایک حصہ سے خوراک خریدی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہارے لئے اس سے بہتر ہے کہ تم سوال کرو اور قیامت کے دن اپنے چہرہ پر ایک داغ لے کر آؤ۔

عن ثوبان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تکفّل لی ان لایسئل الناس شیأً وأتکفّل لہ بالجنة فقلت انا۔ فکان لا یسئل احداً شیأً (ابوداؤد)

حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون ہے جو مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگے گا اور میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں۔ پس حضرت ثوبان کا یہ حال ہوا کہ وہ کسی سے کوئی چیز نہیں مانگتے تھے۔

اس قسم کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "سوال" اسلامی روح کے سراسر خلاف ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی محنت پر بھروسہ کرے نہ کہ وہ دوسروں سے مانگنے لگے۔ حتی کہ گھر کا اثاثہ بیچ کر محنت کے میدان میں داخل ہونا پڑے تو یہ بھی آدمی کو کرنا چاہئے۔

سوال سے پرہیز کا حکم جو فرد کو دیا گیا ہے وہی جماعت کے لئے بھی ہے۔ مسلمانوں کی ایسی کوئی قومی پالیسی جس کی بنیاد مانگ اور مطالبہ پر رکھی جائے وہ سراسر غیر اسلامی قرار پائے گی۔ مسلمانوں کو جس طرح اپنی انفرادی زندگی میں مانگنے کے بجائے محنت کرنے پر بھروسہ کرنا ہے اسی طرح اجتماعی زندگی میں بھی انھیں یہ کرنا ہے کہ خود اپنے وسائل کی بنیاد پر اپنا قومی منصوبہ بنائیں۔ دوسروں سے مانگنے کے بجائے خود کر کے حاصل کرنے کا طریقہ اختیار کریں۔

ہر وہ قومی پالیسی باطل ہے جس کی بنیاد "مطالبات" پر رکھی گئی ہو۔ کوئی بھی عذر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان جدوجہد کا طریقہ چھوڑ کر مطالبات کا طریقہ اختیار کر لیں۔ مسلمان اگر ایسا کریں کہ وہ اپنی قومی پالیسی مطالبات کی بنیاد پر بنائیں تو یہ خدا اور رسول کے طریقہ کے سراسر خلاف ہوگا۔ مطالباتی سیاست بلاشبہ غیر مسنون سیاست ہے۔ مسلمان چھوٹے چھوٹے معاملہ میں مسنون اور غیر مسنون کا فرق جانتے ہیں اور اس کا زبردست اہتمام کرتے ہیں۔ مگر بڑے بڑے معاملات میں انھوں نے اپنی پوری قومی سیاست کو غیر مسنون طریقہ پر چلا رکھا ہے اور انھیں اس کا احساس تک نہیں۔

ایک اور عمل

علیہ بن زید ایک غریب صحابی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کا ارادہ فرمایا تو لوگوں سے تیاری کے لئے کہا۔ علیہ بن زید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ میرے لئے سواری کا انتظام کردیں تا کہ میں بھی اس مہم میں شرکت کرسکوں۔ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس مزید سواری یا مال نہیں ہے جس سے میں تمہاری مدد کروں۔

علیہ بن زید اپنے گھر کی طرف لوٹے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان کا دل اس احساس سے بے قرار تھا کہ کاش میرے پاس سواری اور زاد راہ ہوتا تو میں بھی اس اسلامی عمل میں شرکت کرتا۔ اس دن وہ ساری رات نماز پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ اس وقت ان کی زبان سے یہ دعا نکلی: اے اللہ تو نے جہاد کا حکم دیا ہے۔ مگر تو نے مجھے وہ سامان نہیں دیا جس کے ذریعہ میں جہاد میں شرکت کرسکوں۔ میں صدقہ جہاد پر قادر نہیں۔ اب جس مسلمان نے بھی مال یا جسم یا آبرو کے مقابلہ میں مجھ پر کوئی زیادتی کی ہو تو میں اس کو اسی مسلمان کے اوپر صدقہ کرتا ہوں۔

ایک اور حدیث (التفسیر المظہری ۴/۲۸۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ صحابی کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا اور بقیہ صحابہ کے ساتھ شریک جہاد نہ ہونے کے باوجود وہ جہاد کے انعام کے مستحق قرار پائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مومن اگر معذوری کے سبب سے عملاً کسی کارِ خیر میں شریک نہ ہوسکے تو اس کے بعد بھی اس کے لیے شرکت کا موقع ہے اور وہ یہ کہ اپنی روح کی تڑپ اور اپنے دل کی کیفیات کے ساتھ وہ اس میں شریک ہو جائے، وہ دعاؤں اور آنسوؤں کے ساتھ ان کا ہم سفر بن جائے جن کا ہم سفر وہ سواریوں کی صورت میں نہ ہوسکا تھا۔ جو صاحب ایمان ایسا کرسکے اس کے لیے خدا کے یہاں وہی ثواب ہے جو عملی طور پر شریک ہونے والوں کا ہے۔

خارجی عمل جس طرح اہم ہے اسی طرح داخلی عمل بھی اہم ہے۔ بلکہ بعض اوقات داخلی عمل خارجی عمل سے بھی زیادہ عظیم ہو جاتا ہے۔

تدبیر اور توکل

قرآن کی سورہ نمبر ۶ میں ارشاد ہوا ہے: وإن یمسسك الله بضر فلا كاشف له إلا هو وإن یمسسك بخیر فهو علی كل شیء قدیر (الأنعام ۱۷) یعنی اور اگر اللہ تم کو کوئی دکھ پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں۔ اور اگر اللہ تم کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

دکھ کو دور کرنے والا صرف اللہ ہے — اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر تم کسی دکھ میں مبتلا ہو تو اس سے نجات کے لیے اللہ کے فرشتوں کا انتظار کرو۔ یہ دراصل دکھ کے وقت اعتدال پر قائم رہنے کی تعلیم ہے۔ اگر کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ فوراً کانٹے کو نکالنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ فوراً دوا کا استعمال کرے۔ اعتدال کے دائرہ میں دکھ کو دور کرنے کی کوشش کرنا ایک فطری امر ہے۔ خود فطرت ہی یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ ایسے موقع پر آدمی کو فوراً ضروری تدبیر کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے۔

لیکن اگر ایسا ہو کہ اعتدال کے دائرہ میں فطری تدبیر سے مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہ آئے تو ایسی حالت میں آدمی کو اللہ سے دعا کرنا چاہیے اور اللہ سے مدد کا طالب ہونا چاہیے۔ اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ تدبیر کو ناکافی دیکھ کر وہ مایوسی کا شکار ہو یا قبروں اور درگاہوں کی طرف دوڑنے لگے یا اور کوئی ایسا اقدام کر بیٹھے جو اعتماد علی اللہ کے خلاف ہو۔ انسانی تدبیر کے بعد اللہ پر بھروسہ کرنا ہے نہ کہ کسی غیر اللہ کا سہارا ڈھونڈنا۔

اس کے بعد فرمایا کہ اور اگر اللہ تم کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس آیت میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ دنیا کی کوئی بھلائی کسی آدمی کو ملے تو وہ اس کو اپنا ذاتی کمال سمجھ کر اس پر نازاں نہ ہو۔ وہ تواضع کی روش سے نہ ہٹے۔ کیوں کہ جو کچھ اس کو ملا ہے وہ اللہ کے اِذن سے ملا ہے۔ اللہ جب چاہے، حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کرے کہ ملی ہوئی چیز اس سے چھن جائے۔

اس آیت کی مزید تشریح ایک حدیث سے ہوتی ہے۔

الترمذی نے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی سواری کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔آپ نے فرمایا کہ اے لڑکے یا اے میرے بیٹے ، کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتاؤں کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تم کو نفع پہنچائے۔میں نے کہا کہ ہاں۔آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کو یاد رکھو، اللہ تمہیں یاد رکھے گا۔تم اللہ کو یاد کرو، تم اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔تم خوش حالی میں اللہ کو نہ بھولو، وہ تم کو تنگی میں نہ بھولے گا۔ جب تم مانگو تو اللہ سے مانگو۔اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو۔ کیوں کہ جو ہونے والا ہے وہ سب لکھا جا چکا ہے۔پس اگر تمام انسان تم کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہیں جس کا فیصلہ اللہ نے تمہارے لیے نہ کیا ہو تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے۔اور اللہ کے لیے عمل کرو شکر اور یقین کے ساتھ۔اور جان لو کہ جو چیز تم کو ناپسند ہو اس پر صبر کرنے میں تمہارے لیے بہت زیادہ بھلائی ہے۔اور اللہ کی مدد صبر کے ساتھ ہے۔اور کشادگی تکلیف کے ساتھ ہے۔اور بے شک آسانی مشکل کے ساتھ ہے (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی ۵/۳۹۸)

ایمانی زندگی تدبیر کے ساتھ توکل کا نام ہے اور توکل کے ساتھ تدبیر کا۔تدبیر اگر انسانی محنت کا اظہار ہے تو توکل اللہ کے قادر مطلق ہونے کا اظہار۔قرآن میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں انسان کے ساتھ بری حالت بھی پیش آتی ہے اور اچھی حالت بھی۔اور ان دونوں ہی کا مقصد صرف ایک ہوتا ہے اور وہ آزمائش ہے (ونبلوکم بالشر والخیر فتنة) الانبیاء ۳۵۔

اس سے معلوم ہوا کہ دکھ اور سکھ اگرچہ بظاہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں مگر اللہ کے تخلیقی منصوبہ کے مطابق، دونوں کی حیثیت ایک ہے اور دونوں کا مقصد بھی ایک ہے۔اللہ کے تخلیقی منصوبہ کے مطابق، انسان کو چاہئے کہ جب اس پر دکھ کی حالت پڑے تو وہ اپنے سکھ کی حالت کو یاد کرے اور اس طرح اپنے اس اعتماد کو زندہ رکھے کہ اللہ اس کے دکھ کو سکھ میں بدلنے پر قادر ہے۔اسی طرح جب وہ زندگی میں سکھ کا تجربہ کرے تو وہ اپنے دکھ کے لمحات کو یاد کرے اور اس طرح اس حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ کرے کہ اللہ اگر چاہے تو اس سے سکھ چھین لے اور اس کو دکھ کی حالت میں مبتلا کر دے۔

تشدد کا سبب عدم قناعت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: قد افلح من أسلم ورزق کفافاً وقنعه الله بما آتاه (مسلم، کتاب الزکاۃ، الترمذی، کتاب الزہد، مسند احمد ۲/ ۱۶۸/ ۳/ ۱۷۳) یعنی وہ شخص کامیاب ہوا جو اسلام لایا اور جس کو بقدر ضرورت رزق ملا اور وہ اُس پر قانع ہوگیا جو اللہ نے اُس کو دیا۔

اس حدیث میں قناعت کا ذکر ہے۔ قناعت کی نفسیات اگر کسی کے اندر پوری طرح پیدا ہوجائے تو وہ اُس کو مکمل طور پر امن پسند بنادے گی۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے اندر قناعت کی نفسیات نہ ہو وہ اپنی حالت پر غیر مطمئن رہیں گے اور آخر کار جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو کر متشددانہ کارروائی شروع کردیں گے تاکہ جس چیز کو وہ پُر امن طور پر حاصل نہ کر سکے اُس کو وہ تشدد کی طاقت سے حاصل کرلیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قناعت سے امن کا مزاج پیدا ہوتا ہے اور عدم قناعت سے تشدد کا مزاج۔

قناعت کا جذبہ آدمی کے اندر یہ نفسیات پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک پایا ہوا انسان ہے۔ اور جو آدمی اپنے آپ کو پایا ہوا انسان سمجھے وہ کبھی جھنجھلاہٹ اور تشدد کا شکار نہیں ہوسکتا۔

اس کے برعکس معاملہ اس انسان کا ہے جو عدم قناعت کی نفسیات میں مبتلا ہو۔ وہ ہمیشہ احساس محرومی کا شکار رہے گا۔ اُس کا یہ احساس اُس کو مسلسل اُکسائے گا کہ جو کچھ اُس نے نہیں پایا اُس کو وہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اب اگر اُس نے دیکھا کہ وہ اپنی نہ پائی ہوئی چیز کو پر امن طریقہ سے حاصل نہیں کرسکتا تو وہ تشدد کے طریقوں کو استعمال کر کے اُس کو حاصل کرنا چاہے گا۔

وہ اُن تمام لوگوں کو اپنا دشمن سمجھ لے گا جن کو وہ اپنے خیال کے مطابق، اپنی خواہش کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔ وہ اُن لوگوں سے نفرت کرے گا۔ وہ اُن لوگوں کے خلاف لڑنے کے لیے ہتھیار جمع کرے گا۔ حالانکہ یہ سب نتیجہ ہوگا اس بات کا کہ وہ خدا کے دیے ہوئے پر راضی نہ ہوسکا، وہ قناعت کے بجائے عدم قناعت کا شکار ہوگیا۔

ہر حال میں خیر

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عجباً لامر المؤمن! إنّ امره کله له خير، وليس ذلك لأحد الا للمؤمن، إن أصابته سراء شكر فكان خيرا له، وإن أصابته ضراء صبر فكان خيرا له، (صحیح مسلم، کتاب الزہد) یعنی مومن کا معاملہ عجیب ہے۔ اُس کے لیے اُس کے ہر معاملہ میں بھلائی ہے۔ اور یہ مومن کے سوا کسی اور کے لیے نہیں۔ اگر اُس کو کوئی خوشی ملتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے پھر وہ خوشی اُس کے لیے بھلائی بن جاتی ہے۔ اور اگر اُس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے پھر وہ تکلیف اس کے لیے بھلائی بن جاتی ہے۔

غیر مومنانہ روش یہ ہے کہ اگر کسی آدمی کو خوشی ملے تو وہ اُس پر فخر کرے۔ اور اگر اُس کو تکلیف پہنچے تو وہ مایوسی کا شکار ہو جائے۔ یہ دونوں حالتیں یکساں طور پر بُرائی کی حالتیں ہیں۔ اس کے برعکس مومنانہ روش یہ ہے کہ آدمی کو خوشی ملے تو اُس کا سینہ شکر کے جذبہ سے بھر جائے۔ اور اگر اُس کو تکلیف کا تجربہ ہو تو وہ اُس کو اللہ کا فیصلہ سمجھ کر اُس پر راضی رہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف قرآن میں اس طرح تنبیہ کی گئی ہے: پس انسان کا حال یہ ہے کہ جب اُس کا رب اُس کو آزماتا ہے اور اُس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دی۔ اور جب وہ اُس کو آزماتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔ (الفجر ۱۵-۱۶)

موجودہ دنیا میں اصل اہمیت یہ نہیں ہے کہ آدمی نے بظاہر کس حال میں زندگی گزاری، اچھے حال میں یا بُرے حال میں۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ آدمی جس حال میں بھی ہو اُس سے وہ تعلق باللہ کی غذا لے سکے۔ زندگی کا ہر تجربہ اُس کو اللہ سے قریب کرنے والا ثابت ہو۔ اُس کی روح ہر صورتِ حال سے ربّانی غذا لیتی رہے۔ کائنات کے ہر مشاہدہ میں وہ اللہ کا جلوہ دیکھ سکے۔ زندگی کا ہر خوش گوار تجربہ اُس کو اللہ کی رحمت کی یاد دلائے، اور زندگی کا ہر تلخ تجربہ اُس کے لیے تقویٰ کا سبب بنتا رہے۔ ناکامی بھی اُس کو خدا کی یاد دلائے اور کامیابی بھی اُس کو خدا سے قریب کر دے۔

اتحاد

اختلاف کا سبب

خباب بن الارت کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار معمول کے خلاف بہت لمبی نماز پڑھی۔ صحابہ نے اس کی بابت سوال کیا تو فرمایا: یہ رغبت اور خوف کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اللہ سے تین دعائیں کیں۔ ان میں سے دو قبول ہوگئیں۔ ایک کے بارہ میں انکار کر دیا گیا۔

فرمایا: میں نے پہلی دعا یہ کی کہ میری ساری امت قحط سے ہلاک نہ ہو جائے۔ یہ قبول ہو گئی۔ دوسری دعا یہ کی کہ میری امت پر کوئی ایسا دشمن مسلط نہ ہو جو ان کو بالکل مٹا دے۔ یہ بھی قبول ہو گئی۔ تیسری دعا یہ کی کہ میری امت کے اندر آپس میں لڑائی جھگڑے نہ ہوں۔ یہ قبول نہیں ہوئی۔

اس کی تصدیق ایک اور روایت سے ہوتی ہے:

عن جابرٍ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان الشیطانَ قد اَیِسَ مِن اَن یَعبُدَہ المصلّون فی جزیرۃ العرب، ولکن فی التحریش بینہم (رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب فی الوسوسہ)

حضرت جابر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ مسلمان جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت کریں۔ لیکن مسلمانوں کے درمیان دشمنی کی آگ بھڑکانے سے (وہ مایوس نہیں ہوا ہے)

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ اندیشہ حیرت انگیز طور پر مسلمانوں کی بعد کی تاریخ میں صحیح ثابت ہوا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ نفسیات کیوں ہے کہ شیطان بہت آسانی سے ان کو باہمی جدال کے بے فائدہ مشاغل میں الجھا دیتا ہے۔

اس کی وجہ اسلام کے بجائے اپنے آپ کو برحق سمجھ لینا ہے۔ مسلمان اگر اسلام کو برحق سمجھیں تو سب کا مرکز توجہ ایک ہوتا ہے۔ یہ ذہن تمام لوگوں کو اسلام پر متحد کر دیتا ہے۔ مگر دورِ زوال میں یہ ہوتا ہے کہ ہر مسلمان اپنے آپ کو برحق سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مرکز تقسیم ہوتا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مسلمان اسلام کو سچا سمجھیں تو اس سے اتحاد پیدا ہوتا ہے، اور اگر وہ اپنے آپ کو سچا سمجھیں تو اس سے اختلاف۔

اسلامی مسلک

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں (النساء ۱) ابن کثیر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پیدائش کی اصل ایک باپ اور ایک ماں سے ہے تا کہ لوگ ایک دوسرے کی طرف مائل ہوں (ان اصل الخلق من اب واحد وام واحد لیعطف بعضھم علی بعض) تفسیر ابن کثیر ۱/۴۴۸۔

حدیث (ابوداؤد) میں یہی بات اس طرح کہی گئی ہے کہ تمام انسان یکساں طور پر اللہ کے بندے ہیں اور سب آپس میں بھائی بھائی ہیں (ان العباد کلھم اخوۃ) اسی طرح خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ تمام انسان آدمی کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے تھے (الا کلکم بنو آدم وآدم من تراب)۔ اس اسلامی اصول کے مطابق، مسلمان اور غیر مسلم سب ایک دوسرے کے لیے بھائی بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کی صحیح ترین صورت یہ ہے کہ اس کو برادرانہ بنیاد پر استوار کیا جائے۔ مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس کو ''متحدہ قومیت'' سے تعبیر کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مولانا موصوف کی کتاب، متحدہ قومیت اور اسلام، مطبوعہ ۱۹۳۸، مجلس قاسم العلوم دیوبند) مولانا حسین احمد مدنی کے ہندو مسلم اتحاد کے نقطۂ نظر کو مزید سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو، مکتوبات شیخ الاسلام، جلد اول، مکتوب ۶۳۔ صفحہ ۱۴۱۔ ۱۴۷

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان کے تقریباً تمام علماء اس مسلک پر متفق تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی بھائی کی طرح متحد کرنا چاہتے تھے۔ مگر بعض ناموافق اسباب کی بنا پر، قومی اتحاد کی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کے برعکس، دونوں فرقوں کا تعلق، تقسیم اور علاحدگی پسندی کی بنیاد پر قائم ہوگیا۔ اس تفریقی سیاست کے نہایت مہلک نتائج برآمد ہوئے۔

ملک کی تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ سیاست کا طوفان ختم ہوا مولانا ابوالکلام آزاد نے دسمبر ۱۹۴۷ میں لکھنؤ میں ایک مسلم کانفرنس کی۔ مولانا آزاد نے اس موقع پر صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

مسلمانوں کے موجودہ حالات اور ملک کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ کوئی ضروری چیز نہیں ہوسکتی کہ فرقہ واریت کو جو مذہب کے نام پر ابھاری گئی ہے، ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔ اگر ہمیں بربادی سے بچنا ہے تو فرقہ پرستی کے تمام دروازوں کو ہمیں بند کرنا پڑے گا۔ اور ہندو۔ مسلم تعلق کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی بنیاد پر قائم کرنا ہوگا۔ ضرورت ہے کہ علماء کے اس مسلک کو جو مکمل طور پر قرآن وسنت پر مبنی تھا، اس کو دوبارہ پوری طاقت کے ساتھ زندہ کیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے لیے بلاشبہہ صحیح اور مفید پالیسی یہی ہے کہ اس ملک میں دونوں فرقوں کے تعلق کو اخوت اور اتحاد کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔

الرسالہ مشن پچھلے ۲۰ سال سے یہی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس مشن کو اسلام اور علماء اسلام کی مکمل تائید حاصل ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اس اصلاحی مہم کو مزید موثر اور کامیاب بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں چند بنیادی نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ احساس کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے۔ ان کے باہمی تعلق کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔ اس کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی جائے کہ دونوں فرقوں کے درمیان معتدل فضا میں برادرانہ اختلاط ہونے لگے گے۔

۲۔ مسلمان احتجاج غیر کے بجائے تعمیر ذات کو اپنی مستقل پالیسی بنائیں۔ وہ احتجاج اور مظاہرہ اور جلوس کے طریقہ کو یکسر چھوڑ دیں۔ شکایت کے مواقع پر وہ ٹکراؤ سے بچیں اور ہمیشہ پُر امن تدبیر کے ذریعہ نزاعی معاملات کو طے کرنے کی کوشش کریں۔ نزاع کے موقع پر ٹکراؤ کا طریقہ نزاع کو بڑھاتا ہے اور مفاہمت کا طریقہ نزاع کو ختم کر دیتا ہے۔

۳۔ تعلیم اور اقتصادیات کو سب سے زیادہ قابل توجہ چیز قرار دیا جائے۔ مسلمانوں میں تعلیم اگر عام ہو اور ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو جائے تو اس کے بعد تمام مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

۴۔ ہر مقام پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ امن کمیٹیاں بنائی جائیں۔ اس کے ذریعہ یہ کوشش ہو کہ امن اور اتحاد کو برہم کرنے والے ہر واقعہ کو ابتدا ہی میں حسن تدبیر سے ختم کر دیا جائے۔

۵۔ لوگوں میں یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا سیکھیں۔ رایوں کے فرق کے باوجود ایک دوسرے کی عزت کریں۔

محتاط روش

عن اوس بن شرحبیل انه سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: من مشی مع ظالم لیقویه و هو یعلم انه ظالم فقد خرج من الاسلام (مشکاۃ المصابیح ۱۴۲۰/۳) اوسؓ بن شرحبیل کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص ظالم کے ساتھ چلے تاکہ اس کو تقویت حاصل ہو، اور وہ جانتا ہو کہ وہ ظالم ہے، تو ایسا شخص اسلام سے نکل گیا۔

عن ابراهیم بن میسرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی هدم الاسلام (مشکاۃ ۶۶/۱) ابراہیمؒ بن میسرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بدعت والے کی توقیر کرے تو اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔

کسی آدمی کے برا آدمی ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ براہِ راست برائی میں ملوث ہو۔ مثلاً وہ خود برا کام کرے یا برا کام کرنے والے کا باقاعدہ ساتھی بن جائے۔ جو لوگ اس طرح براہِ راست انداز میں ملوث ہوں ان کا برا ہونا ایک معلوم اور مسلم بات ہے۔ تاہم اسلام کی نظر میں صرف وہی شخص برا نہیں جو ذاتی طور پر اور براہِ راست طور پر برائی میں ملوث ہو۔ اسلام کے نزدیک وہ شخص بھی یکساں طور پر برا ہے جو بالواسطہ انداز میں برائی کے عمل میں ملوث ہوتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں آدمی کا ہر عمل یا تو کسی کے موافق ہوتا ہے یا کسی کے مخالف، ہر آدمی اپنے قول وعمل سے ایک روش کی تائید کرتا ہے اور دوسری روش کی تردید، خواہ یہ تائید وتردید براہ راست ہو یا بالواسطہ۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ جب بھی وہ کسی معاملہ میں بولے یا کوئی کارروائی کرے تو بولنے یا کرنے سے پہلے یہ سوچے کہ اس کے قول یا عمل کے ذریعہ کس کی حمایت ہوتی ہے اور کس کی مخالفت۔ اور وہ وہی کرے جس سے اہل حق کی حمایت ہوتی ہو۔ ہر حال میں وہ اہل باطل کی حمایت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے حتی کہ بالواسطہ حمایت سے بھی۔

قیمتی چیز

اخرج البخاری فی التاریخ الصغیر عن زید بن اسلم عن ابیہ ان عُمر بن الخطابؓ قال لاصحابہ۔ تمنّوا۔ فقال احدھم اتمنّٰی ان یکون ملءَ ھذا البیت دراھمَ فاُنفقھا فی سبیل اللّٰہ۔ فقال تمنّوا۔ فقال اٰخر اتمنی ان یکونَ ملءَ ھذا البیت ذھبًا فاُنفقھا فی سبیل اللّٰہ۔ قال تمنّوا۔ قال اٰخر اتمنّٰی ان یکون ملءَ ھذا البیت جوھرًا فاُنفقہ فی سبیل اللّٰہ۔ فقال عمرؓ۔ تمنّوا۔ فقالوا ما تمنّینا بعد ھذا۔ قال عمرؓ: لٰکنّی اَتمنّٰی ان یکون ملءَ ھذا البیت رجالاً مثل ابی عبیدۃ بن الجراح و معاذ بن جبل وحذیفۃ بن الیمان فاَستعمِلَھُم فی طاعۃ اللّٰہ (۲۳۳)

زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے اصحاب سے کہا کہ تم لوگ اپنی تمنا بیان کرو۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ یہ گھر درہم سے بھرا ہوا ہوتا تو میں ان کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اور تمنّا کرو۔ دوسرے شخص نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ اس گھر کے برابر سونا ہوتا تو میں اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اور تمنا کرو۔ ایک اور شخص نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ اس گھر کے برابر جواہرات ہوتے تو میں ان کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اور تمنا کرو۔ لوگوں نے کہا کہ اس کے بعد ہماری کوئی تمنّا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا: مگر میں یہ تمنا کرتا ہوں کہ یہ گھر ابو عبیدہ بن جراح اور معاذ بن جبل اور حذیفہ بن یمان جیسے آدمیوں سے بھرا ہوتا اور ان کو میں اللہ کی اطاعت میں استعمال کرتا۔

کام کا ایک آدمی اس دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ وہ آدمی جس کی ایک رائے ہو مگر وہ اپنی رائے پر اصرار نہ کرے۔ جو اپنے خلاف تنقید کو بھی اسی طرح سنے جس طرح وہ اپنی تعریف کو سنتا ہے۔ جو اصول سے انحراف کا تحمل نہ کر سکے، جو اختلاف کے باوجود متحد ہونا جانتا ہو۔

سیاسی اختلاف

حدیث کے مجموعوں میں کتاب الفتن کے تحت کثرت سے ایسی روایتیں آئی ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشین گوئی فرمائی ہے کہ میرے بعد حکمرانوں کے اندر بگاڑ پیدا ہوگا۔ لوگ اس سیاسی بگاڑ کی اصلاح کے نام پر حکمرانوں سے لڑیں گے۔ یہ لڑائیاں میری امت کو تباہ کردیں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی جنگ سے شدّت کے ساتھ منع فرمایا۔ آپ نے تاکید کی کہ حکمرانوں میں خواہ تم کتنا ہی بگاڑ دیکھو مگر تم ان سے جنگ نہ کرنا۔ تم ان کے مقابلہ میں صرف صبر اور خاموشی کا طریقہ اختیار کرنا۔

اس سلسلہ میں حدیث کی ہر کتاب میں کثرت سے روایتیں آئی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من کرہ من امیرہ شیئا فلیصبرہ (جو شخص اپنے امیر میں کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو وہ اس پر صبر کرے)۔ اس موضوع پر سعودی عرب سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے الغلو فی الدین (عبدالرحمٰن بن مُعلاّ اللویحق)۔ چھ سو صفحے کی اس کتاب میں اس موضوع پر تمام احادیث اور آثار کو جمع کردیا گیا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

تجربہ بتاتا ہے کہ تاریخ میں سب سے زیادہ لڑائیاں سیاسی اختلاف کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سیاست کبھی پوری طرح بگاڑ سے خالی نہیں ہوسکتی۔ سیاسی اقتدار اور بگاڑ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ اس میں کچھ نادر شخصیتوں کا استثناء ہوسکتا ہے۔ مگر عمومی قاعدہ یہی ہے۔

اب ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جب سیاسی حکمرانوں میں بگاڑ دیکھتے ہیں تو وہ فوراً اس کی اصلاح کے نام پر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ وہ اصلاح سیاست کے نام پر حکمرانوں سے جنگ چھیڑ دیتے ہیں۔ یہ اصلاحی جنگ ہمیشہ فسادی جنگ بن جاتی ہے۔ پوری تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی اصلاح کے نام پر سیاسی حکمرانوں سے لڑائی کی گئی تو اس کے نتیجہ میں صرف بگاڑ اور فساد میں اضافہ ہوا، مزید یہ کہ

مسلمانوں کا اجتماعی اتحاد ٹوٹ گیا۔ مسلمان دو گروہ — حکمراں اور غیر حکمراں — میں تقسیم ہو کر آپس میں لڑنے لگے۔ تمام دینی اور تعلیمی سرگرمیاں ختم ہو کر رہ گئیں۔

ایسی حالت میں اہلِ اسلام کے لیے لازم ہے کہ وہ اخفّ المفسد تین کا طریقہ اختیار کریں۔ ایسی حالت میں حکمراں سے لڑنا زیادہ بڑی برائی ہے اور حکمرانوں سے ٹکراؤ کو اعراض کرتے ہوئے پُرامن دائرہ میں دینی اور تعلیمی خدمات انجام دیتے رہنا چھوٹی برائی۔ اور جب انتخاب چھوٹی برائی اور بڑی برائی کے درمیان ہو تو بہترین عقل مندی یہ ہے کہ بڑی برائی سے بچا جائے اور چھوٹی برائی کو گوارا کرلیا جائے۔

اتحاد اسی حکمت کی نقد قیمت ہے۔ جب بھی یہ حکیمانہ تدبیر اختیار کی جائے تو امّت کے اندر اتّحاد اور اتفاق کی فضا قائم ہوگی اور جب اس حکیمانہ تدبیر کو چھوڑ دیا جائے تو اس کے بعد لازماً ایسا ہوگا کہ اتحاد اور اتفاق کا خاتمہ ہو جائے گا، اور اسی کے ساتھ تمام تعمیری کاموں کا خاتمہ بھی۔

سیاسی بگاڑ کے موقع پر سوچنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ایک بگاڑ ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو درست کریں۔ اس کے مقابلے میں سوچنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر ہم بگاڑ کو درست کرنے کے لیے اٹھیں تو اس کا عملی نتیجہ کیا ہوگا۔ اسلام کی تعلیم بتاتی ہے کہ اہل ایمان کے لیے صرف دوسرا طریقہ درست ہے، پہلا طریقہ ان کے لیے درست نہیں۔ یعنی عملی نتیجہ کو دیکھ کر اقدام کرنا۔

جب حالات بتاتے ہوں کہ اہل ایمان اگر اصلاح کے نام پر اربابِ اقتدار کے خلاف اقدام کریں تو اس کا عملی نتیجہ الٹا نکلے گا۔ ایسا اقدام صرف بگاڑ کو بڑھانے کا سبب بنے گا جب صورتِ حال ایسی ہو تو اہلِ ایمان پر فرض ہوگا کہ وہ عملی اقدام سے اپنے آپ کو بچائیں۔ وہ دعا کریں اور خاموشی کے ساتھ پرامن دائرہ میں اصلاح کی کوشش کریں۔ ایسی حالت میں اہل اقتدار کے خلاف اقدام کرنا ایک گناہ کا کام ہے، وہ کوئی ثواب کا کام نہیں۔

اتحاد میں خدا کی مدد

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم قال الله عزوجل: انا ثالث الشریکین مالم یخن احدهما صاحبه (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں دو شریکوں کے ساتھ تیسرا ہوتا ہوں، جب تک ان میں کا کوئی ایک ساتھی اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ خیانت نہ کرے۔

اس حدیث کو لفظی طور پر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دو آدمی اگر خدا کے لیے آپس میں متحد ہو جائیں تو ان کے ساتھ خدا خود ایک تیسرے رکن کی حیثیت سے شریک ہو جاتا ہے اور جس اتحادی مجموعہ میں خود خدا شریک ہو جائے اس کی طاقت بلاشبہہ بے پناہ حد تک بڑھ جاتی ہے۔ ان کا اتحاد نا قابل تسخیر حد تک مضبوط ہو جاتا ہے۔

یہ کوئی پراسرار بات نہیں۔ یہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ جب کچھ لوگ صرف اللہ کی خاطر متحد ہوں تو ان کی نفسیاتی حالت عام لوگوں سے مختلف ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملے کو اپنی ذات کی نظر سے دیکھنے کے بجائے خدا کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ انہیں اگر اپنے ساتھی سے کوئی شکایت ہو تو وہ یہ سوچ کر اسے بھلا دیتے ہیں کہ میں تو خدا کے لیے متحد ہوا ہوں نہ کہ کسی انسان کے لیے۔ کسی موقع پر اگر ان کی انا کو چوٹ لگتی ہے تو وہ اس کا اثر نہیں لیتے کیوں کہ وہ پہلے ہی اپنی اَنا کو خدا کے لیے چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ اجتماعی زندگی میں انہیں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے۔ کیوں کہ ان کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ میں نے آخرت کا فائدہ لینے کے لیے اس اتحاد میں شرکت کی ہے نہ کہ دنیا کا فائدہ لینے کے لیے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے لیے متحد ہونا اپنے آپ میں ایک طاقت ہے۔ خدا کے لیے متحد ہونے والے لوگوں میں وہ مزاج بن جاتا ہے جو اختلاف کا قاتل ہے۔ یہ ربّانی مزاج اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ کوئی بھی اختلافی سبب ان کے اتحاد کو نہ توڑے۔ وہ تمام اختلافات کو بھلا کر

پوری مضبوطی سے اتّحاد کی رسّی کے ساتھ بندھے ہوئے رہیں۔

اتحاد کی یہ برکت اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اتّحادیوں میں خیانت کی ذہنیت نہ پیدا ہو۔ خیانت کیا ہے۔ خیانت یہ ہے کہ ایک شریکِ اتّحاد دوسرے شریکِ اتّحاد کا خیر خواہ نہ رہے، ایک شریکِ اتّحاد، دوسرے شریک اتّحاد کو غیر سمجھ لے۔ جب لوگوں میں یہ نفسیاتی برائی آجائے تو لوگوں کے دل ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کو اپنا سمجھنے کا مزاج باقی نہیں رہتا۔ وہ ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ جب ایسا ہو جائے تو ان کے اتحاد کی تمام اینٹیں ہل جاتی ہیں۔ ان کا آپس کا جوڑ ختم ہو جاتا ہے۔ اتّحاد کے افراد پہلے اگر جمی ہوئی اینٹوں کے مانند تھے تو اب وہ بکھری ہوئی اینٹوں کے مانند ہو جاتے ہیں۔ اب ان کا اتحاد بھی ختم ہو جاتا ہے اور ان کی طاقت بھی۔

اتحاد پیدا ہونا نہایت آسان ہے، مگر اتحاد کو باقی رکھنا اتنا ہی مشکل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اتحاد کے بعد لازماً آپس میں شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک کو دوسرے سے نقصان پہنچتا ہے۔ اب لوگوں کے لیے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک خیانت کا اور دوسرا اخلاص کا۔ اتحادی افراد میں جب خیانت کا مزاج آجائے تو ان کی شکایتیں بڑھتی رہیں گی۔ یہاں تک کہ ان کا اتّحاد ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جب لوگوں میں اخلاص کا مزاج ہو تو ہر شکایت پیدا ہوتے ہی ختم ہو جائے گی۔ کوئی بھی شکایت اختلاف کے درجے تک نہ پہنچے گی۔

اتحاد ایمان کا حصّہ ہے

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا، وكونوا عباد الله اخوانا، ولا يحل لمسلم ان يهجر اخاه فوق ثلاث ليال (رواہ ابوداؤد) یعنی آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ کرو۔ ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔ ایک دوسرے سے پیٹھ نہ پھیرو۔ سب اللہ کے بندے، بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین رات سے زیادہ چھوڑے۔

یہ حدیث بظاہر حکم کی زبان میں ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ یہ بتا رہی ہے کہ ایمان آدمی کے اندر کس قسم کی صفات پیدا کرتا ہے۔ خدا کی معرفت انسان کو کس قسم کے کردار والا انسان بناتی ہے۔ اس حدیث میں دراصل کسی ایمان والے آدمی کی ان صفات کو بتایا گیا ہے جن کو اجتماعی صفات کہا جاتا ہے۔ گویا کہ یہ چیزیں ایمان کی اجتماعی پہچان ہیں۔

ذاتی دائرہ میں ایمان اللہ سے تعلق کا نام ہے۔ لیکن جب ایمان والے لوگ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہیں تو اس وقت باہمی اختلاط کے نتیجے میں بار بار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جب معاملہ صرف خدا اور انسان کا ہو تو وہاں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوگا، مگر جب انسان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہیں، تو ایسی صورت میں ایک دوسرے کے خلاف مسائل کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس طرح اجتماعی زندگی ایک پہچان بن جاتی ہے۔ جو یہ بتائے کہ لوگوں کے اندر ایمان کی سچی اسپرٹ موجود ہے یا نہیں۔

اللہ کے وہ بندے جو اللہ کو حقیقی معنوں میں اپنا معبود بنالیں، ان کا دل ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کا دل خدا کی بلندیوں میں اٹکا ہوا ہو، وہ دنیا کی پستیوں میں لت پت ہو کر نہیں رہ سکتے۔ ایسے لوگ اپنے بھائیوں کے درمیان اس طرح رہنے لگتے ہیں جیسے ہوا لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہے، مگر وہ کسی سے نہیں ٹکراتی۔ جیسے پھول کی مہک ہر ایک کو پہنچتی ہے مگر وہ ایک

اور دوسرے کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتی۔ جیسے روشنی ہر ایک کے پاس آتی ہے مگر وہ کسی سے خوش اور کسی سے خفا نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ اسی طرح ایک دوسرے کے مکمل ساتھی ہوتے ہیں۔ جیسے باغ کے درخت ایک دوسرے کے ساتھ بغیر کسی قسم کی باہمی رنجش کے ایک مقام پر کھڑے ہوئے ہوں۔

اسلام کے رزق سے آدمی کو حصہ ملا ہے یا نہیں، اس کی ایک واضح پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے درمیان اس طرح رہنے لگے کہ اس کو نہ کسی سے بغض ہو اور نہ کسی سے حسد۔ کسی قابل شکایت بات پیش آنے پر وہ اپنے بھائی سے بگڑ نہ جاتا ہو، وہ سارے لوگوں کو اللہ کی عیال سمجھ کر اس طرح رہ رہا ہو جیسے ایک باپ کی اولاد مل جل کر رہتی ہے۔ اس قسم کا ذہن جس شخص کے اندر پیدا ہو جائے وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایسا ہو جائے گا کہ کسی بھائی سے اگر اس کا بگاڑ ہو جائے اور وقتی تأثر سے مغلوب ہو کر وہ اس سے جدائی اختیار کر لے تو تین دن گزرتے گزرتے اس کا سینہ پھٹنے لگے گا۔ وقتی جذبہ نے اس کو جس بھائی سے دور کیا تھا، اس سے وہ اپنے رب کی خاطر دوبارہ اس طرح مل جائے گا جیسے کہ اِس کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

صد احادیث

001 — علم کی اہمیت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں عرب کے شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ ۶۱۰ء میں جب کہ آپ کی عمر ۴۰ سال کی ہوگئی تو آپ کو خدا نے نبوت عطا فرمائی۔ خدا کی طرف سے پہلی وحی جو آپ پر آئی وہ یہ تھی: پڑھ، اپنے رب کے نام سے جس نے تم کو پیدا کیا۔ انسان کو علق سے پیدا کیا۔ پڑھ، اور تمہارا رب کریم ہے۔ اس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا (العلق)

حقیقت یہ ہے کہ علم تمام انسانی ترقیوں کا آغاز ہے۔ انسان کو خدا نے بظاہر ایک حیوان کے روپ میں پیدا کیا ہے۔ مگر انسان کو ایک امتیازی صلاحیت دی گئی ہے اور وہ اس کا دماغ ہے۔ انسانی دماغ میں لامحدود حد تک غیر معمولی صلاحیت رکھی گئی ہے۔ اس صلاحیت کو بیدار کرنے کے لیے علم کی ضرورت ہے۔ علم کی مدد سے انسانی دماغ ترقی کرتا ہے اور بڑھتے بڑھتے اعلیٰ ترین درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔

علم کے ذریعہ آدمی تاریخ کو جانتا ہے۔ وہ فطرت کے رازوں کو دریافت کرتا ہے۔ وہ چیزوں کی ظاہری سطح سے گزر کر ان کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ علم کی یہ اہمیت ایک انسان کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ دوسرے انسان کے لیے۔

002 — علم حاصل کرو

پیغمبر اسلام نے فرمایا: علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے۔ اس حدیث سے اسلام میں علم کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ خدا کی معرفت علم کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اس لیے علم سیکھنے کو فرض قرار دیا گیا۔ علم آدمی کے شعور کو بڑھاتا ہے۔ علم سے آدمی کے ذہن کی کھڑکیاں کھلتی ہیں۔ علم سے سوچ کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ علم کے ذریعہ آدمی اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ زیادہ گہری حقیقتوں کو سمجھ سکے، وہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اپنے ذہنی معیار کو بلند کر سکے۔

مذہبی اور روحانی ارتقاء کے لئے علم لازمی طور پر ضروری ہے۔ علم کے ذریعہ ذہن میں پختگی آتی ہے۔ علم کے ذریعہ فکری ارتقاء کا عمل جاری ہوتا ہے۔ علم کے بغیر آدمی نہ مقدس کتابوں کو پڑھ سکتا ہے اور نہ تاریخ اور کائنات کے بارے میں زیادہ باخبر ہوسکتا۔ علم آدمی کو حیوان کی سطح سے اٹھا کر انسان کی سطح پر پہنچا دیتا ہے۔

003 — سیکھنے کا مزاج

خلیفہ ثانی عمر فاروق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر ملنے والے سے کچھ نہ کچھ سیکھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کے اندر سیکھنے کا عمل (learning process) ہمیشہ جاری رہتا تھا۔

ایسا کیوں کر ہوتا ہے۔ وہ اس طرح ہوتا ہے کہ آدمی جب بھی کسی سے ملے تو کھلے ذہن کے ساتھ ملے۔ وہ اس کو سکھانے سے زیادہ اس سے سیکھنے کی کوشش کرے۔ سیکھنے کے اس عمل کو مفید طور پر جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی متعصبانہ سوچ سے پاک ہو، وہ بڑائی کے جذبہ میں نہ جیتا ہو۔ اس کی نفسیات یہ ہو کہ جو کچھ مجھے ملے گا اس کو فوراً لے لوں گا۔ جب بھی میری کوئی غلطی مجھ پر واضح کی جائے گی تو میں فوراً اس کا اعتراف کر کے اپنے کو صحیح کرلوں گا۔

سیکھنے کے عمل کو مفید بنانے میں اگر سکھانے والے کا کردار اہم ہے تو اس سے بھی زیادہ اس میں سیکھنے والے کے کردار کا دخل ہے۔ سیکھنے والے میں جتنا زیادہ صحیح مزاج ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ دوسروں سے لینے میں کامیاب رہے گا۔ دنیا میں ہر لمحہ علم اور معرفت کی بارش ہو رہی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے پاس اس کو لینے کا برتن (container) موجود ہو۔

004 — علم کا خزانہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے، جہاں وہ اس کو پائے تو وہ اسی کا ہے۔ یہ حدیث علم کی آفاقیت کو بتاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم خواہ کہیں بھی ہو یا کسی کے پاس بھی ہو وہ یکساں طور پر سارے انسانوں کا حصہ ہے۔

علم ایک مشترک خزانہ ہے۔ علم کسی کی اجارہ داری نہیں، علم ہر قسم کے تعصب سے بلند ہے۔ علم سورج کے مانند ہے جس سے روشنی لینے کا حق جتنا کسی ایک کو ہے اتنا ہی حق دوسرے کو بھی ہے۔

علم کے معاملہ میں آفاقیت کا یہ تصور بے حد ضروری ہے۔ اس تصور کے بغیر علم کی ترقی ممکن نہیں۔ علم کا خزانہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ خواہ اس کو کتنا ہی زیادہ استعمال کیا جائے، اس میں کوئی کمی نہیں

آتی۔علم ایک ایسا اتھاہ سمندر ہے جو ہر طالب کی پیاس بجھاتا ہے۔مگر اس کا اپنا ذخیرہ اس کے بعد بھی اتنا ہی زیادہ باقی رہتا ہے جتنا کہ وہ اس سے پہلے تھا۔

005 — علم کا حصول

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ علم حاصل کرو، خواہ وہ چین میں ہو۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے حصول میں کسی بھی قسم کے تعصب یا کسی بھی قسم کے عذر کو رکاوٹ نہیں بننا چاہئے۔

قدیم زمانہ میں چین کا سفر ایک مشکل سفر سمجھا جاتا تھا۔اس لئے یہ کہنا کہ علم حاصل کرو خواہ وہ چین میں ہو، یہ معنی رکھتا ہے کہ ہر مشکل کو برداشت کر کے علم سیکھو۔کسی بھی چیز کو اس معاملہ میں رکاوٹ نہ سمجھو۔علم کے بغیر انسان گویا خام لوہا (ore) ہے۔یہ علم ہے جو انسان کو اسٹیل بناتا ہے۔زندگی کے سادہ پہلو کو آدمی علم کے بغیر بھی سمجھ سکتا ہے۔لیکن زندگی کی گہرائیوں تک پہنچنا علم کے بغیر ممکن نہیں۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم کے لیے سفر کرنا ضروری ہے۔سفر کے بغیر علم میں کوئی بڑا اضافہ نہیں ہوسکتا۔سفر آدمی کے ذہنی افق کو بڑھاتا ہے۔سفر آدمی کو مقامی علم سے اٹھا کر عالمی علم تک پہنچا دیتا ہے۔

006 — علم کا تحفہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ کوئی باپ اپنی اولاد کو اس سے اچھا تحفہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو تعلیم دے۔دوسرا کوئی بھی تحفہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے مگر علم کا تحفہ ایک ایسی چیز ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

ہر آدمی کا پہلا مدرسہ اس کا اپنا گھر ہے۔اس مدرسہ کے ٹیچر خود بچے کے ماں باپ ہوتے ہیں۔
اس حدیث سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ ماں باپ کو سب سے پہلے خود صاحب علم ہونا چاہئے کیوں کہ ماں اور باپ اگر صاحب علم نہ ہوں تو وہ نہ علم کی اہمیت کو سمجھیں گے اور نہ اپنی اولاد کو تعلیم دینے میں صحیح طور پر اپنا حصہ ادا کرسکیں گے۔دوسری بات یہ کہ گھر کسی بچے کے لیے صرف پرورش کا مقام نہیں ہے بلکہ وہ اس کی تعلیم وتربیت کا مقام بھی ہے۔ہر گھر کو تعلیم وتربیت کا ایک ادارہ ہونا چاہئے۔اس کے بغیر وہ گھر ایک ادھورا گھر ہے نہ کہ مکمل معنوں میں گھر۔

007 — علم کی برتری

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ شہید کے خون کے مقابلہ میں عالم کے قلم کی روشنائی زیادہ افضل ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کی عظمت تمام دوسری چیزوں سے زیادہ ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ علم کا تعلق ذہن سے ہے۔ علم سے ذہن کو تندرستی ملتی ہے، ذہنی سوچ میں اضافہ ہوتا ہے، علم سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ذہن معاملات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھے اور زیادہ بہتر طور پر عمل کی منصوبہ بندی کرنے کے قابل ہو جائے۔

کوئی بھی جسمانی عمل ایک محدود عمل ہے۔ ایک مقام تک پہنچ کر جسمانی عمل کی حد آجاتی ہے مگر علم کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ جس آدمی کو علم حاصل ہو اس کی شخصیت بے پناہ حد تک وسیع ہو جائے گی۔ وہ ہر قید سے باہر آ کر سوچنے کے قابل ہو جائے گا۔ وہ ایک ایسا انسان بن جائے گا جس کو کوئی زیر نہ کر سکے۔ جس طرح علم کی کوئی حد نہیں اسی طرح اس انسان کی بھی کوئی حد نہیں جو علم کی دولت کا مالک ہو جائے۔

008 — علم کا ریکارڈ

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ علم کو کتابت کے ذریعہ محفوظ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو علم تمہارے ذہن میں ہے اس کو کاغذ پر لکھ لو۔ اس طرح وہ اپنی صحیح شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔

اس تعلیم کا ایک استعمال یہ ہے کہ علم کو کتابوں میں منتقل کیا جائے۔ ہر علمی موضوع پر کتابیں لکھ کر تیار کی جائیں۔ علم کو دماغ سے نکال کر لائبریری کی صورت میں ذخیرہ کر دیا جائے۔

اس معاملہ کی ایک صورت وہ بھی ہے جس کو ڈائری کہا جاتا ہے۔ اس طرح اس تعلیم کی ایک پیروی یہ بھی ہوگی کہ ہر آدمی اپنی ایک ڈائری رکھے۔ وہ اپنے روزانہ کے مطالعہ اور تجربہ کو مختصر طور پر اس میں تاریخ وار درج کرتا رہے اس طرح ہر آدمی کے علمی سفر کا ایک روزنامچہ تیار ہوتا رہے گا۔

یہ ڈائری آدمی کے روزانہ ذہنی سفر کا ایک ریکارڈ ہوگی، وہ اپنے احتساب کا ایک مؤثر ذریعہ ہوگی۔ آدمی اپنی ڈائری کے ذریعہ اپنی کامیابی اور ناکامی کو جان کر اپنی اصلاح کرتا رہے گا۔ اس طرح ڈائری اس کی شخصیت کے ارتقاء کا ذریعہ بن جائے گی۔

009 — علم برائے علم

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ علم کو گہوارہ مادر سے لے کر قبر تک حاصل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم کسی وقتی نفع یا کسی وقتی جاب کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک مستقل عمل ہے جو انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک جاری رہتا ہے۔ لہذا علم اپنے آپ میں مطلوب ہے۔ علم کا اصل مقصد انسانی شخصیت کی تعمیر ہے۔ یہ کوئی وقتی کام نہیں۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ وہ ہر حال میں اور ہر مقام پر جاری رہتا ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کی تعلیم وتربیت کا عمل بھی کبھی ختم نہیں ہوتا۔

علم یا تعلیم کا اصل مقصد شعور کو بیدار کرنا ہے تا کہ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو سمجھے۔ وہ کبھی محدود سوچ میں مبتلا نہ ہو۔ اس کا ذہن کبھی جمود کا شکار نہ ہونے پائے۔ علم انسانی شخصیت کی غذا ہے۔ جس طرح جسم مادّی غذا کے بغیر ناکارہ ہو جاتا ہے اسی طرح انسانی شخصیت علم کے بغیر ناقص ہو جاتی ہے۔ اور ناقص شخصیت موجودہ دنیا میں کوئی بڑا کردار ادا نہیں کرسکتی۔

010 — غیر مفید علم

پیغمبر اسلام کی ایک دعا یہ تھی: **اللهم إني اعوذبك من علم لا ينفع** (اے خدا، مجھ کو ایسے علم سے بچا جو بے فائدہ ہو) گویا وہی علم علم ہے جو انسانیت کے لئے مفید ہو، جو علم انسانیت کے لیے مفید نہ ہو وہ کوئی مطلوب علم نہیں۔ ایسے علم کے حصول میں اپنا وقت لگانا جس میں کوئی حقیقی فائدہ نہ ہو، وقت کو ضائع کرنا ہے۔

011 — نمو پذیر شخصیت

قرآن میں سچے انسان کی مثال پودے سے دی گئی ہے۔ جس طرح پودا بڑھ کر درخت بنتا ہے اسی طرح انسان کی شخصیت بھی بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ شاداب درخت کی طرح وہ ایک ترقی یافتہ شخصیت بن جاتی ہے۔ انسان چھوٹے بچے کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد بڑھتے بڑھتے وہ پورا آدمی بن جاتا ہے۔ یہ معاملہ جسم کی ترقی کا ہے۔ اسی طرح انسان کا ذہن بھی ترقی کرتا ہے۔ یہ ترقی تفکیری عمل (thinking process) کے ذریعہ جاری ہوتی ہے۔ اگر یہ تفکیری عمل

صحت مند انداز میں جاری رہے تو انسان کا ذہن بھی اسی طرح ترقی کے درجہ تک پہنچ جائے جس طرح اس کا جسم ترقی کے درجہ تک پہنچتا ہے۔

یہ تفکیری عمل فطری طور پر ہر انسان کے اندر جاری ہوتا ہے۔ انسان کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے جو تفکیری عمل میں رکاوٹ ڈالنے والی ہیں۔ اگر تفکیری عمل کو رکاوٹ سے بچایا جائے تو وہ ایک چشمہ کی طرح بہتا رہے گا یہاں تک کہ وہ ایک عظیم دریا بن جائے گا۔

012 — جاننے والے سے پوچھنا

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والے سے پوچھو۔ یعنی نہ جاننے والا جاننے والے سے پوچھے اور اس طرح اپنے نہ جاننے کو جاننا بنائے۔ لوگ عام طور پر پوچھنے کو پسند نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پوچھنے کا مطلب گویا یہ اقرار کرنا ہے کہ تم جانتے ہو، میں نہیں جانتا۔ یہ ایک مہلک عادت ہے۔ صحت مند عادت یہ ہے کہ پوچھنے کو ویسا ہی سمجھا جائے جیسا کہ ڈکشنری یا انسائیکلوپیڈیا کا مطالعہ کرنا۔

کوئی آدمی خود سے ساری باتوں کو جان نہیں سکتا۔ اسی کمی کی تلافی کے لیے وہ کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اسی طرح اس کو یہ عادت ڈالنا چاہئے کہ وہ جاننے والے سے پوچھے۔ جاننے والا اس کے لیے گویا ایک زندہ کتاب ہے۔ اگر کتاب کو پڑھنے میں اسے کوئی احساس نہیں روکتا تو جاننے والے سے پوچھنے میں بھی کسی احساس کو رکاوٹ نہیں ہونا چاہئے۔ جاننے والے سے پوچھنا باہمی تعلقات کو بڑھاتا ہے۔ وہ علم میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ انسانی تعلقات میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

013 — خدا کی نعمتوں میں غور وفکر

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ خدا کی نعمتوں میں غور وفکر کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ غور وفکر بظاہر دکھائی نہیں دیتا کیوں کہ وہ ذہن میں ہوتا ہے۔ مگر خدا کی نظر میں اس سے بڑا کوئی عمل نہیں۔

اصل یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں نعمت کا پہلو موجود ہے۔ غور وفکر کر کے ان نعمتوں کو جاننا، چیزوں میں نعمت کے پہلو کو دریافت کرنا، یہی وہ چیز ہے جس کو اس حدیث میں افضل عبادت کہا گیا ہے۔

چیزوں کو نعمت کے پہلو سے دریافت کرنا ایک ایسا عمل ہے جو آدمی کو خدا سے قریب کرتا ہے، جو آدمی کو خدا سے جوڑتا ہے۔ وہ آدمی کے لیے خدا کی معرفت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

014 — غور وفکر کا عمل

ابوالدرداء پیغمبر اسلام کے ایک صحابی تھے۔ ان کی وفات کے بعد ایک شخص نے ان کی زوجہ ام الدرداء سے پوچھا کہ ابوالدرداء کا سب سے بڑا عمل کیا ہوتا تھا۔ ام الدرداء نے جواب دیا کہ سوچنا اور عبرت پکڑنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی انسان کا سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ وہ اپنے آس پاس کی چیزوں پر غور کرے اور ان سے عبرت کا پہلو اخذ کرتا رہے۔ یہ گویا ذہنی ارتقاء (intellectual progress) اور روحانی ارتقاء (spiritual developement) کا عمل ہے۔ جو سنجیدہ غور وفکر کی صورت میں انسان کے اندر جاری ہوتا ہے۔ وہ موت سے پہلے کبھی ختم نہیں ہوتا۔

015 — علمی تواضع

پیغمبر اسلام کے ایک صحابی عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ جب تم کسی بات کو نہ جانو تو تم یہ کہہ دیا کرو کہ: اللّٰہ أعلم (اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے)۔ اس اصول کو دوسرے لفظوں میں، علمی تواضع کہا جا سکتا ہے۔ اور علمی تواضع علمی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔

عربی زبان کا ایک مثل ہے: لاأدری نصف العلم (میں نہیں جانتا، آدھا علم ہے)۔ یہ کہہ سکنا کہ میں نہیں جانتا، کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اپنے نہ جاننے کو جاننا ہے۔ جب آدمی اپنے نہ جاننے سے باخبر ہو جائے تو اس کے اندر تجسس کی روح (spirit of inquiry) جاگتی ہے جو آخر کار اس کو علم تک پہنچا دیتی ہے۔ جب آدمی ایک بات کو نہ جانے تو اس کو اپنے نہ جاننے کا اعتراف کرنا چاہئے۔ اپنے نہ جاننے کا اعتراف بھی جاننے کی طرح ایک قدم ہے۔ اس مزاج کے بغیر کوئی آدمی علمی ترقی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

016 — تعلیم وتربیت

پیغمبر اسلام کے ایک ساتھی کہتے ہیں کہ ایک چڑیا بھی اگر فضا میں اڑتی ہوئی دکھائی دیتی تو آپ اس سے ہم کو ایک علم کی یاددہانی کراتے تھے (مامن طائرٍ یطیر بجناحیه إلا و هو یذکر لنا منه علماً)

اس حدیث سے تعلیم وتربیت کا ایک توسیعی تصوّر سامنے آتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم وتربیت کے عمل کا تعلق صرف اسکول اور مدرسہ سے نہیں۔ بلکہ اسکول کے احاطہ سے باہر بھی اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ فطرت کی دنیا میں ہر چھوٹی بڑی چیز کے اندر کوئی نہ کوئی علم چھپا ہوا ہے۔معلّم اگر بیدار ذہن رکھتا ہوتو وہ اپنے طلبہ کے لیے اسکول کے اور مدرسہ کے باہر کی دنیا کو بھی تعلیم وتربیت کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔اسی طرح ایک رہنما اپنے پیروؤں کے لیے ہر منظر اور ہر تجربہ سے علم اخذ کرکے ان کی ذہنی اور روحانی تربیت کا سامان کرسکتا ہے۔ہماری دنیا پوری کی پوری ایک وسیع تعلیم گاہ ہے۔جو آدمی علم کا سچّا طالب ہو وہ ہر لمحہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے گا۔اس کا علمی سفر کبھی ختم نہ ہوگا۔

017 — علم اور سنجیدگی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو شخص اللہ سے ڈرے، وہ عالم ہے (**من یخشی الله فهو عالم**)۔ اس حدیث سے علم کا ایک اہم پہلو معلوم ہوتا ہے اور وہ سنجیدگی اور احتیاط ہے۔علم صرف واقفیت کا نام نہیں۔کسی شخص کو جب گہرائی کے ساتھ علم حاصل ہوتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کے بارے میں وہ محتاط بن جاتا ہے۔یہ احتیاط اس کے اندر سنجیدگی پیدا کرتی ہے۔جہاں علم ہو اور سنجیدگی نہ ہو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہاں حقیقی معنوں میں وہ چیز نہیں جس کو علم کہا گیا ہے۔

سچا علم آدمی کو ایک نیا انسان بنا دیتا ہے۔سچے علم والا انسان حقائق فطرت سے باخبر رہتا ہے اور جو آدمی حقائق فطرت سے باخبر ہوجائے وہ اس کا تحمّل نہیں کرسکتا کہ وہ تضاد میں جئے۔وہ غیر محتاط انداز میں کلام کرے، وہ لوگوں کے ساتھ غیر سنجیدہ معاملہ کرے۔سچا علم آدمی کو ہر قسم کی غیر ذمّہ داری سے بچاتا ہے۔سچا علم آدمی کو پورے معنوں میں سنجیدہ اور ذمّہ دار انسان بنا دیتا ہے۔

018 — علم میں اضافہ

قرآن میں ایک دعا ان الفاظ میں بتائی گئی ہے: **ربّ زدنی علما** (اے میرے رب تو میرا علم زیادہ کردے)۔ اس قرآنی دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں علم کے حصول کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت مسلسل اپنے علم میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

دعا دراصل عزم کی ایک صورت ہے۔ دعا کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی پوری طرح ایک مقصد کے حصول میں لگ جائے۔ وہ اپنی حد تک سب کچھ کرتے ہوئے خدا سے یہ دعا کرے کہ وہ اس کی کوششوں کو کامیاب کرے۔ اس طرح دعا خود آدمی کے عمل کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کی کوئی حد نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ کسی مقام پر رکے بغیر علم کے حصول کی کوشش میں لگا رہے۔ وہ اس معاملہ کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے علم میں اضافہ کے لیے برابر کوشاں رہے۔ علم کی کوئی حد نہیں اس لیے حصول علم کی راہ میں جد و جہد کی بھی کوئی حد نہیں۔

019 — بے جا عذر

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ آدمی ہمیشہ دو چیزوں کے فریب میں رہتا ہے— صحت اور فرصت۔ یعنی وہ سوچتا رہتا ہے کہ جب صحت ہوگی تب کرلوں گا اور جب فرصت ہوگی تب کرلوں گا، مگر زندگی میں صحت اور فرصت کبھی آتی نہیں۔ چنانچہ وہ اسی دھوکے میں رہتا ہے اور آخر کار مر جاتا ہے۔

عقل مند آدمی وہ ہے جس کا یہ حال ہو کہ وہ کسی عذر کو عذر نہ بنائے۔ جب بھی کوئی کام سامنے آئے وہ اس کو فوراً کر ڈالے۔ ابھی اور اسی وقت سے بہتر کام کرنے کا کوئی وقت نہیں:

There is no better time to start than this very minute.

020 — دل سے مسئلہ پوچھنا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اپنے دل سے فتویٰ پوچھ لو (استفت قلبك) اس حدیث میں قلب سے مراد وہی چیز ہے جس کو کامن سنس کہا جاتا ہے۔

انسان کو بار بار مسئلے پیش آتے ہیں۔ ان مسئلوں میں اس کو ہر بار مفتی سے فتویٰ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آدمی اپنے آپ کو نفسیاتی پیچیدگی سے پاک رکھے تو اس کا کامن سنس اس کے لیے بہترین رہنما بن سکتا ہے۔ اور یہ کامن سنس ایک ایسی چیز ہے جس کو کہیں ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہر وقت اور ہر جگہ آدمی کے ساتھ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

021 — حکمت کی بات

مشہور صحابی رسول حضرت عمر فاروق نے کہا: **امیتوا الباطل بالصمت عنه** (تم باطل کو ہلاک کرو اس کے بارے میں چپ رہ کر)۔ یہ قول خاموشی کی طاقت کو بتاتا ہے۔

مشہور مثل ہے کہ تالی دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ اگر آپ باطل کی طاقت کے بعد خود بھی جوابی کارروائی کریں تو باطل کو اس سے مزید طاقت مل جائے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ خاموشی کا طریقہ اختیار کریں تو باطل کا زور دھیرے دھیرے اپنے آپ ٹوٹ جائے گا۔ آپ کی طرف سے جوابی کارروائی نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فطرت کی طاقتیں آپ کی حمایت میں متحرک ہو جائیں گی۔ وہ آپ کے کام کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے دیں گی۔

022 — بلند ہمتی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ بلند ہمتی ایمان کا ایک حصہ ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خدا پر ایمان آدمی کو سب سے بڑا بھروسہ دے دیتا ہے۔ یہ بھروسہ اس کو بلند ہمت بنا دیتا ہے۔

مگر دنیا میں بار بار آدمی کو ناموافق حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ حالات اس کو مایوسی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر آدمی کو خدا کے اوپر یقین ہو جائے تو وہ آخری حد تک حوصلہ مند بن جائے گا۔ خدا پر یقین اس کو اس وقت بھی بھروسہ دے گا جب کہ بظاہر آدمی کے پاس کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔

023 — باقی رہنے والا عمل

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہو۔ اس دنیا میں کوئی حقیقی کامیابی ہمیشہ دیر میں ملتی ہے۔ اس لیے سب سے بہتر عمل وہ ہے جو قابل بقا (sustainable) ہو۔ اس دنیا میں نتیجہ خیز عمل وہی ہے جو شروع کرنے کے بعد برابر جاری رہے۔ جس پر آدمی اپنی پوری عمر قائم رہ سکتا ہو۔ ایسا ہی عمل فطرت کے قانون کے مطابق ہے۔ ایسا ہی عمل حقیقی معنوں میں عمل ہے۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ عمل شروع کرنے سے پہلے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ وہ تمام متعلق

امور کا جائزہ لے۔ وہ اپنی صلاحیت اور دستیاب وسائل نیز وقت کے حالات، ہر چیز کا بھرپور اندازہ کرے اور پھر سوچے سمجھے نقشہ کے مطابق اپنا کام شروع کرے۔ اور جب وہ کام شروع کردے پھر وہ درمیان میں کبھی اس کو نہ چھوڑے۔ یہی دنیا میں کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔

024 — زمانہ سے باخبر ہونا

پیغمبر اسلام کی ایک لمبی حدیث ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے: عقلمند آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانہ کو جاننے والا ہو۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ انسان کے علم کی تکمیل کیا ہے۔ علم والا ہونے کے لیے یہ کافی نہیں کہ آدمی کتابی معلومات سے واقف ہو۔ اس نے ماضی کی روایتوں کو یاد کر رکھا ہو۔ اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ آدمی جس زمانہ میں ہے اس زمانہ کو جانے۔ وہ ماضی شناس ہونے کے ساتھ حال شناس بھی ہو۔

زمانہ کو جاننے کی اہمیت فکری بھی ہے اور عملی بھی۔ اس کے بغیر آدمی کی سوچ ناقص رہتی ہے۔ وہ باتوں کو آفاقی انداز میں سمجھ نہیں پاتا۔ حقیقت کا گہرا تجزیہ اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس طرح عملی اعتبار سے وہ ایک ناقص انسان ہوتا ہے۔ وہ یہ جاننے سے محروم رہتا ہے کہ وقت کے حالات میں ابدی سچائیوں کو کس طرح منطبق (apply) کرے۔ ایسا آدمی اپنے عمل کی کامیاب منصوبہ بندی نہیں کرسکتا۔

025 — بامقصد زندگی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ آدمی کے اچھے اسلام پر ہونے کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے۔ پیغمبر اسلام کا یہ قول بتاتا ہے کہ ایک بامقصد انسان کی زندگی کیسی ہونی چاہئے۔

اصل یہ ہے کہ دنیا میں کام زیادہ ہیں اور ایک شخص کی عمر بہت مختصر۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ آدمی اپنی مشغولیتوں میں انتخابی (selective) انداز اختیار کرے۔ وہ صرف ان چیزوں میں مشغول ہو جن کا تعلق براہ راست زندگی کے مقصد سے ہو۔ جو چیزیں اس کے مقصد کے لیے کارآمد نہیں ان سے وہ مکمل طور پر پرہیز کرے۔ وہ بے فائدہ کام اور فائدے والے کام میں فرق کرنا جانے۔

بے فائدہ کام سے مراد وہ کام ہے جو محض دلچسپی یا وقت گزاری کے لیے ہو، جس سے وقتی تفریح

کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہوتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے بے فائدہ کام میں مشغول ہونا ایک ایسا تعیش (luxury) ہے جس کا تحمل ایک با مقصد انسان نہیں کر سکتا۔

026 — نفع بخشی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا کا نظام نفع بخشی کے اصول پر قائم ہے۔ یعنی جو شخص دوسروں کو نفع پہنچائے گا اس کو دوسروں سے فائدہ ملے گا۔ جتنا دینا اتنا پانا۔ اس اصول کے مطابق، جب بھی کسی کو محرومی کا تجربہ ہو تو اس کو یہ مان لینا چاہئے کہ ایسا اس لیے ہوا ہے کہ وہ اپنے آپ کو نفع بخش ثابت نہ کر سکا۔ اس نے دوسروں کو محروم رکھا تھا اس لیے دوسروں نے بھی اس کو محروم کر دیا۔ اگر وہ دوسروں کو دیتا تو ضرور وہ بھی دوسروں سے پاتا۔

نفع بخشی کے اس اصول کا تعلق زندگی کے پورے معاملے سے ہے۔ اس کا تعلق خاندان سے بھی ہے اور سماج سے بھی۔ قومی زندگی سے بھی ہے اور بین اقوامی زندگی سے بھی۔ ہر انفرادی اور اجتماعی معاملے میں یہی اصول کارفرما ہے۔ اس کے مطابق، شکایت اور احتجاج کا طریقہ بالکل بے معنٰی ہے۔ اس دنیا میں ہر شکایت اور ہر احتجاج خود اپنی کوتاہی کے خلاف شکایت اور احتجاج ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ شکایت اور احتجاج میں وقت ضائع نہ کرے، بلکہ پہلی فرصت میں اپنی کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اپنے آپ کو دوسرے کے لیے نفع بخش بنائے۔ یہی مسئلہ کا واحد حل ہے۔

027 — خاموشی میں نجات

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بولنا ایک کام ہے اسی طرح چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ جس طرح ایکشن لینا ایک کام ہے اسی طرح ایکشن نہ لینا بھی ایک کام ہے۔ جس طرح آگے بڑھنا ایک کام ہے اسی طرح پیچھے ہٹنا بھی ایک کام ہے۔ جس طرح طاقت کی پوزیشن میں فائدہ ہے اسی طرح تواضع کی پوزیشن میں بھی فائدہ ہے۔ چپ رہنا صرف نہ بولنے کا نام نہیں۔ چپ رہنا ایک تدبیر ہے۔ چپ رہنا خاموش منصوبہ بندی کا دوسرا نام ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ شور کی سیاست کے مقابلہ میں چپ کی سیاست زیادہ نتیجہ خیز ہے۔

چپ رہنے کے بہت سے فائدے ہیں۔ جب آدمی چپ رہتا ہےتو وہ سوچتا ہے۔ جب آدمی چپ رہتا ہےتو وہ دوسروں سے سیکھتا ہے۔ جب آدمی چپ رہتا ہےتو وہ اپنی اندرونی طاقتوں کو جگاتا ہے۔ یہ بلاشبہہ ضروری ہے کہ آدمی بولے۔مگر اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ وہ چپ رہنے کی حکمت کو جانے۔کبھی بات کو بگڑنے سے بچانے کے لیے صرف اتنا کافی ہوتا ہے کہ آدمی چپ ہو جائے۔ چپ رہنا نظر انداز کرنے کی ایک علامت ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ نظر انداز کرنا ایک انتہائی حکیمانہ عمل ہے۔

028 — دومختلف صفات

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کے اندر دومختلف صفات رکھی گئی ہیں۔ ایک نفس امّارہ دوسرے نفس لوّامہ۔ یہ دونوں صفتیں پیدائشی طور پر ہر انسان کے اندر ہوتی ہیں۔کوئی بھی انسان ان سے خالی نہیں ہے۔نفس امّارہ سے مراد انانیت ہے اور نفس لوّامہ سے مراد ضمیر ہے۔ یہ دونوں صفتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی حالت میں ہوتی ہیں۔ اگر ان کو نہ جگایا جائے تو وہ سوئی ہوئی رہیں گی۔ اگر کسی آدمی کے خلاف ایسی بات کہی جائے جو اس کو اشتعال دلانے والی ہوتو اس کا نفس امّارہ جاگ پڑے گا اور پھر اس کا انجام وہی ہوگا جیسے کسی سوئے ہوئی سانپ کو جگا دیا جائے۔

اس کے برعکس اگر آدمی سے نرمی کا سلوک کیا جائے تو اس کا نفس لوّامہ جاگے گا۔ پہلے اگر دوسروں کو اس سے کانٹے کا تجربہ ہوا تھا تو اب دوسروں کو اس سے پھول کا تجربہ ہوگا۔ اب دوسروں کو اس سے انسانیت کی خوشبو حاصل ہوگی۔ اب وہ دوسروں کے لیے رحمت کا نمونہ بن جائے گا۔

029 — صبر سے کامیابی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جان لو، کامیابی صبر کے ساتھ ہے۔صبر کا الٹا عجلت پسندی ہے۔عجلت کی کارروائی منصوبہ کے بغیر ہوتی ہے اور صبر کی کارروائی منصوبہ کے بعد ہوتی ہے۔ اور اس دنیا میں وہی کارروائی کامیاب ہوتی ہے جو منصوبہ کے ساتھ کی گئی ہو۔

030 — ٹکراؤ سے پرہیز

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ مومن کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص خود اپنے آپ کو کیوں ذلیل کرے گا۔ آپ نے جواب دیا کہ وہ ایسی بلا کا سامنا کرے جس سے نپٹنے کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو۔ اس حدیث میں زندگی کا ایک حکیمانہ اصول بتایا گیا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ آدمی کی کارروائی ہمیشہ نتیجہ خیز ہونا چاہئے۔ ایک ایسی طاقت جس سے مقابلہ کرنے کا سازوسامان اس کے پاس نہ ہو، اگر وہ کوئی عذر لے کر ایسی طاقت سے ٹکرا جائے تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ ذلت اور ناکامی سے دوچار ہوگا۔ ایسا فعل جو یکطرفہ طور پر خود فاعل کی تباہی میں اضافہ کرنے والا ہو اس میں اپنے آپ کو الجھانا کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔

031 — اپنے سے کم کو دیکھو

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ مادّی معاملہ میں اپنے سے اوپر کو نہ دیکھو بلکہ اپنے سے نیچے کو دیکھو۔ اس طرح تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔

اس دنیا کا نظام خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہمیشہ اونچ اور نیچ قائم رہتی ہے۔ کوئی آگے ہوتا ہے اور کوئی پیچھے۔ اس کی مصلحت یہ ہے کہ اس طرح مسابقت(competition) کا ماحول قائم رہتا ہے۔ اس مسابقت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ زندگی کی ترقیاں اور سرگرمیاں ہمیشہ جاری رہتی ہیں۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر آدمی سے کوئی آگے ہوتا ہے اور کوئی اس سے پیچھے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھے۔ اس تقابل کا فائدہ یہ ہوگا کہ جو کچھ خدا نے اس کو دیا ہے وہ اس کو زیادہ نظر آئے گا۔ وہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتا رہے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ ایسا کرے کہ صرف اپنے سے اوپر والے کو دیکھے تو اس کے اندر نفرت اور جھنجھلاہٹ کا مزاج پیدا ہوگا۔

مثبت مزاج آدمی کے ذہنی اور روحانی ارتقاء میں مددگار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس منفی مزاج آدمی کے ذہنی اور روحانی ارتقاء کو روک دیتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسرے کی خاطر اپنے آپ کو ذہنی ارتقاء سے محروم نہ کر لے۔

032 — گزرتا ہوا زمانہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمانہ گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے۔ گویا انسانی زندگی کی حیثیت برف جیسی ہے۔ جس طرح برف پگھل کر ہر لمحہ گھٹتا جاتا ہے اسی طرح انسان کی عمر بھی ہر لمحہ گھٹ رہی ہے۔ گھٹتے گھٹتے آخر کار وہ وقت آتا ہے جب کہ انسان اپنی عمر پوری کر کے ختم ہو جائے۔

گویا ہر انسان کا مسلسل کاؤنٹ ڈاؤن (count down) ہو رہا ہے۔ اگر ایک شخص کے لیے یہ مقدّر ہو کہ وہ پیدا ہونے کے بعد ساٹھ سال تک زندہ رہے گا تو گویا پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔ پہلا سال پورا ہونے پر اس کی عمر انسٹھ سال رہ گئی۔ اس کے بعد اٹھاون، اس کے بعد ستاون، اس کے بعد چھپّن، اس کے بعد پچپن، اس طرح مسلسل ہر آدمی کی الٹی گنتی ہو رہی ہے۔ اس الٹی گنتی کو روکنا کسی بھی شخص کے بس میں نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے ہر لمحہ کو قیمتی سمجھے کیوں کہ جو وقت کھویا گیا وہ دوبارہ واپس آنے والا نہیں۔ جس طرح گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آتا۔ اسی طرح زندگی کے گزرے ہوئے لمحات بھی کسی کو دوبارہ واپس نہیں ملتے۔

033 — مایوسی نہیں

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے خدا کے بندو، مایوس نہ ہو، کیوں کہ خدا کی رحمت بہت وسیع ہے۔ آدمی کو جب بھی مایوسی ہوتی ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنے امکانات کو دیکھتا ہے۔ اگر اس کی نظر خدائی امکانات پر ہو تو وہ کبھی مایوس نہ ہوگا۔

انسانی امکانات کی حد ہوتی ہے۔ مگر خدائی امکانات کی کوئی حد نہیں۔ انسان اگر اس حقیقت کو جان لے تو وہ کبھی مایوس نہ ہو۔ کیوں کہ جہاں بظاہر انسان کی حد آ گئی ہے عین اسی مقام پر وہ ایک اور امکان کو پالے گا جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ اس کے لیے کوئی رکاوٹ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا پر یقین آدمی کو امید کا ایسا خزانہ دے دیتا ہے کہ اس کے بعد وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ وہ کبھی اس احساس سے دوچار نہیں ہوتا کہ آگے اس کے لیے کچھ اور باقی نہیں رہا۔ ایک امکان کا خاتمہ اس کے لیے زیادہ بڑے امکان کا آغاز بن جاتا ہے۔ خدا کا عقیدہ اور مایوسی دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

034 — اعلیٰ اخلاق

پیغمبر اسلام نے اپنے کچھ ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، کیا میں تم کو بہتر اخلاق بتاؤں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جو تم سے کٹے تم اس سے جڑو جو تمہیں محروم کرے تم اسے دو۔ جو تمہارے اوپر ظلم کرے تم اس کو معاف کر دو۔ اس کو ایک لفظ میں یکطرفہ اخلاقیات کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مطابق، اعلیٰ اخلاق یہ نہیں ہے کہ جو خود اچھا سلوک کرے اس کے ساتھ آپ بھی اچھا سلوک کریں۔ یہ برابر کا اخلاق ہے۔ اور برابر کا اخلاق اعلیٰ اخلاق نہیں۔ اعلیٰ اخلاق وہ ہے جو خود اپنے اعلیٰ اصول پر قائم ہو۔ جو دوسروں کے عمل کے جواب میں نہ ہو بلکہ خود اپنے اصولی رویہ کے تحت ہو۔

اعلیٰ اخلاق یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے رویہ سے بلند ہو کر یکطرفہ طور پر حسن اخلاق پر قائم رہے۔ وہ ردّ عمل کی نفسیات سے اپنے آپ کو بچائے اور کسی بھی حال میں اپنے مثبت اخلاقی رویہ کو نہ چھوڑے۔ اعلیٰ انسانیت کی سب سے بڑی پہچان اعلیٰ اخلاق ہے۔ اور اعلیٰ اخلاق کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ دوسروں کی طرف سے منفی رویہ کے باوجود آدمی اپنے آپ کو مثبت رویہ پر قائم رکھے۔

035 — بےنفس انسان

قرآن میں اعلیٰ شخصیت کو بتانے کے لیے **النفس المطمئنه** کا لفظ آیا ہے۔ **النفس المطمئنه** کو دوسرے لفظوں میں نفسیاتی پیچیدگیوں سے خالی روح (complex-free soul) کہا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ انسان جو ہر قسم کے منفی احساسات اور سطحی جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔

دنیا میں آدمی مختلف حالات کے درمیان رہتا ہے۔ یہ حالات اس کے اندر طرح طرح کے جذبات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً نفرت، بغض، کینہ، حسد، جلن، انتقام، تعصب، خودغرضی، غرور، خودنمائی، جاہ پسندی، بے اعترافی، وغیرہ۔ جو شخص اس قسم کے تمام جذبات سے اپنے آپ کو اوپر اٹھالے اس کو **النفس المطمئنه** کہا گیا ہے۔ یہ ایک شعوری عمل ہے۔ کوئی شخص خود بخود **النفس المطمئنه** نہیں بن سکتا۔ اس کو شعوری طور پر اپنا نگراں بننا پڑتا ہے۔ وہ بار بار اپنی تطہیر کا کام کرتا رہتا ہے۔ اس طرح یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی شخص **النفس المطمئنه** بن سکے۔

036 — برائی کومٹانا

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ نیکیاں برائیوں کومٹا دیتی ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم سے کوئی برائی ہو جائے تو اس کے بعد تم نیکی کرو۔اس سے برائی کا اثر ختم ہو جائے گا۔مثلاً اگر آپ نے کسی شخص کو برا کہہ دیا تو اس کے بعد اس کو اچھا کہیے۔اگر آپ نے کسی کو نقصان پہنچایا ہے تو اس کے بعد اس کو فائدہ پہنچایئے۔اگر آپ نے کسی کے دل کو دکھایا ہے تو اس سے معافی مانگ لیجئے۔اگر آپ نے کسی کے خلاف اکڑ دکھائی ہے تو اب اس کے سامنے جھک جایئے۔اگر آپ نے کسی کے ساتھ بداخلاقی کا معاملہ کیا ہے تو اس کے بعد اس کے ساتھ خوش اخلاقی کا معاملہ کیجئے۔اگر آپ نے کسی کو حقیر سمجھ لیا ہے تو اس کے بعد اس کو عزت کا مقام دیجئے۔اس طرح اپنے آپ برائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

037 — گناہ کیا ہے۔

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور اس کو کرتے ہوئے تم ڈرو کہ لوگ اس سے باخبر نہ ہو جائیں۔یہ گناہ کی ایک ایسی پہچان ہے جس کو ہر آدمی نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ہر آدمی کے اندر ضمیر ہے۔یہ ضمیر اتنا حساس ہے کہ وہ برائی کے وقت آدمی کو فوراً ٹوک دیتا ہے۔اگر آدمی ضمیر کی آواز کو سنے تو کبھی وہ گناہ نہ کرے۔اسی طرح جب کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس کو چھپا کر کرتا ہے۔اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی اسے جاننے نہ پائے۔جب بھی آدمی کے اندر اس قسم کا جذبہ پیدا ہو تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ایک ایسا کام کرنے جا رہا ہے جو اس کو نہیں کرنا چاہئے۔

038 — پڑوسی کا حق

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہو۔آدمی خواہ کہیں بھی ہو ہر وقت وہ کسی کے ساتھ ہوتا ہے۔یہ ساتھی لوگ اس کے پڑوسی ہیں۔ان پڑوسیوں کا یہ حق ہے کہ آپ سے انہیں کسی برائی کا تجربہ نہ ہو۔دوسرے لفظوں میں اس تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر انسان کو نو پرابلم انسان بن کر رہنا چاہئے۔اس کو سخت احتیاط کرنا چاہئے کہ اس کی ذات سے اس کے آس پاس کے لوگوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔تکلیف کا معیار یہ ہے کہ دوسروں کو شکایت کا

موقع نہ ملے۔ اگر آپ کے پاس کے لوگ کسی بات پر آپ سے شکایت کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسروں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں۔ دوسروں کی شکایت ہی پر آپ کو ایسے کام سے رک جانا چاہئے۔

039 — چھوٹوں سے شفقت بڑوں کا احترام

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو شخص ہمارے چھوٹوں کے ساتھ شفقت نہ کرے اور جو شخص ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ شریفانہ اخلاق کیا ہے اور اس کو سماج میں کس طرح قائم کیا جانا چاہئے۔

ہر سماج میں کوئی چھوٹا ہوتا ہے اور کوئی بڑا۔ عمر کے لحاظ سے بھی اور دوسرے لحاظ سے بھی۔ مثلاً اسکول اور کالج میں استاد کی حیثیت بڑے کی ہے اور طالب علم کی حیثیت چھوٹے کی۔ ایسے فرق والے سماج میں کس طرح اعتدال کے ساتھ زندگی گزاری جائے۔ اس کا سادہ اصول یہ ہے کہ — بڑے لوگ چھوٹوں کے ساتھ رحمت اور شفقت کا معاملہ کریں اور چھوٹے لوگ اپنے بڑوں کے ساتھ عزت اور احترام کا طریقہ اختیار کریں۔ جس سماج میں یہ دونوں اصول پائے جائیں اس سماج کے لوگوں میں ہر ایک خوش ہوگا اور ہر ایک دوسرے کے بارے میں اچھے خیالات کا مالک ہوگا۔

040 — عہد کو پورا کرنا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جب عہد کرو تو اس کو پورا کرو۔ عہد کے بارے میں خدا کے یہاں تم سے باز پرس کی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عہد کا معاملہ صرف دو انسانوں کے درمیان کا معاملہ نہیں ہے۔ اس معاملہ میں خدا بھی تیسرے فریق کی حیثیت سے شامل ہے۔

عہد یا معاہدہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ یا تو کسی سے عہد نہ کرے اور جب عہد کرے تو وہ اس کو ضرور پورا کرے۔ عہد نہ کرنا کوئی جرم نہیں۔ مگر عہد کرنے کے بعد اسے پورا نہ کرنا یقینی طور پر جرم ہے۔ حتیٰ کہ ایک معاہدہ کو توڑنا اتنا بڑا جرم ہے کہ وہ تمام انسانی معاہدوں کو توڑنے کے برابر ہے۔ کیوں کہ معاہدہ توڑنے کا ہر واقعہ معاہدہ کے احترام کی روایت کو توڑنا ہے۔ معاہدہ کے احترام پر سماجی انصاف کا پورا انظام قائم ہے۔ اگر معاہدہ کا احترام ختم ہو جائے تو سماج میں انصاف کے ماحول کا خاتمہ ہو جائے گا۔

041 — احسان کا بدلہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا: جب کوئی شخص تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کرے تو تم اس کا بدلہ دینے کی کوشش کرو۔ اور اگر تم بدلہ نہ دے سکو تو تم اس کے لیے خدا سے دعا کرو۔

یہ شرافت کا تقاضا ہے کہ جب ایک انسان کے ساتھ دوسرا انسان کوئی بھلائی کا معاملہ کرے تو وہ اس کے بدلہ میں خود بھی اس کے ساتھ بھلائی کرے۔ اگر وہ آدمی اپنے حالات کے لحاظ سے اس قابل نہ ہو کہ وہ تلافی کا عمل کر سکے تب بھی اس کے لئے تلافی کا ایک کام موجود ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے محسن کے حق میں خدا سے بہترین دعائیں کرے۔

042 — دوسرے کی مصیبت پر خوش نہ ہونا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اپنے بھائی کی مصیبت پر خوش نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ خدا اس پر رحم فرمائے اور تم کو مصیبت میں ڈال دے۔ اس حدیث میں لوگوں کو ایک ایسی اخلاقی برائی سے روکا گیا ہے جو خود اپنی ہلاکت کے ہم معنٰی ہے۔ کوئی انسان اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اس کو دیکھ کر آپ کے اندر ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے۔ آپ کو چاہئے کہ اس کی مدد کریں یا کم سے کم اس کے لئے دعا کریں۔ اس کے برعکس دوسرے کی مصیبت پر خوش ہونا ایک انتہائی پست بات ہے۔ وہ اخلاقی گراوٹ کی بدترین صورت ہے۔

مزید یہ کہ کوئی آدمی اگر دوسرے کی مصیبت پر خوش ہو تو اس کا یہ فعل خدا کو سخت ناپسند ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا ناراض ہو کر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ پہلے شخص کی مصیبت کو اس سے لے کر دوسرے شخص کے اوپر ڈال دی جائے۔ یہ بلاشبہہ کسی انسان کی بدنصیبی کی سب سے زیادہ بری صورت ہے۔

043 — اچھا گمان رکھنا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ حسن ظن بھی حسن عبادت کی ایک صورت ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے بارے میں اچھا گمان رکھنا اتنا بڑا عمل ہے کہ وہ عبادت کے برابر ہے۔

کسی کے بارے میں اچھا گمان رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ آدمی جب کچھ لوگوں کے

درمیان رہتا ہےتو بار بار ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو بدگمانی پیدا کرنے والی ہیں۔ جس کی وجہ سے دوسرے آدمی کی ایک بری تصویر ذہن میں بن جاتی ہے۔ ایسی حالت میں خوش گمانی کا معاملہ کوئی آسان معاملہ نہیں۔ وہی شخص دوسروں کے بارے میں خوش گمان رہ سکتا ہے جو بدگمانی کے باوجود خوش گمانی پر قائم رہنا جانتا ہو۔ جس کے اندر یہ بلندظرفی ہو کہ وہ کسی کے بارے میں بری خبریں سنے تب بھی وہ ایسا نہ کرے کہ اس کے خلاف بدگمان ہو کر بیٹھ جائے۔

044 — احسان ماننا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو شخص انسان کا شکر نہ کرے گا وہ خدا کا شکر بھی نہیں کرے گا۔ احسان کے اعتراف کا نام شکر ہے۔ یہ نفسیات اگر آدمی کے اندر موجود ہو تو اس کا اظہار بندوں کے معاملہ میں بھی ہوگا اور خدا کے معاملہ میں بھی۔ یہ ناممکن ہے کہ آدمی ایک کے اعتبار سے غیر شاکر ہو اور وہ دوسرے کے اعتبار سے شاکر بن جائے۔

احسان کا اعتراف کرنا ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ اس اعتراف کا نام شکر ہے۔ انسان کے اوپر سب سے بڑا احسان خدا کا ہے۔ اس لئے ہر انسان کو سب سے زیادہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس شکر کی پہچان یہ ہے کہ آدمی روزمرہ کی زندگی میں خود اپنے جیسے لوگوں کے احسان کا اعتراف کرتا ہو۔ جس آدمی کے اندر یہ اعتراف نہ پایا جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا کے احسان کے معاملہ میں بھی شکر کرنے والا نہیں۔ ایک اعتبار سے شکر اور دوسرے اعتبار سے ناشکری دونوں ایک دل کے اندر جمع نہیں ہو سکتے۔ آدمی کے اندر یا تو دونوں کے لیے شکر ہوگا یا دونوں کے لیے نہیں ہوگا۔

045 — غلطی کے بعد نادم ہونا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ ہر انسان خطا کار ہے اور بہتر خطا کار وہ ہے جو غلطی کر کے نادم ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل غلطی غلطی کرنا نہیں ہے بلکہ اصل غلطی غلطی کر کے اعتراف نہ کرنا ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی کو ایسے حالات میں زندگی گزارنا ہوتا ہے جس میں بار بار غلطی کرنے کا امکان ہوتا ہے۔ اس لیے صحیح انسان کی اصل پہچان یہ نہیں ہے کہ وہ کبھی غلطی نہ

کرے بلکہ یہ ہے کہ وہ غلطی پر اصرار نہ کرے۔ غلطی کرنے کے بعد فوراً اس کا ضمیر جاگ اٹھے۔ اپنی غلطی پر اس کے اندر شدید ندامت پیدا ہو جائے۔ غلطی کرنا اس کے لیے احتساب کے جذبہ کو جگانے کا ذریعہ بن جائے۔

046 — ضمیر کی آواز

پیغمبر اسلام سے آپ کے ایک ساتھی نے نیکی اور بدی کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے جواب دیا کہ تم اپنے دل سے فتوی لے لو، یعنی اپنے دل سے پوچھ کر جان لو۔ نیکی وہ ہے جس پر تمہارا دل مطمئن ہو اور بدی وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے۔ انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک صفت ہوتی ہے۔ یہ اس کا ضمیر ہے۔ ضمیر گویا سچائی کی عدالت ہے۔ ضمیر فوراً بتا دیتا ہے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا چیز ناحق۔ کون سا رویہ درست ہے اور کون سا رویہ نادرست۔ آدمی اگر صرف یہ کرے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کو سنے تو وہ اس کی رہنمائی کے لیے کافی ہو جائے گا۔

ضمیر ہمیشہ اپنا کام کرتا ہے۔ وہ ہر موقع پر بتاتا رہتا ہے کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا ٹھیک نہیں۔ اگر آدمی غفلت نہ برتے تو اس کا ضمیر ہی اس کو سچائی کے راستہ پر قائم رکھنے کے لیے کافی ہو جائے گا۔

047 — امانت ادا کرو

قرآن میں جو احکام آئے ہیں ان میں سے ایک حکم یہ ہے کہ اے لوگو، امانت داروں کو ان کی امانت ادا کرو، یہ قرآنی حکم ایک جامع حکم ہے اور اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے۔

امانت کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی کا مال آپ کے پاس بطور امانت ہو تو اس کو اس کے مالک تک ٹھیک ٹھیک پہنچانا فرض ہے۔ اسی طرح کسی تعلیم گاہ کا ایک معلّم بھی امین ہے اور طلبہ اس کی امانت میں ہیں۔ معلّم کو چاہئے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھے اور جو انسانی نسلیں اس کی امانت میں دی گئی ہیں ان کے حقوق ادا کرنے میں وہ کوئی کمی نہ کرے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی ملک کا حاکم بنے تو وہ ملک اس کی امانت میں آ گیا اور وہ اس کا امین بن گیا۔ ایسی حالت میں حاکم پر فرض ہے کہ وہ ان امیدوں کو پورا کرے، جن کے تحت اس کو یہ امانت دی گئی ہے۔

048 — امن کلچر

اسلام کی ایک تعلیم یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسرے شخص سے ملے تو دونوں ایک دوسرے کو السلام علیکم کہیں۔ یعنی تمہارے اوپر سلامتی ہو، تمہارے اوپر سلامتی ہو۔ اسلام دراصل امن کلچر ہے اور السلام علیکم کہنا اس امن کلچر کی ایک علامت۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر آدمی کے دل میں دوسرے کے لیے رحمت اور شفقت کے جذبات ہوں۔ ہر آدمی دوسرے آدمی کے لیے پرامن زندگی کی تمنا رکھتا ہو۔ ہر آدمی کی یہ کوشش ہو کہ اس کا سماج امن اور سلامتی کا سماج بن جائے۔ یہ اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تمام تعلیمات براہ راست یا بالواسطہ طور پر امن کے اصول پر مبنی ہیں کیوں کہ امن کے بغیر کوئی بھی تعمیری کام نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں امن نہ ہو وہاں ترقی بھی نہ ہوگی۔ امن کسی سماج کی ترقی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ پانی زمین کو زرخیز بنانے کے لیے۔

049 — امن پسندی

پیغمبر اسلام نے اپنی ایک نصیحت میں فرمایا: تم دشمن سے مدبھیڑ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ سے عافیت مانگو۔ اس حدیث میں زندگی کا ایک بنیادی اصول بتایا گیا ہے۔ اس اصول کی اہمیت فرد کے لیے بھی ہے اور قوم کے لیے بھی۔ کوئی انسان جب اجتماعی زندگی میں رہتا ہے تو ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات پیدا ہوتے ہیں حتیٰ کہ دشمنی کی صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ مگر یہ طریقہ درست نہیں کہ کوئی شخص دشمن نظر آئے تو آپ اس سے لڑنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ اس کے بجائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ دشمن سے بھی ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے بلکہ امن کے اصول پر چلتے ہوئے اس سے نباہ کرنے کی کوشش کی جائے۔

پرامن طریقہ ہر حال میں قابل عمل ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آدمی دشمنی کی صورت پیدا ہونے کے بعد منفی نفسیات کا شکار نہ ہو۔

050 — پرامن شہری

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ مسلم وہ ہے جس کے ہاتھ سے اور جس کی زبان سے لوگ محفوظ رہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا سچا بندہ وہ ہے جو سماج میں بے تشدد بن کر رہے۔ دوسروں کو نہ اس کی زبان سے کوئی چوٹ پہنچے اور نہ اس کے ہاتھ سے کسی کو تکلیف کا تجربہ ہو۔ یہ انسانیت کا کم سے کم معیار ہے۔ انسانیت کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ مرد اور عورت اپنے سماج میں اس طرح رہیں کہ ایک سے دوسرے کو فائدہ پہنچ رہا ہو۔ اور اگر کوئی شخص دوسروں کو فائدہ نہ پہنچا سکے تو اس کو کم از کم یہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنے سماج میں بے مسئلہ انسان بن جائے۔ وہ دوسروں کو اپنے ضرر سے بچائے۔

کوئی آدمی جب اپنی زبان یا اپنے ہاتھ سے دوسروں کو نقصان پہنچانے لگے تو وہ اپنی انسانیت کو کھو دیتا ہے۔ وہ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آجاتا ہے۔ انسانیت کا سچا معیار یہ ہے کہ آدمی اتنا حساس ہو کہ وہ دوسروں کے لیے ضرر رساں بننے کا تحمل نہ کر سکے۔

جو آدمی اس معاملہ میں حساس ہو وہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر خوش نہیں ہوگا بلکہ یہ سمجھے گا کہ میں نے خود اپنے آپ کو انسانیت کی سطح سے نیچے گرا لیا ہے۔ اگر کبھی اس کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو وہ فوراً شرمندہ ہو جائے گا اور نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کو اس وقت تک چین نہ آئے گا جب تک کہ وہ اپنے بھائی سے معافی نہ مانگ لے یا اپنی کوتاہی کی تلافی نہ کر لے۔

051 — نقصان سے بچو

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اسلام میں نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا۔ یہ حدیث ایک اہم اجتماعی اصول کو بتاتی ہے۔ اس اصول کا تعلق مرد سے بھی ہے اور عورت سے بھی، فرد سے بھی ہے اور جماعت سے بھی، وہ قومی زندگی کے لیے بھی ہے اور بین اقوامی زندگی کے لیے بھی۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کو مختلف حالات کے درمیان رہنا پڑتا ہے، کبھی موافق حالات اور کبھی مخالف حالات، کبھی خوشی کے حالات اور کبھی غم کے حالات۔ ایسی حالت میں کوئی مرد یا عورت دنیا میں کیسے رہے، اس کے لیے یہ ایک جامع اصول ہے۔ وہ یہ کہ ہر آدمی ایک طرف اس طرح بے ضرر بن کر رہے کہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے اور دوسری طرف وہ اتنا ہوشیار رہے کہ کسی دوسرے کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ اس کو نقصان پہنچا سکے۔

052 — زیادہ بڑی طاقت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ خدا نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔ ان الفاظ میں قدرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں نرمی اور عدم تشدد سے کام بنے اور سختی اور تشدد سے کام بگڑ جائے۔ نرمی اور عدم تشدد سے مفید نتیجہ نکلے اور سختی اور تشدد کا طریقہ بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔

سختی اور تشدد کا طریقہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کافی ہو سکتا ہے مگر وہ کسی تعمیری مقصد کے حصول کے لیے مفید نہیں۔ تعمیر و ترقی کا کام ایک ایسا طریقِ کار چاہتا ہے جو شروع کرنے کے بعد مسلسل جاری رہے۔ پائدار عمل کی یہ صفت صرف غیر متشددانہ طریق کار میں پائی جاتی ہے۔

053 — صلح بہتر ہے

قرآن کی ایک آیت میں لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ — صلح بہتر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی نزاعی معاملہ پیش آئے تو اس وقت بہتر یہ ہے کہ لوگ ٹکراؤ کے طریقہ کو اختیار نہ کریں بلکہ مفاہمت کے طریقہ کو اختیار کریں۔ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی نزاع پیش آجاتی ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں کے لیے دو ممکن طریقہ ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ٹکراؤ اور تشدد کے ذریعہ اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے اور دوسرا یہ کہ پرامن گفت وشنید کے ذریعہ آپس میں مصالحت کر لی جائے اور نزاع کو ابتدائی مرحلہ ہی میں ختم کر دیا جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مصالحت کا طریقہ ہی دونوں فریقوں کے لیے مفید ہے۔ ٹکراؤ کا طریقہ ہمیشہ الٹا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں آپس کی نفرت بڑھتی ہے۔ اور جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے وہ بھی حل نہیں ہوتا۔ اگر لوگ معاملہ کو نتیجہ کے پہلو سے دیکھیں تو وہ کبھی ٹکراؤ کا راستہ اختیار نہ کریں، کیوں کہ ٹکراؤ کا راستہ آدمی کو تباہی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچاتا۔

054 — سماجی خدمت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا کے جو سچے بندے ہیں ان کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہوتا

ہے۔ سائل سے مراد وہ شخص ہے جو بول کر سوال کرے اور محروم سے مراد وہ شخص ہے جو خواہ سوال نہ کرے مگر اس کی معذوری اپنے آپ ایک عملی سوال بن گئی ہو۔

خدا کے سچے بندے اپنی کمائی کو اس وقت تک اپنے لئے درست نہیں سمجھتے جب تک وہ اس میں سے سائل اور محروم کو اس کا حصہ نہ دے دیں۔ یہ تعلیم ہر انسان کو اپنے سماج کا خادم بنا دیتی ہے۔ وہ جس سماج سے اپنے لیے لیتا ہے، اس سماج کو دینا بھی وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔

سائل سے مراد عام ضرورت مند ہیں۔ محروم سے مراد خاص طور پر وہ لوگ ہیں جو کسی وجہ سے معذور (disabled) ہو گئے ہوں۔ معذور لوگوں کی خدمت کرنا اسلام کے نزدیک صرف سماجی خدمت نہیں ہے۔ یہ خود اپنے آپ کو خدا کی ابدی رحمت کا مستحق بنانا ہے۔

055 — تمام انسان ایک

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ سن لو کہ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور سن لو کہ آدم مٹی سے تھے۔ یہ حدیث اس حقیقت کا اعلان ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ ان میں کچھ ظاہری فرق ہو سکتے ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے ایک اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں۔

یہ حدیث انسانی تعلقات کے ایک اہم اصول کو بتاتی ہے۔ اور وہ مساوات کا اصول ہے۔ سارے انسان جب ایک ہی مادّہ سے پیدا ہوئے ہیں اور سب ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہیں تو ان میں تفریق اور امتیاز اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے مطابق، تمام مرد ایک دوسرے کے خونی بھائی (blood brothers) ہیں۔ اور تمام عورتیں ایک دوسرے کے لیے خونی بہن (blood sisters) ہیں۔ یہ اصول انسان اور انسان کے درمیان امتیاز کی تمام بنیادوں کو ڈھا دیتا ہے۔

056 — مشورہ کی اہمیت

قرآن میں معاملات پر مشورہ کی تاکید کی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام کے بارے میں روایت میں آتا ہے کہ آپ معاملات میں ہمیشہ لوگوں سے مشورہ کرتے تھے۔ مشورہ کیا ہے۔ مشورہ یہ ہے کہ کسی پیش آمدہ مسئلہ میں ہر ایک کی رائے معلوم کی جائے۔ اس طرح ہر آدمی کا علم اور تجربہ سامنے آ جاتا ہے

اور یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ زیادہ بہتر انداز میں معاملہ کو حل کرنے کی تدبیر کی جائے۔ زیادہ صحیح منصوبہ بندی کے ساتھ کام کا آغاز کیا جائے۔ مشورہ کے بغیر جو کام کیا جائے وہ ایک شخص کی سوچ پر مبنی ہوگا اور مشورہ کے بعد جو کام کیا جائے اس میں کئی لوگوں کی سوچ شامل ہوجائے گی۔

مشورہ دراصل اجتماعی سوچ کا دوسرا نام ہے۔ انفرادی سوچ اور اجتماعی سوچ میں جو فرق ہے وہی فرق مشورہ کے بغیر کام اور مشورہ کے ساتھ کام میں پایا جاتا ہے۔ مختلف اسباب سے ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کا ذہن ہر پہلو کو سمجھ نہیں پاتا۔ مشورہ اسی کمی کی تلافی ہے۔ مشورہ کے ذریعہ یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ معاملات میں زیادہ درست رائے تک پہنچا جائے۔ پیشگی طور پر غلطیوں سے بچنے کی تدبیر کر لی جائے۔ مشورہ کامیاب منصوبہ بندی کا ایک اہم جزء ہے۔

057 — ترک کلام نہیں

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال بند رکھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی سے جھگڑا ہوجائے اور ترک کلام کی نوبت آجائے تو زیادہ سے زیادہ اس کو تین دن کی معافی مل سکتی ہے۔ تین دن سے زیادہ بول چال بند رکھنا کسی حال میں جائز نہیں۔ اس معاملہ میں تین دن کی رخصت اس لیے دی گئی ہے کہ غصہ زیادہ سے زیادہ تین دن تک رہ سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ انا کا سوال بن جاتا ہے۔ کسی کو غصّہ کی معافی مل سکتی ہے مگر اَنانیت کی معافی کسی کے لیے نہیں۔ غصہ ایک فطری کمزوری ہے جو وقتی طور پر پیدا ہوتی ہے مگر انانیت ایک برائی ہے۔ انانیت ایک سرکشی کا معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غصہ قابل معافی ہے مگر انانیت اور سرکشی قابل معافی نہیں۔ وقتی غصہ کے لئے آدمی کے پاس عذر ہوسکتا ہے مگر انانیت اور سرکشی ایک ایسا جرم ہے جس کے لیے کوئی بھی قابل قبول عذر موجود نہیں۔

058 — ماننے سے پہلے جانچنا

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ جب تمہیں کسی کے بارے میں کوئی خبر ملے تو پہلے اس کی تحقیق کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کے بغیر کسی خبر کو مان لینا ایک غیر ذمہ داری کا فعل ہے۔

عام طور پر لوگوں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ جو سنا یا جو کچھ پڑھا اس کو فوراً مان لیا۔ حالاں کہ تجربہ بتاتا ہے کہ خبر دینے والا اکثر ایسا کرتا ہے کہ وہ ساری بات کو جانے بغیر خبر نشر کر دیتا ہے۔ جب کہ تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ خبر بھی ادھوری تھی اور اس سے جو نتیجہ نکالا گیا وہ بھی ادھورا تھا۔

تحقیق کے بغیر کسی خبر کو مان لینا اکثر حالات میں نقصان کا سبب ہوتا ہے۔ اس سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ایک غلط خبر لڑائی اور فساد کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسی حالت میں ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ خبر کی پوری تحقیق کی جائے، تحقیق کے بغیر کسی خبر کو درست نہ مان لیا جائے۔

059 — تمام انسان بھائی بھائی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اے خدا، میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ حدیث انسانی تعلق کی بنیاد کو بتاتی ہے۔ اس کے مطابق، تمام دنیا کے لوگ ایک خاندان کے مانند ہیں۔ ہر ایک کو چاہئے کہ وہ دوسرے کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ اپنے گھر کے اندر اپنے بھائی سے کرتا ہے۔ یہ اصول عالمی برادری کا اصول ہے۔ یہ اصول اپنے اور غیر کی تقسیم کو مٹا دیتا ہے۔ اس کے بعد سب اپنے ہو جاتے ہیں۔ کوئی کسی کا غیر نہیں رہتا۔ یہ اصول تمام انسانی نسل کو ایک ایسے مضبوط رشتے میں باندھ دیتا ہے جس سے زیادہ مضبوط کوئی اور رشتہ نہیں۔

060 — تین چیزیں حرام

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ ایک انسان پر دوسرے انسان کی تین چیزیں حرام ہیں — اس کا خون اور اس کا مال اور اس کی آبرو۔ یہ اصول ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان آزادی کی حد قائم کرتا ہے۔ ہر انسان آزاد ہے۔ مگر اس کی آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں وہ دوسرے کی جان مال اور آبرو کے لیے خطرہ بن جائے۔

انسان کو اس دنیا میں آزادی دی گئی ہے کیوں کہ آزادی کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ آزادی محدود ہے نہ کہ لامحدود۔ کسی آدمی کو اسی وقت تک آزادی حاصل ہے جب تک وہ دوسرے کی

جان مال اور آبرو کو نقصان نہ پہنچائے۔ جیسے ہی کوئی آدمی ان تین چیزوں میں دوسروں کے لیے خطرہ بنے، اس کی آزادی ختم ہو جائے گی۔ وہ آزادی کے فطری حق سے محروم قرار دے دیا جائے گا۔

061 — ہر شخص ذمہ دار ہے

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ سن لو، تم میں سے ہر شخص ایک چرواہا ہے۔ اور تم میں سے ہر شخص سے اس کے گلّہ کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اس حدیث میں چرواہے اور گلّے کی مثال سے زندگی کی ایک حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ جس طرح چرواہے کا گلّہ ہوتا ہے اسی طرح ہر انسان کا اپنے حالات کے اعتبار سے ایک گلّہ ہے۔ اور اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے اس گلّہ کی چرواہی میں اپنی ذمہ داری کو پورا کرے۔

مثلاً ایک گھر کا جو بڑا شخص ہے اس کا گلّہ اس کا خاندان ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے خاندان کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھائے۔ اسی طرح ایک اسکول یا کالج کا ایک ٹیچر اپنے طلبہ کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ طلبہ کے حق میں اپنی تعلیمی ذمہ داری کو بھرپور طور پر ادا کرے۔ اسی طرح ایک لیڈر اپنے پیروؤں کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ جو لوگ اس کا ساتھ دے رہے ہیں وہ پوری طرح ان کا خیر خواہ بنے۔ اسی طرح کسی ادارے کا صدر اپنے ادارے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ ان متعلقین ادارہ کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرے۔

062 — ہر ایک کی مدد

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ لوگوں نے پوچھا کہ مظلوم کی مدد کرنا تو ہم جانتے ہیں مگر ہم ظالم کی مدد کیسے کریں۔ آپ نے فرمایا کہ تم ظالم کو اس کے ظلم سے روکو۔ اسلام ہر انسان کے اندر یہ اسپرٹ پیدا کرنا چاہتا ہے کہ وہ دوسرے انسان کا خیر خواہ ہو۔ اسی خیر خواہی کی عملی صورت کا نام مدد ہے۔ مظلوم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے بچایا جائے۔ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو اس کے ظلم سے روکا جائے۔ ظلم سے روکنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ٹکراؤ شروع کر دیا جائے۔ ظالم کی حقیقی مدد یہ ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے دعا کی جائے۔ اس کو خیر خواہانہ

نصیحت کی جائے۔ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ ظلم کو چھوڑنے پر راضی ہو جائے۔ ظالم کی مدد ظالم سے نفرت کرنا نہیں ہے بلکہ ظالم کے ساتھ خیر خواہی کرنا ہے۔ نفرت ظلم کو بڑھاتی ہے اور خیر خواہی ظلم کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

063 — نرم سلوک

پیغمبر اسلام نے اپنے ساتھیوں کو ایک مہم پر بھیجا اور ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا کیوں کہ تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، تم دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ اس حدیث کا تعلق ہر شعبہ میں کام کرنے والوں سے ہے۔ اس میں ہر ایک کے لیے نصیحت ہے۔ مثلاً ایک افسر کو اپنے ماتحتوں کے ساتھ اسی اصول پر کام کرنا ہے۔ ایک ٹیچر کو اپنے طلبہ کے ساتھ یہی معاملہ کرنا ہے۔ ایک منیجر کو اپنی کمپنی والوں کے ساتھ اسی طرح پیش آنا ہے، وغیرہ۔

ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اس نصیحت کو دھیان میں رکھے۔ وہ یہ سمجھے کہ وہ جہاں ہے وہاں اس کو خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ اسے لوگوں کو مشکل میں نہیں ڈالنا ہے بلکہ ان کے لیے آسانی کا راستہ تلاش کرنا ہے۔

064 — رحم کا فارمولا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ تم زمین والوں کے اوپر رحم کرو، آسمان والا تمہارے اوپر رحم کرے گا۔ یہ ایک سادہ اصول ہے جو ہر مرد اور عورت کے اندر خیر کے کام کا وہ جذبہ ابھارتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

ہر انسان خدا کی مدد کا محتاج ہے۔ ہر عورت اور مرد کو ضرورت ہے کہ وہ زندگی کے مختلف مراحل میں خدا کی مدد پاتا رہے۔ کوئی بھی شخص اس دنیا میں خدا کی مدد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اپنے آپ کو خدا کی مدد کا مستحق بنانے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ آدمی جو کچھ خود اپنے لئے خدا سے چاہتا ہے وہی وہ دوسروں کو دینے لگے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدا اس کی مدد کرے تو اس کو بھی چاہئے کہ وہ دوسروں کا مددگار بن جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدا اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے تو وہ بھی دوسروں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدا اس کی کوتاہیوں سے درگزر کرے تو اس کو

چاہئے کہ وہ بھی دوسروں کی کوتاہیوں سے درگزر کرتا رہے۔

انسان کے ساتھ نرمی اور شفقت کا معاملہ کرنا گویا ایک عملی دعا ہے۔ یہ عمل کی زبان میں خدا سے یہ کہنا ہے کہ خدایا، میں نے تیرے بندوں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا معاملہ کیا، تو تو بھی میرے ساتھ نرمی اور شفقت کا معاملہ فرما۔

065 — باہمی احترام

قرآن میں پیغمبر کی زبان سے کہلایا گیا ہے کہ اے لوگو، تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ کسی سماج میں جب کئی مذہب کے لوگ رہتے ہوں تو ان کے درمیان معتدل ماحول کس طرح قائم کیا جائے۔ اس کا سادہ فارمولا یہ ہے کہ — ایک کی پیروی کرو اور ہر ایک کا احترام کرو: Follow one and respect all.

مشترک مذہبی سماج میں امن قائم کرنے کا یہی واحد اصول ہے۔ یہ دنیا اختلاف کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں اختلافات کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں قابل عمل فارمولا صرف ایک ہے اور وہ tolerance ہے۔ یعنی ہر ایک کو یہ حق دینا کہ وہ اپنی پسند کے مطابق، مذہب یا کلچر کو اختیار کرے۔ اختلاف کے موضوع پر ایک دوسرے سے پرامن ڈائیلاگ ہوسکتا ہے مگر اختلاف کو مٹانے کی کوشش صرف مزید اختلاف پیدا کرے گی، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

066 — مذہبی احترام

پیغمبر اسلام کے زمانہ میں مدینہ میں کچھ یہودی قبیلے آباد تھے۔ ایک دن پیغمبر اسلام نے دیکھا کہ ایک راستے سے ایک جنازہ گزر رہا ہے۔ پیغمبر اسلام اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ جنازہ کو دیکھ کر آپ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ آپ کے ایک ساتھی نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا وہ انسان نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان ہر حال میں قابل احترام ہے، خواہ وہ ایک مذہب کا ہو یا دوسرے مذہب کا، وہ ایک قوم کا فرد ہو یا دوسری قوم کا۔ کسی بھی عذر کی بنا پر اس کا احترام ختم نہیں کیا

جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان ایک ہی خدا کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے تمام انسان یکساں طور پر قابل احترام ہیں۔

067 — دشمن میں دوست

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص تم کو اپنا دشمن دکھائی دے تو تم اس سے جوابی دشمنی نہ کرو بلکہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس یک طرفہ سلوک کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔ اسلام کی یہ تعلیم بتاتی ہے کہ دشمنی کوئی ابدی چیز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دشمن انسان میں ایک دوست انسان چھپا ہوا ہے۔ اپنے یک طرفہ حسن سلوک سے اس امکان کو واقعہ بناؤ، اپنے دشمن کو اپنے دوست میں تبدیل کرلو۔

جوابی حسن سلوک آدمی کے ضمیر کو جگاتا ہے اور جس آدمی کا ضمیر جاگ اٹھے وہ اس کے سوا کسی روش کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ دشمنی کو چھوڑ کر آپ کا دوست بن جائے۔

068 — نرمی کے بغیر

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو شخص نرمی سے محروم ہے وہ ہر بھلائی سے محروم ہے۔ یہ حدیث ایک جامع اخلاقی اصول کو بتاتی ہے اور وہ بات چیت اور تعلقات میں نرمی ہے۔

جو آدمی نرمی کا انداز اختیار کرے وہ ہر معاملے میں اور ہمیشہ کامیاب رہے گا۔ کیوں کہ کوئی شخص ایسے آدمی کا دشمن نہیں بنے گا۔ اس کے برعکس جو آدمی دوسروں سے معاملہ کرنے میں نرمی کا انداز نہ برتے اس کا ہر کام بگڑتا چلا جائے گا کیوں کہ اس سے ہر ایک کو شکایت ہو جائے گی۔ اس کو مخالفوں اور دشمنوں کے درمیان رہنا پڑے گا۔ وہ گھر کے اندر اور باہر دونوں جگہ غیر ضروری مسائل میں الجھا رہے گا۔

069 — سادگی کی عظمت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ سادگی ایمان کا ایک حصہ ہے۔ سادگی کو ایمان کا حصہ بتانا سادگی کی انتہائی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ سادگی بامقصد انسان کا طریقہ ہے۔ بامقصد انسان اس کا تحمل نہیں کرسکتا

کہ وہ سہولت اور عیش کی چیزوں میں مشغول ہو جائے اور اس طرح اپنے وقت اور طاقت کا ایک حصہ اس میں لگادے۔ سادگی کا مطلب ہے — اپنی ضرورت کو بالکل ناگزیر چیزوں تک محدود رکھنا۔ اپنے آپ کو کسی غیر ضروری چیز کا عادی نہ بنانا، اپنے آپ کو آرام والی چیزوں سے دور رکھنا۔ سادگی دراصل ایک اعلیٰ تدبیر ہے۔ سادگی کے ذریعہ یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ آدمی اپنی زندگی کو مکمل طور پر صرف اپنے مقصد میں لگائے۔ اس کی زندگی کا کوئی حصہ مقصد کے علاوہ کسی اور چیز میں ضائع نہ ہو۔

کسی انسان کی ترقی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ اس کے اندر سوچنے کا عمل (thinking process) بلا روک ٹوک جاری رہے۔ سادگی اس ذہنی عمل میں بے حد مددگار ہے۔ سادگی آدمی کے ذہن کو ہر دوسری چیز سے فارغ رکھتی ہے۔

070 — صفائی کی اہمیت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ صفائی بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صاف ستھرا رہنا اور اپنے ماحول کو صاف ستھرا بنانا اسلام میں کتنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

اسلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی اپنے قلب اور روح کو پاک کرے۔ وہ برے خیالات کو چھوڑ کر پاکیزہ خیالات میں جینے لگے۔ وہ اپنے داخلی وجود کو اسی طرح اچھے خیالات سے پاکیزہ بنائے جس طرح کوئی شخص اپنے جسم کو پانی سے دھو کر پاکیزہ بناتا ہے۔

کوئی آدمی جب اپنے داخل کو صاف ستھرا بنائے گا تو فطری طور پر وہ یہ چاہے گا کہ اس کا خارج بھی صاف ستھرا رہے۔ وہ اپنے جسم اور اپنے کپڑے کی صفائی کا اہتمام کرے گا۔ وہ اپنے گھر اور اپنے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرے گا۔ صفائی ایسے انسان کا مستقل مزاج بن جائے گی۔

071 — بیچ کا راستہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ سب سے بہتر طریقہ بیچ کا طریقہ ہے (خير الامور اوسطها) اس تعلیم کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بہتر راستہ بیچ کا راستہ (middle path) ہے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کو بہت سے لوگوں کے درمیان زندگی گزارنا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں

بہتر طریقہ وہ ہے جس میں آدمی کا راستہ کسی رکاوٹ کے بغیر طے ہوتا رہے اور کسی سے ٹکراؤ بھی پیش نہ آئے۔ اسی راستہ کو بیچ کا راستہ کہا جاتا ہے۔ بیچ کا طریقہ ہمیشہ معتدل طریقہ ہوتا ہے۔ معتدل طریقہ ہمیشہ قابل عمل ہوتا ہے۔ ایسے طریقہ میں آدمی اپنے آپ کو کسی بڑے خطرہ میں ڈالے بغیر آگے بڑھ سکتا ہے۔ معتدل طریقہ میں کسی ایسے بڑے نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا جس کے بعد آدمی کا پورا منصوبہ بکھر جائے اور آخر کار وہ مایوسی کا شکار ہو کر بیٹھ جائے۔

072 — تواضع سے بلندی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو شخص تواضع کا طریقہ اختیار کرے خدا اس کو بلندی عطا کرتا ہے۔ یہ خدا کا مقرر کیا ہوا ایک قانون ہے۔ اس کے مطابق، تواضع کی روش آدمی کے لیے ترقی کے راستے کھولتی ہے۔ اس کے برعکس گھمنڈ کا طریقہ آدمی کو پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ تواضع کا فائدہ دوطرفہ ہے۔ تواضع کرنے والے کو اس کا یہ فائدہ ملتا ہے کہ اس کے اندر روحانیت جاگتی ہے، اس کے اندر اعلیٰ انسانی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ وہ خدا کے فیضان کو وصول کرنے لگتا ہے۔ اس کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ چیزوں کو بے آمیز انداز میں دیکھ سکے۔

وہ شخص جس سے تواضع کا معاملہ کیا جائے وہ اپنے ضمیر کی آواز کے تحت تواضع کرنے والے کی عظمت کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے مقابلہ میں سرکشی کرنے کا جذبہ کھو دیتا ہے۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کی اخلاقی بڑائی کو مانے۔ وہ اپنے مقابلہ میں اس کو زیادہ بڑا انسانی درجہ دے۔

تواضع صرف ایک روش ہے۔ اس میں آدمی کو کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ تواضع کر کے اسے کچھ کھونا نہیں پڑتا۔ مگر کچھ نہ کھو کر وہ سب کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ تواضع کے خلاف روش اگر جھوٹی بڑائی ہے تو تواضع کے مطابق روش سچی انسانیت۔

073 — فضول خرچی نہیں

قرآن میں اسراف (فضول خرچی) سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی حقیقی ضرورت کے بغیر خرچ کرنا۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ یہ بھی اسراف ہے کہ تم ہر وہ چیز کھاؤ جس کو کھانے کی خواہش تمہارے

دل میں پیدا ہو۔(إن من السرف أن تأکل کل مااشتهیت)

آدمی اپنی کمائی کو اگر حقیقی ضرورتوں میں خرچ کرے تو یہ اس کا جائز حق ہے۔ لیکن اگر وہ خواہش اور لذت کی بنا پر خرچ کرنے لگے تو پھر اس کا حق کسی کو نہیں۔ خدا نے اگر کسی کو زیادہ مال دیا ہے تو اس لیے نہیں دیا ہے کہ وہ اس کو صرف اپنے اوپر خرچ کرتا رہے۔ مال خدا کی امانت ہے اور اس کو چاہئے کہ اس امانت کو وہ انہی مدوں میں خرچ کرے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کی ہیں۔ جو آدمی ایسا نہ کرے وہ گویا خدا کی امانت میں پورا نہیں اترا۔

074 — اجتماعی برکت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ ایک شخص کا کھانا دو آدمی کے لیے کافی ہے اور دو آدمی کا کھانا تین آدمی کے لیے کافی ہے۔ اس حدیث میں مل جل کر رہنے اور اجتماعی طور پر عمل کرنے کی برکت کو بتایا گیا ہے۔

اس حدیث میں کھانے کی مثال ایک علامتی مثال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ لوگ اگر ایک دوسرے کے ساتھ شرکت کرکے کام کریں اور مل جل کر رہیں تو تھوڑے لوگ بھی زیادہ بڑے بڑے کام کریں گے۔ تھوڑے سرمایہ میں بھی بہت سے لوگوں کو نفع حاصل ہوگا۔ کم وسائل میں بھی زیادہ فائدہ حاصل کرنا ممکن ہو جائے گا۔ ہر آدمی اگر الگ الگ اپنا کام کرے تو وہ محدود طور پر صرف اپنے آپ کو فائدہ پہنچائے گا۔ لیکن یہی افراد اگر ایک دوسرے کو شریک کرکے کام کرنے لگیں تو مجموعی طور پر سب کو ایک دوسرے سے فائدہ پہنچے گا۔

075 — انصاف کا تقاضا

پیغمبر اسلام نے ایک بار مدینہ کے ایک شخص سے قرض لیا۔ اس کے بعد وہ ایک دن آیا اور آپ سے قرض کی ادائیگی کے لیے سخت زبان استعمال کی۔ پیغمبر اسلام کے ساتھیوں نے چاہا کہ اس کو اس گستاخی کی سزا دیں۔ مگر آپ نے انہیں روک دیا۔ آپ نے کہا کہ حق دار کو بولنے کا اختیار ہے۔

یہ دوسرے کے ساتھ رعایت کرنے کا سبق ہے۔ دوسرا آدمی اگر کسی وجہ سے غصہ میں آجائے یا سخت کلامی کرے تو سننے والے کو اس کے ساتھ رعایت کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اگر آدمی دوسرے کی

سخت کلامی کو سننے کے لیے تیارنہیں تو اس کو چاہئے کہ وہ اس سے قرض جیسا معاملہ بھی نہ کرے۔قرض لینے کے بعد اس کو بہر حال قرض دینے والے کو یہ حق دینا ہوگا کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار جس طرح کرنا چاہتا ہے کرے۔اس طرح کے معاملہ میں قرض لینے والے کو تحمل کی روش اختیار کرنا چاہئے۔وہ ایسا نہیں کرسکتا کہ برعکس طور پر وہ قرض دینے والے کو تحمل کی نصیحت کرے۔

076 — حق سے زیادہ نہ لینا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ دو آدمی اگر میرے پاس ایک زمین کا مقدمہ لے کر آئیں۔ان میں سے ایک شخص زیادہ ہوشیاری کے ساتھ اگر اپنا مقدمہ پیش کرے اور اس کی وجہ سے زمین اس کو دے دی جائے، جب کہ حقیقت میں وہ زمین اس کی نہ ہو تو گویا کہ اس کو آگ کا ایک ٹکڑا دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز آدمی کا واقعی حق نہ ہو، اس کے معاملہ میں اگر وہ کسی تدبیر سے اپنے موافق عدالتی فیصلہ لے لے تب بھی وہ چیز اس کی نہ ہوگی۔کوئی عدالتی فیصلہ حقیقت کو نہیں بدل سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز پر ناجائز قبضہ ہر حال میں برا ہے۔عدالت کا کوئی فیصلہ ناجائز کو جائز نہیں بنا سکتا۔اگر آدمی کا ضمیر یہ کہتا ہو کہ فلاں چیز میری نہیں ہے تو ایسی حالت میں اس کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ اس چیز کو حق دار کے حوالہ کردے، نہ کہ غلط تدبیر کے ذریعہ ناجائز طور پر دوسرے کی چیز پر قابض ہونے کی کوشش کرے۔ضمیر سب سے بڑی عدالت ہے۔سب سے بڑا فیصلہ وہ ہے جو ضمیر کی عدالت سے جاری کیا جائے۔

077 — جو اپنے لیے وہی دوسروں کے لیے

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ مومن وہ ہے جو دوسروں کے لیے بھی وہی پسند کرے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔یہ سماجی اخلاق کا ایک نہایت جامع اصول ہے۔ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے کون سا رویہ اس کو پسند ہے اور کون سا رویہ ناپسند۔ایسا ہی وہ دوسروں کے ساتھ کرنے لگے۔وہ دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرے جو سلوک وہ اپنے لیے چاہتا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس سلوک سے بچے جس کو وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔

سماجی اخلاق کا یہ اصول اتنا سادہ اور فطری ہے کہ وہ ہر عورت اور ہر مرد کو معلوم ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ہر آدمی اس معاملہ میں حسّاس ہو جائے۔ جس حسّاسیت کا مظاہرہ وہ اپنے بارے میں کرتا ہے اس حسّاسیت کا مظاہرہ وہ دوسروں کے بارے میں کرنے لگے۔ لوگ اگر اس ایک اخلاقی اصول کو پکڑ لیں تو پورا سماج خیر و امن کا سماج بن جائے۔

078 — معاشی استقلال

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ خدا جب کسی کے لیے رزق کا ایک ذریعہ بنائے تو وہ خود سے اسے نہ چھوڑے، اِلّا یہ کہ حالات کی مجبوری کی وجہ سے اسے چھوڑنا پڑے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق، رزق کا تعلق خدا سے ہے۔ اس لیے جب کسی انسان کو رزق کا ایک ذریعہ مل جائے تو خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ اس پر قائم رہے۔ اگر وہ کسی حقیقی سبب کے بغیر اس کو چھوڑے گا تو وہ خدا کی مدد سے محروم ہو جائے گا۔

معاشی زندگی میں کامیابی کا راز استقامت ہے۔ اس حدیث میں اسی استقامت اور استقلال کی تعلیم دی گئی ہے۔ معاشی زندگی میں کامیابی ہمیشہ لمبی مدت تک محنت کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ حال کے بجائے مستقبل پر نظر رکھے۔ اس طرح اس کے اندر استقلال پیدا ہوگا اور وہ ضرور کامیابی کے درجے تک پہنچے گا۔ یہ حدیث گویا اس بات کی تعلیم ہے کہ معاشی سرگرمیوں میں مستقبل بینی کا مزاج پیدا کرو۔ صرف حال کو دیکھ کر بے حوصلہ نہ ہو جاؤ۔

079 — رزق خدا کی طرف سے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمین پر جتنے بھی جاندار ہیں ہر ایک کی روزی خدا کے ذمّے ہے۔ پیغمبر اسلام نے کہا کہ خدا نے کسی مرد یا عورت کا جو رزق لکھ دیا ہے کوئی اس کو چھین نہیں سکتا۔ کوئی شخص نہ اس میں کمی کر سکتا ہے اور نہ زیادتی۔ یہ اعلان ہر مرد اور عورت کو رزق کی گارنٹی دے رہا ہے جس کو کوئی اس سے چھیننے والا نہیں۔ جس آدمی کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے اس کو اس کے ذریعہ دو فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک طرف اس کو یہ یقین حاصل ہوگا کہ جو کچھ اسے مل رہا ہے وہ اس کو بہر حال مل کر رہے گا۔ اس عقیدہ کی بنا پر وہ دنیا میں اس بھروسہ کے ساتھ کام کرے گا کہ میری کوششوں کا نتیجہ مجھے ضرور ملنے والا

ہے۔کوئی بھی اتنا طاقت ورنہیں کہ وہ میرے اور میرے رزق کے درمیان حائل ہو سکے۔رزق میرا ایک ایسا حق ہے جو خود دنیا کے مالک نے میرے لیے لکھ دیا ہے۔پھر کون ہے جو اس لکھے کو مٹا سکے۔

یہ عقیدہ آدمی کے اندر سے مایوسی کے احساس کو نکال دیتا ہے۔وہ عین مسائل کے درمیان کھڑا ہو کر کہہ سکتا ہے کہ — کوئی شخص میرے ایک جاب کو مجھ سے چھین سکتا ہے مگر کوئی شخص اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ میری قسمت کو مجھ سے چھین سکے۔

One can take away my job. But no one
has the power to take away my destiny.

080 — قناعت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ وہ شخص کامیاب ہوا جس کو خدا نے ضرورت کے بقدر رزق دیا اور وہ اس رزق پر قانع رہا۔اس سے معلوم ہوا کہ کامیابی کا راز ملے ہوئے پر قانع رہنا ہے نہ کہ نہ ملے ہوئے کے غم میں پڑے رہنا۔دنیا میں جب بھی کوئی شخص صحیح اصول کے مطابق کمانے کی کوشش کرے تو وہ ضرور اتنی معاش حاصل کر لیتا ہے جو اس کی ضرورتوں کے لیے کافی ہو۔اگر وہ اس ملے ہوئے پر راضی ہو جائے تو اس کا فائدہ اس کو ذہنی سکون کی صورت میں ملے گا۔لیکن سکون ہمیشہ قناعت سے ملتا ہے اور قناعت کا مطلب ہے ملے ہوئے پر راضی ہو جانا۔

اس کے برعکس جو شخص ملے ہوئے کو کم سمجھے اور نہ ملے ہوئے کی طرف دوڑتا رہے وہ کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔اس لئے کہ دنیا میں چیزوں کی کوئی حد نہیں۔آدمی خواہ کتنی ہی زیادہ چیزوں کو اپنے پاس جمع کر لے پھر بھی کچھ چیزیں باقی رہیں گی جو اس کو یہ لالچ دلائیں گی کہ مجھے یہ بھی حاصل کرنا چاہئے۔اس طرح وہ ہمیشہ اور زیادہ کی لالچ میں پڑا رہے گا۔وہ اسی طرح بے سکونی کی زندگی جئے گا یہاں تک کہ وہ اسی حال میں مر جائے گا۔

081 — کسی سے نہ مانگنا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ تم کسی سے کچھ نہ مانگو۔کیوں کہ نیچے کے ہاتھ کے مقابلہ میں اوپر کا

ہے۔کوئی بھی اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ میرے اور میرے رزق کے درمیان حائل ہو سکے۔ رزق میرا ایک ایسا حق ہے جو خود دنیا کے مالک نے میرے لیے لکھ دیا ہے۔ پھر کون ہے جو اس لکھے کو مٹا سکے۔

یہ عقیدہ آدمی کے اندر سے مایوسی کے احساس کو نکال دیتا ہے۔ وہ عین مسائل کے درمیان کھڑا ہو کر کہہ سکتا ہے کہ — کوئی شخص میرے ایک جاب کو مجھ سے چھین سکتا ہے مگر کوئی شخص اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ میری قسمت کو مجھ سے چھین سکے۔

One can take away my job. But no one
has the power to take away my destiny.

080 — قناعت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ وہ شخص کامیاب ہوا جس کو خدا نے ضرورت کے بقدر رزق دیا اور وہ اس رزق پر قانع رہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کامیابی کا راز ملے ہوئے پر قانع رہنا ہے نہ کہ نہ ملے ہوئے کے غم میں پڑے رہنا۔ دنیا میں جب بھی کوئی شخص صحیح اصول کے مطابق کمانے کی کوشش کرے تو وہ ضرور اتنی معاش حاصل کر لیتا ہے جو اس کی ضرورتوں کے لیے کافی ہو۔ اگر وہ اس ملے ہوئے پر راضی ہو جائے تو اس کا فائدہ اس کو ذہنی سکون کی صورت میں ملے گا۔ لیکن سکون ہمیشہ قناعت سے ملتا ہے اور قناعت کا مطلب ہے ملے ہوئے پر راضی ہو جانا۔

اس کے برعکس جو شخص ملے ہوئے کو کم سمجھے اور نہ ملے ہوئے کی طرف دوڑتا رہے وہ کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ دنیا میں چیزوں کی کوئی حد نہیں۔ آدمی خواہ کتنی ہی زیادہ چیزوں کو اپنے پاس جمع کر لے پھر بھی کچھ چیزیں باقی رہیں گی جو اس کو یہ لالچ دلائیں گی کہ مجھے یہ بھی حاصل کرنا چاہئے۔ اس طرح وہ ہمیشہ اور زیادہ کی لالچ میں پڑا رہے گا۔ وہ اسی طرح بے سکونی کی زندگی جئے گا یہاں تک کہ وہ اسی حال میں مر جائے گا۔

081 — کسی سے نہ مانگنا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ تم کسی سے کچھ نہ مانگو۔ کیوں کہ نیچے کے ہاتھ کے مقابلہ میں اوپر کا

ہاتھ زیادہ بہتر ہے۔ یہ اعلیٰ انسانیت کی تعلیم ہے۔ اعلیٰ انسانیت یہ ہے کہ آدمی خود اپنے آپ پر انحصار کرے۔ وہ دوسرے سے کوئی چیز نہ مانگے۔

مانگنا کوئی سادہ بات نہیں۔ وہ اخلاقی گراوٹ کی ایک علامت ہے۔ جو آدمی دوسروں سے مانگے وہ گویا آسان رزق پر جینا چاہتا ہے۔ ایسے آدمی کو مانگنے کی عادت کی یہ قیمت دینی پڑے گی کہ اس کی اپنی صلاحیت زیادہ نہ ابھر سکے۔ اس کے اندر چھپی ہوئی طاقتیں دبی رہ جائیں۔ اس کے اندر محنت کا جذبہ سرد پڑ جائے۔ وہ اس کمزوری کا شکار ہو جائے جس کو تن آسانی کہا جاتا ہے۔ زندگی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ پر بھروسہ کرے۔ وہ اپنے آپ کو محنت کا عادی بنائے۔ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرے۔ وہ دوسروں کو دینے والا بنے نہ کہ دوسروں سے لینے والا۔

082 — تجارت رزق کا بڑا ذریعہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا: تسعة اعشار الرزق فی التجارة (رزق کا نوّے فیصد حصہ تجارت میں ہے)۔ اس حدیث میں فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، تجارت میں رزق کا سب بڑا حصہ رکھا گیا ہے۔

یہ حدیث ہر آدمی کے لیے امید کا خزانہ ہے۔ اگر کسی آدمی کو ملازمت نہ ملے یا وہ وراثتی حقوق کو نہ پائے یا اور دوسرے ذرائع سے وہ کچھ پانے کی امید نہ رکھتا ہو تو اس کو تجارت شروع کر دینا چاہئے۔ تجارت کے ذریعہ وہ اتنا زیادہ پالے گا جو وہ دوسرے کسی ذریعہ سے نہیں پا سکتا تھا۔

083 — محنت کی روزی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اللہ اپنے اس بندہ سے محبت کرتا ہے جو محنت کرکے اپنی روزی کمائے۔ یہ حدیث محنت کی روزی کی اہمیت کو بتاتی ہے۔ محنت کرکے روزی کمانا کوئی سادہ بات نہیں حقیقت یہ ہے کہ محنت کی روزی تمام انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ محنت کی روزی سب سے زیادہ جائز روزی ہے۔ محنت سے روزی کمانا آدمی کو حقیقت پسند بناتا ہے۔ محنت کی روزی آدمی کے اندر سادگی کا مزاج پیدا کرتی ہے۔ محنت کی روزی دوسروں کو سمجھنے کا موقع دیتی ہے۔ محنت کی روزی آدمی کو سہولت پسندی سے بچاتی

ہے۔محنت کی روزی شخصیت کی تکمیل کا اہم ذریعہ ہے۔اگر مجبوری نہ ہوتب بھی آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی زندگی کے لیے محنت کا طریقہ اختیار کرے،وہ ہر حال میں اپنے آپ کوآرام طلبی سے بچائے۔

084 — زبان پر روک

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو دہرانے لگے۔ یہ حدیث آداب کلام کے ایک اہم اصول کو بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ سوچے بغیر کبھی نہ بولے۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کے خلاف بہت سی باتیں سنتے ہیں۔ یہ تجربہ ہے کہ سنی ہوئی بات جب دہرائی جاتی ہے تو اکثر وہ کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔حتیٰ کہ بات اتنی بدل سکتی ہے کہ ایک سچی بات جھوٹی بات بن جائے۔اس لیے صرف سننے کی بنیاد پر آدمی کو اسے کبھی دہرانا نہیں چاہئے۔اچھی خبر کو دہرانے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر بری خبر ہوتو اس کو اس وقت تک نہیں دہرانا چاہئے جب تک تحقیق کر کے پوری بات معلوم نہ کر لی جائے۔

085 — غیبت کا کفارہ

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ غیبت کا ایک کفارہ یہ ہے کہ تم اس کے لیے مغفرت کی دعا کرو جس کی تم نے غیبت کی ہے۔غیبت یہ ہے کہ آدمی کی غیر موجودگی میں اس کی کسی برائی کو بیان کیا جائے۔

غیبت ایک بدخواہی کا عمل ہے۔ جب کسی آدمی سے غیبت کی غلطی ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس آدمی کے لیے خیر خواہی کا معاملہ کرے جس کی اس نے غیبت کی ہے۔ اور خیر خواہی کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ اس کے حق میں اچھی دعائیں کرے۔ یہ غیبت کرنے والے کی طرف سے بدخواہی کے بعد خیر خواہی کا ایک معاملہ ہوگا جو اس کے گناہ کو اس سے پاک کر دے گا۔

086 — جامع نصیحت

پیغمبر اسلام نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ کیا میں تم کو ایک جامع نصیحت کروں۔اس نے کہا

کہ ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنی زبان کی حفاظت کرو۔

زبان کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جو کچھ بولے سوچ کر بولے۔ وہ ایسی بات نہ کہے جو دوسروں کو ستانے والی ہو۔ ایسی بات جس سے سماج میں برائی پھیلے اس سے وہ ہر حال میں اپنے آپ کو بچائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر سماجی برائیاں زبان کی وجہ سے پھیلتی ہیں۔ زبان کو کنٹرول میں رکھنا سماجی برائیوں کا دروازہ بند کرتا ہے اور زبان پر کنٹرول نہ کرنا سماجی برائیوں کا دروازہ کھولتا ہے۔ یہ سنجیدگی کی پہچان ہے کہ آدمی اپنی زبان کو ہمیشہ محتاط انداز میں استعمال کرے۔ زبان کا غلط استعمال یہ ہے کہ آدمی دوسروں کی برائی کرے، وہ دوسروں کے ساتھ سخت کلامی کرے۔ وہ دوسروں کے عیب کو ڈھونڈ کر اسے لوگوں میں پھیلائے۔

087 — صبر واعراض

اسلام کی ایک تعلیم صبر ہے۔ قرآن میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے۔ مزید فرمایا کہ اپنے رب کے لیے صبر کرو (ولربّك فاصبر) اسی طرح فرمایا کہ صبر کرو اور تمہارا صبر اللہ کے لیے ہے۔ جب ایک آدمی صبر کرتا ہے تو بظاہر اس کا یہ صبر کسی انسان کے مقابلہ میں ہوتا ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ خدا کے تخلیقی نقشہ سے مطابقت کرنے کے ہم معنٰی ہوتا ہے۔

خدا نے دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہر ایک کو آزادی ہو۔ ہر ایک کے لیے مسابقت کا کھلا ماحول ہو۔ اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے نقصان کا تجربہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ناخوش گوار تجربہ پر صبر کرنا گویا خدا کے تخلیقی نقشہ پر راضی ہونا ہے۔ صبر کی اسی اہمیت کی بنا پر خدا نے صبر کو خود اپنے لیے صبر کرنے کا معاملہ بتایا۔ قرآن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ جو آدمی صبر کرے گا اس کو بے حساب انعام دیا جائے گا۔

088 — یکطرفہ برداشت

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جو تمہارے اوپر ظلم کرے اس کو معاف کردو۔ یہ نہایت حکمت کی تعلیم ہے۔ ظلم کا خاتمہ ظلم کو معاف کرکے ہوتا ہے۔ ظلم کے خلاف جوابی کارروائی کرنا کبھی ظلم کو ختم نہیں کرتا۔

پیغمبر اسلام کا یہ قول دراصل نتیجہ خیز عمل (result oriented action) کی تعلیم ہے۔ اگر کوئی شخص ظلم کی کارروائی کرے تو مظلوم کو سب سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ اس کی کارروائی ایسی ہو جو اس کی مظلومیت کو ختم کرے نہ کہ وہ اس کی مظلومیت کو بڑھا دے۔ جب بھی کوئی مظلوم اس طرح سوچے تو وہ پائے گا کہ ظالم کو معاف کرنا سب سے بڑا انتقام ہے۔ ظالم کے ظلم کو بھلا دینا ظلم کو ختم کرنے کی سب سے زیادہ آسان تدبیر ہے۔ ظالم کو معاف کرنا کوئی مجبورانہ فعل نہیں، یہ ایک اعلیٰ اخلاقی اصول ہے۔ کوئی آدمی جب ظالم کو معاف کرے تو اس کو آزادانہ اصول کے طور پر ایسا کرنا چاہئے۔ مجبورانہ طور پر معاف کرنا بھی بے قیمت ہے اور معاف نہ کرنا بھی بے قیمت۔

089 — اعراض کا طریقہ

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں اور نادانوں سے اعراض کرو۔ موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کا یہ ایک بے حد اہم اصول ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نباتات کی دنیا میں جس طرح پھول کے ساتھ کانٹے ہیں اسی طرح انسانی دنیا میں دانشوروں کے ساتھ نادان لوگ ہر جگہ کثرت سے موجود ہیں۔ جس طرح نباتات کی دنیا میں آدمی کانٹوں سے الجھے بغیر پھول کو لے لیتا ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی اسے نادانوں سے الجھے بغیر اپنی زندگی کا سفر جاری رکھنا ہے۔

نادانوں سے الجھ کر کوئی شخص کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس لیے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ جب بھی کسی نادان سے سابقہ پڑے تو اس کو نظر انداز کر کے آدمی آگے بڑھ جائے۔ کوئی شخص ایسا نہیں کرسکتا کہ وہ دنیا سے نادانوں کے وجود کو مٹا دے۔ البتہ یہ ہر ایک کے بس میں ہے کہ وہ نادانوں سے الجھے بغیر اپنی زندگی کی تعمیر جاری رکھے۔ نادانوں سے اعراض میں یہ اندیشہ نہیں کہ وہ دلیر ہو جائیں گے۔ اعراض آگ کو بجھانے والا ہے، وہ آگ کو بھڑکانے والا نہیں۔

090 — صبر میں کامیابی

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جان لو کہ صبر کے ساتھ کامیابی ہے۔ اس حدیث میں صبر کی غیر معمولی اہمیت کو بتایا گیا ہے۔ اس کے مطابق، صبر ہر قسم کی ترقیوں کا زینہ ہے۔ اس دنیا میں صبر کرنے والا کبھی

ناکام نہیں ہوسکتا۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر آدمی کے ساتھ اتار اور چڑھاؤ کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ہر آدمی کو بار بار کسی ناپسندیدہ صورت حال کا تجربہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بے ہمت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو شکست خوردہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کامیابی کے امکانات اتنے زیادہ ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ایک ناکامی کے بعد ہمیشہ دوسری کامیابی موجود رہتی ہے۔ صبر کا مقصد گویا اپنے آپ کو بے حوصلگی سے بچا کر اگلے موقع کا انتظار کرنا ہے۔ اگر آدمی پہلی ناکامی کے بعد صبر کا ثبوت دے تو بہت جلد وہ پائے گا کہ دوسری کامیابی اس کے قریب ہی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

091 — چھوٹے شر پر راضی ہونا

پیغمبر اسلام کے ایک صحابی عمیر ابن حبیب بن خماشہ نے کہا کہ جو شخص نادان کے چھوٹے شر کو برداشت نہیں کرے گا اس کو نادان کے بڑے شر کو برداشت کرنا پڑے گا۔

موجودہ دنیا میں جس طرح سمجھ دار لوگ ہیں اسی طرح یہاں نادان لوگ بھی موجود ہیں۔ یہ نادان لوگ اپنی نادانی کی بنا پر دوسروں کو کچھ نہ کچھ تکلیف پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ تکلیف ابتدا میں ایک چھوٹی تکلیف ہوتی ہے۔ دانش مندی کا تقاضا ہے کہ اس چھوٹی تکلیف کو برداشت کرلیا جائے۔ جو آدمی چھوٹی تکلیف پر نادان سے الجھ جائے تو نادان ضد میں آکر اس کو اور زیادہ بڑی تکلیف پہنچائے گا۔ ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ چھوٹی تکلیف کو برداشت کرلیا جائے تاکہ بڑی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

092 — تحمل کے ذریعہ دفاع

مشہور صحابی رسول عبد اللہ ابن عباس نے فرمایا کہ جہالت کرنے والے کی جہالت کا دفاع تم تحمل کے ذریعہ کرو۔ صحابی کے اس قول کے مطابق، دفاع کا ایک مناسب طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے لیے جوابی دفاع کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا سابقہ نادانوں سے پڑ جاتا ہے۔ ایسے نادانوں کے شر سے بچنے کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ تحمل کا طریقہ ہے۔ تحمل کا طریقہ نادانوں کی کارروائی کو پہلے ہی مرحلہ میں روک دیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر نادانوں کے مقابلہ میں ردّ عمل کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ان کی

برائی بڑھتی رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ قابو سے باہر ہو جائے گی۔

093 — غصہ نہیں

ایک شخص پیغمبر اسلام کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے کوئی ایسی نصیحت کیجئے جو میری پوری زندگی کو سدھارنے کا ذریعہ بن جائے۔ آپ نے فرمایا: تم غصہ نہ کرو۔ یہ بلاشبہہ ایک نہایت جامع نصیحت ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کو اگر آدمی اختیار کرلے تو اس کی زندگی کے تمام معاملات درست ہو جائیں۔

اصل یہ ہے کہ انسان ہمیشہ ایک سماج کے اندر رہتا ہے۔ اس کو بار بار ایسے ناپسندیدہ تجربات پیش آتے ہیں جو اس کو بھڑکا دیں اور اس کے اندر غصہ پیدا کردیں۔ اور پھر جب آدمی غصہ میں آجائے تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ غصہ دلانے والے کے خلاف انتقامی کارروائی کرتا ہے اور پھر ہر انتقام دوبارہ ایک نئے انتقام کو بھڑکاتا ہے۔ اس طرح انتقام در انتقام کا سلسلہ چل پڑتا ہے جو تباہی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچاتا۔

ایسی حالت میں اپنی زندگی کے سفر کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ غصہ جیسے جذبات سے اپنے آپ کو اوپر اٹھائے۔ وہ منفی حالات کا بھی مثبت انداز میں جواب دے۔

094 — غصہ کا حل

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جب کسی آدمی کو غصہ آئے تو اگر وہ کھڑا ہے تو بیٹھ جائے۔ اگر وہ بول رہا ہے تو چپ ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس حالت میں ہے وہ اس حالت کو بدل دے۔ حالت کی یہ تبدیلی اس کے لیے غصہ کو ختم کرنے کا سبب بن جائے گی۔

غصہ ایک آگ ہے جو کسی ناخوشگوار بات پر آدمی کے اندر بھڑکتی ہے۔ غصہ آدمی کو تخریبی طریقہ کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ نقصان میں مبتلا کرنے والا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عقلمندی یہ ہے کہ غصہ آتے ہی فوراً اس کو ٹھنڈا کرنے کی تدبیر کی جائے۔ تدبیر کے ذریعہ آدمی غصہ کو منٹوں میں ختم کرسکتا ہے۔ لیکن اگر غصہ کو باقی رہنے دیا جائے تو وہ آدمی کو ایسے نقصانات پہنچاتا ہے جس کی تلافی پھر کبھی ممکن نہ ہو۔

غصہ آنا ایک فطری بات ہے۔ غصہ آنا بذات خود برا نہیں، بری بات یہ ہے کہ آدمی اپنے غصہ

پر کنٹرول نہ کرسکے۔ غصہ پر کنٹرول نہ کرسکنا خود اپنے آپ سے شکست کھا جانا ہے اور اپنے آپ سے شکست کھانا بلاشبہ سب سے زیادہ بری شکست ہے۔

095 — شیطان سے پناہ مانگنا

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے۔ جب بھی تم کو محسوس ہو کہ شیطان تم کو بہکا رہا ہے تو تم کہو: **اللهم إني اعوذ بك من همزات الشيطان** (اے خدا، میں شیطان کے وسوسوں کے مقابلہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں)۔

شیطان انسان کا دشمن ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان کو صحیح راستہ سے بھٹکائے۔ وہ طرح طرح کے وسوسے ڈال کر انسان کو سچائی سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ شیطان آدمی کو دکھائی نہیں دیتا۔ وہ خفیہ طور پر انسان کے اوپر حملہ کرتا ہے۔ انسان اس شیطانی حملہ کے مقابلہ میں بالکل بے بس ہے۔ اس سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے، خدا سے مدد مانگنا۔ خدا کا وعدہ ہے کہ جب بھی کوئی آدمی شیطان کے مقابلہ میں خدا سے پناہ مانگے گا وہ ضرور اس کو اپنی پناہ دے گا۔ یہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے۔

096 — طاقت ور کون

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے۔ بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ یہ بلاشبہ کسی شخص کے طاقت ور ہونے کا سب سے زیادہ اعلیٰ معیار ہے۔ جسمانی مقابلہ میں کسی کو پچھاڑنا کوئی بڑا کارنامہ نہیں، ایسا کارنامہ تو ایک حیوان بھی کرسکتا ہے۔ کسی انسان کے طاقتور ہونے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ جب اس کو کسی کے اوپر غصہ آئے تو وہ اپنے آپ کو پوری طرح کنٹرول میں رکھے۔ غصہ کے باوجود وہ انسانیت کے دائرہ سے باہر نہ جائے، وہ غصہ کے اوپر غالب رہے نہ کہ غصہ اس کے اوپر غالب آجائے۔

097 — مشکل میں آسانی

قرآن میں فطرت کے جن قوانین کو بتایا گیا ہے ان میں سے ایک قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں مشکل کے ساتھ آسانی رکھی گئی ہے (الانشراح) یعنی مشکل کے بعد نہیں بلکہ خود مشکل کے ساتھ ہی آسانی کا پہلو شامل ہے۔ یہ فطرت کا ابدی قانون ہے وہ کبھی بدلنے والا نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں مشکل کے مقابلہ میں امکانات کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ اگر ایک مشکل پیدا ہو یا ایک بار کوئی نقصان ہو جائے تو آدمی کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اس کو چاہئے کہ وہ اپنی سوچنے کی صلاحیت کو استعمال کرے۔ جب وہ سوچے گا تو وہ جانے گا کہ عین اسی وقت اور ٹھیک اسی مقام پر اس کے لیے بہت سے نئے امکانات موجود ہیں۔ وہ ایک چانس کو کھو کر وہ دوسرا چانس پاسکتا ہے جس کو استعمال کرکے وہ دوبارہ آگے بڑھ جائے۔ موجودہ دنیا میں زندگی کا بہترین فارمولا یہ ہے کہ ـــ مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔ ناموافق حالات کو حسن تدبیر سے اپنے موافق بنانے کی کوشش کرو۔ ناکامی کو زیادہ بہتر منصوبہ بندی کے ذریعہ کامیابی میں تبدیل کرو۔

خدا کی اس دنیا میں یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنی عقل کو استعمال کرکے اپنے مائنس کو پلس بنا سکے۔ یہ امکان ہر اس شخص کے لیے موجود ہے جو ہمت نہ ہارے جو نا امیدی کے حالات میں بھی پر امید بنا رہے۔

098 ـــ آسان طریقہ کا انتخاب

پیغمبر اسلام کی اہلیہ عائشہ پیغمبر کی عمومی پالیسی کو بتاتے ہوئے کہتی ہیں کہ جب بھی پیغمبر اسلام کو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ مشکل انتخاب کو چھوڑ دیتے اور آسان انتخاب کو لے لیتے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو پرتشدد طریق کار اور پرامن طریق کار کے درمیان انتخاب کرنا ہوتا تو آپ پرتشدد طریقِ کار کو چھوڑ دیتے اور پرامن طریقِ کار کو اختیار کرتے۔ اس طرح جب بھی آپ کو اعراض اور ٹکراؤ کے درمیان انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ ٹکراؤ کے طریقہ کو چھوڑ دیتے اور اعراض کے طریقہ کو اختیار کرتے۔ اسی طرح جب آپ کو جنگ اور صلح کے درمیان انتخاب کا موقع ہوتا تو آپ ہمیشہ جنگ کو چھوڑ دیتے اور صلح کو قبول کر لیتے۔

یہی حکمت ہے۔ اس حکمت کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کسی مزید بگاڑ سے بچ جائے اور اپنے معاملات کو کامیابی کے ساتھ درست کرتا چلا جائے۔ ہر معاملہ میں ہمیشہ دونوں طریقِ کار کا امکان ہوتا ہے۔ مگر عقل مندی وہی ہے جس کا نمونہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں ہمیں ملتا ہے۔

099 ـــ ناپسندیدگی میں خیر

قرآن میں ایک موقع پر نصیحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار

سمجھو اور وہ تمہارے لیے بھلی ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔

اس آیت کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ لوگ عام طور پر چیزوں کو ظاہر کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ وہ ظاہری دلکشی کی بنا پر ایک چیز کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ اور جو چیز ظاہر کے اعتبار سے دلکش نہ ہو اس کو ناپسندیدہ سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔ مگر حقیقی انجام کے اعتبار سے یہ طریقہ درست نہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز بظاہر دیکھنے میں اچھی نہیں لگتی مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے انسان کے لیے اسی میں فائدہ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک چیز بظاہر دیکھنے میں اچھی لگتی ہے مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ برے انجام کی طرف لے جانے والی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ وہ ظاہر کے اعتبار سے چیزوں کے بارے میں فیصلہ نہ کرے بلکہ وہ گہری حقیقتوں کے اعتبار سے چیزوں کو دیکھے اور اس کے مطابق فیصلہ کرے۔

100— ایک دعا

پیغمبر اسلام کی ایک دعا ان الفاظ میں آئی ہے: **اللھم ارنا الحق حقاً و ارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً و ارزقنا اجتنابه وارنا الاشیاء کما ھی** ۔ (اے خدا مجھے حق کو حق کی صورت میں دکھا اور مجھے اس کی پیروی کی توفیق دے اور مجھے باطل کو باطل کی صورت میں دکھا اور مجھے اس سے بچنے کی توفیق دے اور مجھے چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں)۔

موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر موضوعی طرز فکر (objective thinking) ہو۔ اس حدیث میں اسی کے لیے دعا کی تعلیم دی گئی ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی ایسے حالات کے درمیان رہتا ہے کہ وہ اکثر حق کو باطل کے روپ میں دیکھنے لگتا ہے اور باطل کو حق کے روپ میں۔ اس دعا میں بندہ اپنے رب سے سوال کر رہا ہے کہ وہ اس کو اس گمراہی سے بچائے۔ وہ اس کے اندر وہ نگاہ پیدا کرے جو چیزوں کو اس کی اصل روپ (as it is) میں دیکھنے لگے۔ صحیح سوچ سے صحیح عمل پیدا ہوتا ہے اور صحیح عمل آدمی کو ہمیشہ کامیابی کی طرف لے جاتا ہے۔

اس پیغمبرانہ دعا کے مطابق، ہر انسان اس فکری مسئلہ سے دوچار ہے کہ حق اس کو حق کی صورت میں نہ دکھائی دے اور باطل اس کو باطل کی صورت میں نہ دکھائی دے۔ یہ مسئلہ کنڈیشننگ

(conditioning) کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی پیدائش کے بعد ایک ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ ابتدائی عمر میں وہ ذہنی ناپختگی کی بنا پر ماحول کے اثر کو قبول کرتا رہتا ہے۔ اسی کا نام کنڈیشننگ ہے۔ پختگی کی عمر کو پہنچنے کے بعد ہر انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے شعور کو متحرک کر کے اپنی کنڈیشننگ کی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ وہ اپنے آپ کو مطابق واقعہ سوچ (as it is thinking) کے درجہ تک پہنچائے۔ علم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو باشعور بنا کر اس کو اس سلف ڈی کنڈیشننگ کے لیے تیار کرے۔ مذکورہ دعا اسی ڈی کنڈیشننگ کے عمل میں یقین کے عنصر کا اضافہ ہے۔

ماہنامہ الرسالہ کا ہندی اور انگریزی ایڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کا ہندی اور انگریزی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہورہا ہے۔ ہندی ایڈیشن کا نام الرسالہ (अल-रिसाला) ہے اور انگریزی ایڈیشن کا نام اسپریچول میسیج (Spiritual Message) ہے۔ دونوں کی تفصیل یہ ہے:

ہندی الرسالہ فی کاپی -/10 روپے، سالانہ -/110 روپے۔

اسپریچول میسیج، فی کاپی -/15 روپے، سالانہ -/165 روپے۔

دونوں کا پتہ یہ ہے:

Al-Risala (Hindi) Monthly

E-4, Marian House, 29th, Road, T.P.S. III

Opp.Waterfield Road, Bandra (W), Mumbai- 400 050

Tel.: 2834 1654/ 2834 6079/ 2821 8609 Fax : 2823 6323

E-mail: hbshaikh@bom5.vsnl.net.in

Manager Spritual Message

Published and edited by Haroon B. Shaikh

302, Koldongri CHS, Sahar Road

Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)

Tel.: 2834 1654/ 28346079/ 2821 8609, Fax: 2823 6323

Email: hbshaikh@bom5.vsnl.net.in

حیدرآباد میں مولانا وحید الدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں اور ماہنامہ الرسالہ حسب ذیل پتوں پر دستیاب ہیں۔ ٹیلی فون پر آرڈر دے کر بھی کتابیں منگوائی جاسکتی ہیں:

مولانا اکبر الدین قاسمی
مکان نمبر 18-7-198/A/275/A
نیو مغل پورہ، حیدرآباد 500264
Tel. 24562514

حافظ عبد الغفار صاحب
مکان 16-8-663 (بی کلاس 168)
فٹبال گراؤنڈ، جدید ملک پیٹھ
حیدرآباد 500036
موبائل: 9440057526

تذکیر القرآن

تذکیر القرآن

مولانا وحید الدین خاں

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ: ۴۰۰ روپئے (ہارڈ باؤنڈ)

۲۵۰ روپئے (پیپر بیک)

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
تذکیر القرآن (مکمل)	400.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد	8.00	دین انسانیت	60.00
مطالعہ سیرت	60.00	تاریخ دعوت حق	8.00	فکر اسلامی	50.00
اسباق تاریخ	85.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00	شتم رسول کا مسئلہ	50.00
تعمیر حیات	60.00	ڈائری (جلد اول)	80.00	طلاق اسلام میں	8.00
تعمیر انسانیت	50.00	کتاب زندگی	65.00	مضامین اسلام	60.00
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)	95.00	اقوال حکمت	25.00	حیات طیبہ	10.00
سفرنامہ غیر ملکی اسفار، جلد دوم	125.00	تعمیر کی طرف	10.00	باغ جنت	10.00
اسلام: ایک تعارف	80.00	تبلیغی تحریک	20.00	نار جہنم	10.00
اللہ اکبر	60.00	تجدید دین	25.00	سچا راستہ	10.00
پیغمبر انقلاب	50.00	عقلیات اسلام	35.00	دینی تعلیم	10.00
مذہب اور جدید چیلنج	65.00	قرآن کا مطلوب انسان	25.00	خلیج ڈائری	10.00
عظمت قرآن	35.00	دین کیا ہے؟	10.00	رہنمائے حیات	10.00
عظمت اسلام	60.00	اسلام دین فطرت	20.00	تعدد ازدواج	10.00
عظمت صحابہ	10.00	تعمیر ملت	10.00	ہندستانی مسلمان	60.00
دین کامل	80.00	تاریخ کا سبق	10.00	روشن مستقبل	10.00
الاسلام	45.00	فسادات کا مسئلہ	8.00	صوم رمضان	10.00
ظہور اسلام	50.00	انسان اپنے آپ کو پہچان	8.00	اسلام کا تعارف	8.00
اسلامی زندگی	40.00	تعارف اسلام	8.00	علما اور دور جدید	20.00
احیاء اسلام	35.00	اسلام پندرہویں صدی میں	8.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین	60.00
راز حیات	65.00	راہیں بند نہیں	12.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
صراط مستقیم	40.00	ایمانی طاقت	10.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	10.00
خاتون اسلام	60.00	اتحاد ملت	10.00	یکساں سول کوڈ	10.00
سوشلزم اور اسلام	50.00	سبق آموز واقعات	20.00	اسلام کیا ہے؟	10.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00	زلزلہ قیامت	10.00	میوات کا سفر	35.00
الربانیۃ	40.00	حقیقت کی تلاش	12.00	قیادت نامہ	35.00
کاروان ملت	45.00	پیغمبر اسلام	8.00	منزل کی طرف	10.00
حقیقت حج	30.00	آخری سفر	10.00	اسفار ہند	125.00
اسلامی تعلیمات	35.00	اسلامی دعوت	10.00	ڈائری ۹۰-۱۹۸۹	100.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00	حل یہاں ہے	10.00	قال اللہ وقال الرسول	70.00
حدیث رسول	40.00	امہات المومنین	25.00	ڈائری ۹۲-۱۹۹۱	90.00
راہ عمل	25.00	تصویر ملت	85.00	مطالعہ قرآن	80.00
تعبیر کی غلطی	80.00	دعوت اسلام	50.00	مذہب اور سائنس	40.00
دین کی سیاسی تعبیر	25.00	دعوت حق	40.00	دین و شریعت (نئی کتاب)	100.00
عظمت مومن	10.00	نشری تقریریں	80.00	مسائل اجتہاد (نئی کتاب)	

Al-Risala Book Centre

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110013, Tel.: 2435 5729, 24351131

قرآن اور حدیث میں وہی فرق ہے جو اِجمال اور تفصیل
میں ہوتا ہے۔ قرآن میں اسلام کی بنیادی تعلیمات بتائی
گئی ہیں۔ حدیث میں ان تعلیمات کی تفصیل ملتی ہے
۔قرآن کو سمجھنے کے لیے اور قرآن کی اصولی تعلیمات کا
عملی انطباق جاننے کے لیے حدیث کا مطالعہ لازمی طور
پر ضروری ہے۔

ISLAMIC STUDIES

GOODWORD

www.goodwordbooks.com

ISBN 978-81-7898-726-2



9 788178 987262